پاکستان پنجابی ادبی بورڈ (لاہور) کی علمی، ادبی اور لسانی خدمات کا مطالعہ

(تحقیقی مقالہ برائے ایم فل پاکستانی زبانیں و ادب)

مقالہ نگار

ظفر اقبال

رول نمبر: AN769116

اسلام آباد

نگران تحقیق

ڈاکٹر ارشد محمود ناشاد

اسسٹنٹ پروفیسر شعبۂ اُردو

علامہ اقبال اوپن یونیورسٹی

اسلام آباد

(شعبہ پاکستانی زبانیں)

علامہ اقبال اوپن یونیورسٹی، اسلام آباد

۲۰۱۴ء

بسم اللہ

سب تعریفیں ذات باری تعالیٰ کے لیے ہیں اور خدائے بزرگ و برتر کا فضل و کرم ہے جس نے ہمیں اپنا شکر ادا کرنے کی توفیق عطا فرمائی۔ سبحان اللہ کیا صانع ہے کہ جس نے خاک سے کیا کیا صورتیں پیدا کیں۔ رنگ بہ رنگ شکلیں بنائیں اور ایک کی سج دھج سے دوسرے کا ڈیل ڈول، چہرہ مہرہ، رنگ، قد کاٹھ اور چال ڈھال اتنی جدا جدا ہے کہ کروڑوں کی خلقت میں جس کو چاہے پہچان کر الگ کر لیں۔ آسمان اس وحدہ لاشریک کی وحدتِ ذات کا معجزہ اور زمین اس معجزے کا ہمہ وقت موجود ثبوت ہے۔ سمندر ہزاروں لہریں اچھالنے کے باوجود اس کی بلندی کا بال بیکا نہیں کر سکتا۔ ہوائیں ہر طرح کی تندی و تیزی کے باوجود اس کی گرد کو بھی نہیں پہنچ پاتیں۔ نظام شمسی اس کی صناعی کا لافانی شاہکار اور یہ کائنات تمام انسانوں کو اس کے پوشیدہ راز افشا کرنے کے لیے ہمہ وقت دعوتِ تحقیق دے رہی ہے۔ غرض یہ کہ جس کی قدرت اور سکت ایسی ہو، اس کی حمد و ثنا کے لیے انسان کی زبان ساکت اور ذہن اتنا ناقص ہے کہ انتہائی استعداد کو استعمال کرتے ہوئے بھی اس کے ایک ذرے کی کماحقہ تعریف کرنے سے قاصر ہے۔ اس پر مستزاد یہ کہ وہ رب العالمین عالم الغیب ہے اور اس کا علم پوری کائنات کا احاطہ کیے ہوئے ہے۔ تمام انسانوں کی عقلِ ناقص اُس عالمُ الغیب کے علم کا ذرہ برابر بھی ادراک نہیں کر سکتی سوائے اتنے کے جتنا وہ اپنے خاص بندوں کو اپنے خصوصی فضل و کرم سے عطا فرماتا ہے۔

سلامتی ہو جناب حضرت محمد ﷺ پر، امہات المومنین پر، حضور کی آل پر اور صحابہ کرام رضوان اللہ علیہم پر۔ اس ذات بابرکات کے وسیلے سے یہ علم نافع ہم تک پہنچا اور ہمیں علم کی طرف راغب ہونے کی تعلیم و تحریک بھی اسی ذات کی طرف سے ملتی ہے۔ اس ذاتِ بے مثل کے کردار کا ہی اثر تھا کہ عرب کے 'بدو' کہلانے والے دنیا کے پیش

رو اور امام بن گئے۔ یہ اسی ذات کا اعجاز تھا کہ باہم دست و گریبان رہنے والے قبائل یوں شیر و شکر ہو گئے کہ گویا کبھی ان میں کوئی تنازعہ اور رنجش ہی نہیں تھی۔ بتوں کی پوجا کرنے والے توحید کے ایسے علمبردار بنے کہ دنیا کے کونے کونے میں پہنچ کر لوگوں کی عاقبت کو سنوار دیا۔ بیٹیوں کو زندہ در گور کرنے والے ان کو رحمت قرار دے کر ان کی تکریم کرنے لگے۔ قرآن جیسا حقیقی اور لافانی معجزہ اسی ذات عالی مقام کے وسیلے سے ہم تک پہنچا جو تا قیامت اپنی تجلیاں بکھیرتا اور لوگوں کو دعوت تفکّر و تحقیق دیتا رہے گا۔ بعد از خدا بزرگ توئی قصہ مختصر۔

میں بھی رب کریم و علیم کا از حد شکر گزار ہوں کہ اس نے مجھے یہ مثبت کام کی ہمت دی اور میں اس کام کی طرف متوجہ ہوا۔ اس کے بعد وہ ہستی قابل ذکر ہے جس کی تعریف کرنے میں دنیا کے تمام قلم ناکام، تمام تحریریں نامکمل ہیں۔ تمام سوچنے، سمجھنے، لکھنے، پڑھنے، بولنے اور سننے والی مخلوقات اس ذات کماحقہ تعریف کرنے سے قاصر ہیں۔ میں سمجھتا ہوں کہ ہر وہ کامیابی جو مجھے نصیب ہوئی، یقیناً وہ میرے مرحوم والدین کی دعاؤں کے سبب سے ہوئی۔ یہ ان دعاؤں کا ہی اثر ہے کہ میں انتہائی محدود کتابی وسائل، ملازمتی مصروفیات، تنگی وقت اور تعلیم کے شعبے سے براہ راست وابستگی نہ ہونے کے باوجود اس قابل ہوا۔ یہ والدین کی دعاؤں کا ہی اثر کہ مجھے ہمیشہ کامیابیاں اور ہر طرح کی اچھائیاں میسر اور مہیا ہوتی رہتی ہیں۔ بے شک والدین کی دعائیں بھی بچوں کے لیے اثاثہ ہی ہوتی ہیں جو صورت آسمان ان پر سایہ فگن رہتی ہیں اور تکلیفوں کی کڑی دھوپ میں بھی ہرے بھرے درختوں جیسی ٹھنڈی اور گھنی چھاؤں مہیا کرتی ہیں۔ بسم اللہ سے کام کا آغاز کیا تھا اور انشا اللہ وہ لمحہ قریب ہے کہ کامیابی کا سنگِ میل تقریباً پیشِ نظر ہے۔

تحقیق ایسا اتھاہ سمندر ہے جس میں بے خطر کود پڑنا گھاٹے کا سودا ہے کیونکہ عقل کو محوِ تماشائے لبِ بام رکھنے کی بجائے باقاعدہ استعمال کرتے ہوئے نتائج اخذ کرنے ہوتے ہیں۔ اس پر مستزاد یہ کہ تحقیق دستاویزی ہو تو اور بھی زیادہ محنت، احتیاط، کوشش اور لگن کے باوجود صحیح رہنمائی کی اشد ضرورت پڑتی ہے کیونکہ اس کے بغیر منزل کا

حصول ناممکن ہے۔ لہٰذا لازم ہے کہ یہ کام کسی مشفق، تجربہ کار اور تحقیق کے فن کے استاد کی زیر نگرانی کیا جائے۔ تاریخی حقائق کا کھوج لگا کر انہیں سامنے لانا آسان کام نہیں اور نہ ہی یہ محض واقعات کے ترتیب وار اندراج کا نام ہے۔ جمیل جالبی کے مطابق یہ کام یوں ہے۔

''مختلف سروں کو باہمی ربط دے کر ایسی تنظیم میں لانا کہ یہ تصویر پڑھنے والے کے ذہن پر نقش ہو جائے اور ادب کا حقیقی و تاریخی ارتقا نظروں کے سامنے آ جائے۔''

میری خوش قسمتی ہے کہ مجھے **جناب ڈاکٹر ارشد محمود ناشاد صاحب** جیسے استاد بطور نگران میسر ہوئے جنھوں نے موضوع کے چناؤ، خاکہ سازی اور مقالے کی تسوید میں نہایت خندہ پیشانی سے میری رہنمائی کی۔ انہوں نے اپنی ذاتی کتابوں سے استفادہ کرنے کے ساتھ ساتھ ہر طرح سے معاونت فرمائی۔ جس کے لیے میں **استاد محترم جناب ڈاکٹر ارشد محمود ناشاد صاحب** کا دل کی گہرائیوں سے شکر گزار ہوں۔

ان سب معاملات سے بڑھ کر یہ بات انتہائی اہم ہے کہ اس کام کے سلسلے میں میری شریکِ حیات، بیٹوں اور بیٹیوں نے کوئی رکاوٹ نہ آنے دی حالانکہ ان کے حصے کا وقت بھی اس کام کو مکمل کرنے میں صرف ہو جاتا تھا۔ یہ ان کے صبر کا بھی امتحان تھا جس میں کامیاب تو وہ ہوئے لیکن میٹھا پھل میرے حصے آ رہا ہے۔ میں تہہ دل سے ان کا شکر گزار ہوں کہ وہ میرے کام میں مدد و معاون ہوئے اور اکثر و بیشتر میری ہمت افزائی بھی کرتے رہے۔ میری ہمت افزائی کرنے والوں میں **جناب حسن گل عشرت صاحب، جناب ڈاکٹر عبداللہ جان عابد صاحب، جناب ڈاکٹر حاکم علی برڑو صاحب، جناب ضیا بلوچ صاحب** بھی شامل ہیں۔ ایم فل کے میرے ساتھیوں میں **جناب محمد زبیر صاحب** بھی بجا طور پر شکریے کے مستحق ہیں۔ ان سب حضرات کی تحریک، مدد، ہمت افزائی و رہنمائی کی بدولت ہی یہ کام ممکن ہوا۔

اس کے علاوہ پاکستان پنجابی ادبی بورڈ کی سیکریٹری **محترمہ پروین ملک صاحبہ** کا بے حد ممنون ہوں جنھوں نے مجھے بورڈ اور اس کی کتابوں سے متعلقہ معلومات فراہم کیں۔

ایوان بالا (سینیٹ) جیسے قانون ساز ادارے کے رپورٹنگ سیکشن میں بطور ڈپٹی ڈائریکٹر خدمات سرانجام دیتے ہوئے سرکاری مصروفیت کی وجہ سے مجھے بہت سی دشواریوں کا سامنا تھا لیکن ایک آدھ فرد کے علاوہ تمام ساتھی افسران اور دوستوں کی معاونت شامل حال رہی۔ میں ان کے تعاون کی بدولت مختلف لائبریریوں اور اداروں میں جا کر تحقیق کے لیے وقت نکال سکا۔ اس لیے میں اپنے ادارے اور رپورٹنگ سیکشن کے تمام افسران و ساتھیوں کا ممنون ہوں۔

میرا آبائی شہر گجرات ہے، پیدائش کوئٹہ میں ہوئی اور مڈل تک وہیں تعلیم حاصل کی۔ والد صاحب نے ملازمت سے ریٹائرمنٹ کے بعد اپنے آبائی شہر گجرات کا قصد کیا تو یہاں کے سارے دوست اور ناتے چھوڑ کر اپنے ننھیالی اور ددھیالی رشتہ داروں کی قُربت کے شوق میں گجرات آ گئے۔ پبلک ہائی سکول سے میٹرک کے بعد مزید تعلیم کے لیے زمیندارہ ڈگری کالج میں داخلہ لیا۔ بوجوہ تعلیم جاری نہ رکھ سکا اور واہ کینٹ میں ملازمت اختیار کر لی جہاں دوران ملازمت پرائیویٹ امیدوار کے طور پر ایف اے اور بی اے کیا۔ اس کے بعد اللہ کریم نے پاکستان کے خوبصورت دارالخلافے اسلام آباد میں ایوان بالا (سینیٹ) میں خدمات انجام دینے کا موقع دیا جہاں پر پنجاب یونیورسٹی سے ایم اے (پنجابی) کیا۔

کتابیں پڑھنے کا شوق ابتدائی تعلیم کے زمانے سے تھا۔ والد مرحوم دیگر کتابوں کے علاوہ اردو ڈائجسٹ باقاعدگی سے پڑھا کرتے تھے، اس کو پڑھ کر بہت کچھ سیکھا اور اس شوق نے دیگر رسالے پڑھنے کی طرف راغب کیا۔ واہ کینٹ میں ملازمت کے دوران **محترم راجہ محمد صادق صاحب** جیسے دوستوں کی قربت میں مختلف موضوعات اور اصناف کی بہت سی کتابیں پڑھنے کا موقع ملا۔ پنجابی کتابوں میں ہیر وارث شاہ اور دیگر کتابیں پڑھیں۔ بی اے میں پنجابی کو بطور اضافی

مضمون پڑھا تھا اور پھر اسی میں ایم کرنے کا ارادہ کیا جس میں اللہ کریم نے کامیاب کیا۔ کچھ وقفے کے بعد 'ایم فل' کے لیے علامہ اقبال اوپن یونی ورسٹی کے شعبہ 'پاکستانی زبانیں اور ادب' میں داخلہ لیا اس طرح پنجابی کے ساتھ ساتھ دیگر پاکستانی زبانوں اور ان کے ادب سے بھی قدرے شناسائی ہوئی۔ 'پاکستان پنجابی ادبی بورڈ' کی کارکردگی اور پنجابی زبان کی ترویج میں اس کے کردار کو ایم فل کے مقالے کے طور پر چنا۔ کسی بھی زبان کی تکمیل میں شعر وادب کے ساتھ اُس زبان کی تاریخ، ثقافت اور آرٹ کی موجودگی اس بات کا پتا دیتی ہے کہ وہ زبان کن مدارج کو طے کرتے ہوئے موجودہ مقام تک پہنچی ہے۔ ان مدارج کا کھوج اس زبان میں موجود ورثے سے لگایا جاتا ہے اور ہر ترقی یافتہ زبان میں اس کا موجود ہونا لازم ہے۔ تاریخ کے اوراق، نشانات، آثار قدیمہ اور آرٹ کے نمونوں کو کھوج کر اُن کے گمشدہ حوالوں کو باہمی ربط دے کر ایک زنجیر کی صورت میں لانا خاصا مشکل کام ہے۔ ہزاروں برس پر محیط گمشدہ تاریخ اور مختلف لوک ثقافتوں کو ایک لڑی میں پرو کر زبان کے وجود کو ثابت کرنا دقت طلب کام ہے اور ہر قدم پر ٹھوکر کھانے کا اندیشہ بھی رہتا ہے۔

تحقیق کسی بھی موضوع کے کسی بھی پہلو کا احاطہ کر رہی ہو یہ ایسا کام ہے جس میں درج کوئی لفظ حرف آخر کا درجہ نہیں پا سکتا۔ کہیں نہ کہیں کمی اور کوئی نہ کوئی تشنگی باقی رہ جاتی ہے جو آنے والے محقق کو نہ صرف اس کمی کو دور کرنے پر اکساتی ہے بلکہ ان تاریک پہلوؤں کو نئے انداز سے اجاگر کرنے کا باعث ہوتی ہے۔ دنیا بھر میں ہر قسم کے موضوع پر تحقیق کی کچھ نہ کچھ گنجائش اور ضرورت ہمیشہ باقی رہتی ہے۔ ادب اور سائنس میں بھی تحقیق ہمیشہ جاری رہتی ہے اور ہر نئی تحقیق نئے دریچے وا کرتی چلی جاتی ہے۔ آنے والے وقتوں میں نئے محققین اور مصنفین کے لیے حالات اور ماحول یقیناً آج کے دور سے مختلف ہوگا جیسا کہ ہمیں اپنے بزرگوں سے جدا ماحول میسر ہے۔ وہ لوگ اپنے موجود ماحول اور ہم سے زیادہ ترقی یافتہ دور کے نمائندوں کے طور پر اُس وقت موجود ترقی یافتہ وسائل کو استعمال

کرتے ہوئے ضرور ایسی تحقیق سرانجام دیں گے جو شاید آج کے دور میں نہیں ہو سکی یا نہیں ہو سکتی۔ اس کے باوجود یہ حقیقت ہے کہ ہمارے بزرگوں نے اپنی اپنی زبان کی ترقی و ترویج اور حفاظت کی حتی الوسع کوشش کی ہے۔ اس میں وہ کتنے کامیاب رہے، اس کا فیصلہ تاریخ کرے گی۔

اس تحقیقی مقالے میں حتی الوسع کوشش کی گئی ہے کہ پنجابی زبان وادب سے وابستہ ہستیوں کے کیے گئے کام اور شخصیت کا کوئی پہلو تشنہ نہ رہے۔ اس تحقیقی مقالے کو تحریر کرنے کا مقصد تو یہ ہے کہ پنجابی زبان و ادب کی ترقی و ترویج کے حوالے سے پاکستان پنجابی ادبی بورڈ کی کارکردگی اور خدمات کو وضاحت سے بیان کر دیا جائے لیکن بورڈ کی کارکردگی بیان کرنے کے ساتھ جن ہستیوں کی وراثت کو آنے والی نسلوں کے لیے محفوظ کیا جا رہا ہے، ان کے بارے میں بھی تھوڑی بہت آگاہی فراہم کرنے کی کوشش کی گئی ہے۔ مجھے کامل یقین ہے کہ آئندہ آنے والے نئے تحقیق کار اس کام میں اپنی زیادہ اور فعال صلاحیتوں کے ساتھ بہت بہتر انداز میں کام کریں گے اور بہتر نتائج سامنے لائیں گے۔

پہلے باب میں زبان، زبان کی افادیت، پنجابی زبان کا پس منظر، اس پر دوسری زبانوں کے اثرات، یہاں کے باشندوں کی تہذیب و ثقافت، پنجابی زبان کا لسانی خاندان، ارتقا، ترویج، مختلف لہجوں کے نام اور علاقے بیان کرنے کے بعد دنیا میں بولی جانے والی دیگر زبانوں کا تذکرہ کیا گیا ہے۔ اس کے بعد 1857 کے بعد قائم ہونے والے علمی و ادبی اداروں اور تنظیموں کا ذکر ہے۔ لاہور شہر کی تاریخ، انفرادیت اور کردار کے بعد تقسیم ہند کے بعد پاکستان کے مختلف شہروں میں قائم ہونے والے اسی نوعیت کے سرکاری اور غیر سرکاری اداروں کا تذکرہ کیا گیا ہے۔

دوسرے باب میں پاکستان پنجابی ادبی بورڈ کے قیام کا پس منظر، بورڈ کے صدور، نائب صدور، سیکریٹری، مستقل ممبران، نامزد ممبران، مجلس عاملہ، ثقافتی کمیٹی اور مالی معاملات کی کمیٹی وغیرہ کے بارے میں بتایا گیا ہے۔ بورڈ کے آئین کی چیدہ چیدہ شقیں، کتابیں چھاپنے کا طریقہ کار اور دیگر مسائل بیان کیے گئے ہیں۔ تیسرے باب میں پنجابی

ادب کی تاریخ، کلاسیکی شعرا کا تذکرہ، کلاسیکی شعری و نثری ادب، تاریخِ ادب، علمی و تحقیقی کتابیں اور تصوف پر چھاپی جانے والی کتابوں کا تذکرہ، اقتباسات اور تبصرہ شامل ہے۔

چوتھا باب جدید ادبی اصناف کے متعلق ہے۔ جدید ادبی اصناف کو پنجابی زبان میں مقبول اور رائج کرنے والے چند مصنفین، شعرا، مترجمین کا تعارف بھی شامل کیا گیا ہے۔اس باب میں افسانہ، کہانی، ناول، ڈرامہ، شاعری، سفر نامہ، آپ بیتی، شخصیات اور لوک ادب جیسی اصناف پر شائع کی جانے والی کتابوں کا تعارف، اقتباسات و تبصرے شامل ہیں۔

پانچویں باب میں ضلعی تاریخ، بچوں کا ادب، سیاست، انگریزی کتابیں، دستکاریوں، طب، پودوں، کائنات، ایجادات اور متفرق موضوعات پر مشتمل کتابوں کے علاوہ لغت اور تماہی رسالے 'پنجابی ادب' پر بات کی گئی ہے۔ اس کے علاوہ پاکستان پنجابی ادبی بورڈ کی مختلف لسانی و ثقافتی خدمات بیان کی گئی ہیں۔

ریسرچ سکالر

ظفر اقبال

فہرست مندرجات

باب اول

پنجابی ادب کے فروغ میں اداروں کا کردار اور پنجابی زبان کے اہم ادارے

زبان

ادب کے فروغ میں اداروں کے کردار کو واضح کرنے سے پہلے پنجاب اور پنجابی زبان کے پس منظر اور تاریخ کے بارے میں وضاحت بہت ضروری ہے۔انسانوں کے علاوہ مختلف جاندار بھی آپس میں ترسیلِ معلومات کرتے ہیں مگر زبان (Language)ایک ایسے نظام کو کہتے ہیں جس کے ذریعے انسان ایک دوسرے کے ساتھ مختلف آوازوں اور اشاروں کی مدد سے تبادلہ خیالات و معلومات کرتے ہیں۔ مختلف زبانوں کی تخلیق و ترقی کا تجزیہ لسانیات ہی نہیں ان میں موجود ادب کی مدد سے بھی کیا جاتا ہے۔ کئی ہزار سال سے زبان اور انسان ایک دوسرے کے لیے لازم و ملزوم کی حیثیت رکھتے ہیں۔ ترقی یافتہ انسانی شعور کے ہمہ گیر مظہر کے طور پر زبان ایک ایسا نظامِ علامات ہے جس کے ذریعے معانی کی تخلیق اور ترسیل ممکن ہوتی ہے۔ گزشتہ ڈیڑھ دو سو سال سے زبان کے بارے میں جو کچھ کہا گیا ہے،اس میں ایک اہم بات یہ ہے کہ دنیا کی ہر زبان ایک مخصوص نظریۂ حیات کی ترجمان ہوتی ہے۔دنیا کی معدوم ہوتی ہوئی زبانوں کے تحفظ کی ضرورت کے حوالے سے سب سے زیادہ اسی حقیقت پر زور دیا جاتا ہے کہ ہر زبان ایک خاص عالمی منظر نامہ (World View) کا مظہر ہوتی ہے۔ ہر زبان انسانوں کے انسانوں اور اشیا کے ساتھ رشتے کو ایک خاص انداز سے بیان کرتی ہے۔اس تجربے کی بے شمار صورتیں دنیا کی ہر زبان میں قدرِ مشترک کے طور پر نمودار ہوتی ہیں۔اگرچہ زبانوں کی تفہیم اور باہمی ابلاغ کا عمل اسی طرح مکمل ہوتا ہے پھر بھی زبانوں کا اپنے بولنے والوں کے تمدن اور اُن کی تہذیب و ثقافت کے ساتھ بہت گہرا رشتہ ہوتا ہے۔ بعض لوگوں کے نزدیک زبان کسی بھی تہذیب و ثقافت کا مکمل اور جامع مظہر ہوتی ہے۔ اسی لیے کسی زبان کی روح اور اس کے اصل (Genesis) کو سمجھنے کے لیے اس کی ثقافت کو سمجھنا ضروری ہوتا ہے جس کے تحت وہ زبان پروان چڑھتی ہے لیکن اس ثقافت کو سمجھنے کے لیے اس زبان کے علاقے، جغرافیے اور حدود اربعے کا مطالعہ بھی مددگار ہوتا ہے۔اس لیے یہاں پر پنجابی زبان کے علاقے اور اس کے بارے میں کچھ وضاحت کی جا رہی ہے۔

پنجابی زبان پر دوسری زبانوں کے اثرات

جزیرہ نماہندوستان کے قدرتی دروازے کے طور پر پنجاب کی حیثیت، اس کی آب وہوا کی خوبیاں، وسیع و عریض شاداب میدان، سرسبز وادیاں اور پانی کی افراط کو مد نظر رکھتے ہوئے اس بات کو تقویت ملتی ہے کہ ان علاقوں پر قبضہ کرنے والی ابتدائی قومیں نسلِ انسانی کی اولین آبادکاری کرنے والی قوموں میں شمار ہوتی ہیں۔ اس بات کو مزید تقویت جدید ماہرین کی شہادت سے ملتی ہے کہ شمال مغربی سمت سے آنے والے ''سکھائتا'' اور ''آریا'' حکمرانوں نے جن لوگوں کو سب سے پہلے اپنا ماتحت بنایا، وہی پنجاب کے اصل اور قدیم باشندے تھے۔ وادی گنگا میں آریاؤں نے جس آبادی کو غلام بنایا تھا، اسے ''سدرا'' کانام دیا گیا ہے۔ یہاں کے باشندوں کی گزر بسر پھل، جڑی بوٹیوں، نباتات، شکار کے لیے جانوروں اور پرندوں کی بہتات کی وجہ سے باآسانی ہو جاتی تھی۔ ابھی انہیں دھاتوں کی خصوصیات کا علم نہیں تھا اور ان کے استعمال کے ہتھیاروں میں پتھر، بھالے اور آگ میں جلا کر سخت کیے گئے لکڑی کے بنے ہوئے نیزے شامل تھے۔ انھوں نے سروں پر جانوروں کے سینگ لگائے ہوتے تھے اور وہ غیر مہذب زبانیں بولتے تھے۔ وہ اپنی عریانی کو چھپانے کے لیے جانوروں کی کھالیں استعمال کرتے تھے۔ وہ چھوٹے چھوٹے گروہوں کی شکل میں خانہ بدوشوں کی سی زندگی گزارتے تھے اور ان کی اکثریت جاہل اور وحشی رہی۔ ترقی کی راہ میں اس وحشی پن سے نکلنے کے لیے شکار ان کا اولین پیشہ معلوم پڑتا ہے۔ پھر گروہوں کی صورت میں رہتے ہوئے آپس میں خلط ملط ہوتے ہوئے انھوں نے چھوٹے چھوٹے قبائل کی تشکیل کی اور اپنی ضرورتوں کو پورا کرنے کے لیے جانوروں کے گلے پالنے شروع کیے۔ گلوں کے مالک بننے کی وجہ سے زمین پر قبضے کی اہمیت بڑھ گئی جو خاندانوں میں جھگڑے کا باعث بن گئی۔ اس وجہ سے انھوں نے اپنے دفاع کے لیے مختلف ذرائع تلاش کرنے شروع کیے تو ان کو دھاتوں کی اہمیت کا احساس ہوا اور انھوں نے اپنی لڑائیوں میں لوہے کے ہتھیار استعمال کرنے شروع کیے۔ دھاتوں کو لوہے کے ہتھیاروں، سونے کو ان گھڑے زیورات اور مختلف دھاتوں سے ظروف بنا کر استعمال کرنا شروع کیا۔

ہیروڈوٹس یہاں کے قدیم باشندوں کے بارے میں بتاتا ہے؛

''وہ دریاؤں کے کنارے پر رہتے تھے اور ان کی گزر بسر کچی مچھلی اور کچے گوشت پر ہوتی تھی۔ ان کی کشتیاں سرکنڈوں سے بنائے ہوئے ڈونگے ہوتی تھیں اور وہ چھال کا لباس پہنتے تھے۔ جب خاندان کا

کوئی شخص بیمار پڑ جاتا تو اس کو مار کر ہڑپ کر جاتے تھے اور بڑھاپے کی عمر کو پہنچنے والے افراد کو بھی مار

کر ان کی لاشوں پر دعوتیں اڑاتے تھے۔ کچھ لوگوں کی گزر بسر صرف جڑی بوٹیوں پر تھی اور دیگر لوگ

شکار کیے ہوئے جانوروں پر گزارا کرتے تھے''۔(1)

زبان کی افادیت

انسان کی زندگی میں زبان کی اہمیت کا اندازہ اس بات سے لگایا جا سکتا ہے کہ قیامت تک تمام انسانوں کی رہنمائی اور ہدایت کی راہ دکھانے والی رب کریم کی آخری الہامی کتاب قرآن کریم جس کا سب سے پہلا سبق ''اقرا'' تھا، اس کتاب کی سورۃ الرُوم میں زبان کے بارے میں ارشاد باری تعالیٰ ہے؛

''اور اس (اللہ) کی نشانیوں میں سے آسمانوں اور زمین کی تخلیق (بھی) ہے اور تمہاری زبانوں اور

تمہارے رنگوں کا اختلاف (بھی ہے) بیشک اس میں اہلِ علم (و تحقیق) کے لیے نشانیاں ہیں''۔(2)

اس آیت میں زبان کے اختلاف کو اللہ تعالیٰ کی نشانیوں میں شمار کیا گیا ہے۔ اسی طرح سورۃ رحمٰن میں تخلیق انسان کے بعد جس پہلی بڑی نعمت خداوندی کا حوالہ دیا گیا ہے وہ اس کے نطق و بیان کی قوت ہے۔ زبان ہی کے بارے میں دوسری جگہ ارشاد خداوندی ہے؛

''ہم نے ہر رسول کو ان کی مخاطب قوم کی زبان ہی میں (دعوت دینے کے لیے) بھیجا۔'' (3)

انسان کا شاید سب سے بڑا تخلیقی کارنامہ زبان کی ترویج کو کہا جا سکتا ہے۔ دراصل زبان کے ذریعے اپنی ہستی اور ان رشتوں کا اقرار کیا جاتا ہے جو انسان نے دوسرے انسانوں اور کائنات میں موجود عناصر سے قائم کیے ہوتے ہیں۔ انسان کی ترقی کا راز بھی زبان میں پوشیدہ ہے کیونکہ علم کی قوت کا سب سے مضبوط سہارا زبان ہی ہے۔ رُوئے زمین پر انسان جہاں

کہیں بھی رہتا ہے اس کا ماضی اس کے ساتھ چلتا ہے۔ حقیقت یہ ہے کہ ماضی سے رشتہ کی اُستواری ہی انسان کی پہچان کی ضامن ہوتی ہے۔ زبان اور اس خطے (وسیب) کے لوگوں کے روابط اس کی شناخت اور پہچان کی لازوال حقیقتیں ہیں۔ اس لیے اپنے دیس اور اپنی جنم بھومی کی مادری زبان سے لاعلمی کا کوئی جواز نہیں رہتا۔

نصیر الدین ہاشمی کہتے ہیں؛

''جب ایک قوم دوسری قوم کے ساتھ بودوباش اختیار کرتی ہے تو یہ امر ناگزیر ہے کہ بول چال اور کام کاج میں ایک کے الفاظ دوسرے کی زبان میں منتقل ہوں''۔(4)

دنیا میں بولی جانے والی زبانیں

دنیا بھر میں بولی جانے والی زبانیں زیادہ تر قوموں اور خطوں کے حوالے سے پہچانی جاتی ہیں۔ دنیا میں جتنی بھی قومیں آباد ہیں، وہ زبان کے اعتبار سے اپنی الگ شناخت رکھتی ہے۔ آکسفورڈ یونیورسٹی کی ایک تحقیق کے مطابق اس وقت دنیا بھر میں تقریباً چھ ہزار نو سو بارہ زبانیں بولی جاتی ہیں۔ اس تعداد کو مدنظر رکھتے ہوئے یہ نہیں کہا جا سکتا کہ دنیا میں اتنی ہی قومیں بھی آباد ہیں یا آباد رہی ہیں۔ جس طرح زمانے کی جدت اور سرکاری زبانوں کے بڑھتے ہوئے استعمال سے مادری زبانوں کی اہمیت ماند پڑ رہی ہے، اسی طرح مختلف زمانوں میں دیگر عوامل بھی زبانوں کے خاتمے یا معدوم کرنے کے سلسلے میں شامل رہے ہیں۔ مادری زبان انسان کی شناخت، ابلاغ تعلیم اور ترقی کا بنیادی ذریعہ ہے۔ جب کوئی زبان ختم ہوتی ہے تو اس کے ساتھ مختلف النوع قسم کے علوم، ثقافت و تہذیبی روایات کا بھی خاتمہ ہو جاتا ہے۔

اقوام متحدہ کے ادارے یونیسکو کے مطابق 1950 سے لے کر اب تک دو سو تیس مادری زبانیں ناپید ہو چکی ہیں۔ "Atlas of World Languages in Danger 2009" کے مطابق اٹھائیس پاکستانی زبانوں سمیت دنیا کی چھتیس فیصد یعنی دو ہزار چار سو اٹھانوے زبانوں کو اپنی بقا کے لیے مختلف النوع خطرات لاحق ہیں۔ چوبیس فیصد یعنی چھ سو سات زبانیں غیر محفوظ جب کہ پچیس فیصد یعنی چھ سو بتیس ناپیدی کے یقینی خطرے سے دوچار ہیں۔ اس کے علاوہ بیس

فیصد یعنی پانچ سو باسٹھ زبانوں کو خاتمے کا شدید خطرہ لاحق ہے۔اکیس اعشاریہ پانچ فیصد تقریباً پانچ سو اڑتیس زبانیں تشویش ناک حد تک خطرات کا شکار ہیں جب کہ دو سو تیس تقریباًدس فیصد زبانیں متروُک ہو چکی ہیں۔یوں دنیا میں بولی جانے والی ستاون فیصد زبانوں کو محفوظ گردانا جاتا ہے۔ ہر زبان اپنے حروف ابجد، مطالب اور گرائمر رکھتی ہے اور ہر زبان کی ادائیگی اور لہجہ بھی مختلف ہے۔

دنیا میں سب سے زیادہ آٹھ سو ساٹھ زبانیں 'پاپوانیوگنی' میں بولی جاتی ہیں جو کل زبانوں کا بارہ فیصد ہے۔ سات سو بیالیس زبانوں کے ساتھ 'انڈونیشیا' دوسرے، پانچ سو سولہ زبانوں کے ساتھ 'نائیجیریا' تیسرے، چار سو پچیس زبانوں کے ساتھ 'بھارت' چوتھے اور تین سو گیارہ زبانوں کے ساتھ 'امریکا' پانچویں نمبر پر ہے۔'آسٹریلیا' میں دو سو پچھتر اور 'چین' میں دو سو اکتالیس زبانیں بولی جاتی ہیں۔ دنیا میں سب سے زیادہ بولی جانے والی مادری زبان 'چینی' ہے جو تقریباً ستاسی کروڑ سے زائد افراد بولتے ہیں جب کہ سینتیس کروڑ 'ہندی'، پینتیس کروڑ 'ہسپانوی'، چونتیس کروڑ 'انگریزی' اور بیس کروڑافراد 'عربی' بولتے ہیں۔ 'پنجابی' گیارھویں اور 'اردو' انیسویں نمبر پر ہے۔عالمی سطح پر زبانوں کی تعداد اور ان کو بولنے والوں کا تناسب انتہائی غیر متوازن ہے۔ صرف ستاون زبانیں ایسی ہیں جن کو بولنے والوں کی تعداد ایک کروڑ سے زائد ہے اور صرف آٹھ زبانیں ایسی ہیں جن کو بولنے والے افراد کی تعداد دس کروڑ سے زائد ہے جو کل عالمی آبادی کا چالیس فیصد بنتا ہے۔عالمی سطح پر صرف ایک سو زبانوں کا استعمال تحریری شکل میں کیا جاتا ہے۔

''سی آئی اے ورلڈ فیکٹ بک (CIA World Fact Book) کے مطابق پاکستان میں سب سے زیادہ بولی جانے والی زبان 'پنجابی' ہے۔ اس کو اڑتالیس فیصد افراد بولتے ہیں جب کہ بارہ فیصد 'سندھی'، دس فیصد 'سرائیکی'، ''انگریزی، اردو، پشتو''، آٹھ فیصد، 'بلوچی'، تین فیصد 'ہندکو'، دو فیصد اور ایک فیصد 'براہوی' زبان کا استعمال کرتے ہیں''۔(5)

اقوام متحدہ کے ادارہ برائے تعلیم و ثقافت کی تحقیق کے مطابق پاکستان کے شمالی علاقہ جات، صوبہ خیبر پختونخوا، بلوچستان، کشمیر، بھارت اور افغانستان سے ملحقہ سرحدی علاقوں میں بولی جانے والی اٹھائیس چھوٹی مادری زبانوں کو ختم

ہونے کا خطرہ لاحق ہے۔ان میں سے سات زبانیں غیر محفوظ گردانی جاتی ہیں جن کو بولنے والوں کی تعداد ستاسی ہزار سے پانچ لاکھ تک ہے۔اس کے علاوہ چودہ زبانوں کو خاتمے کا یقینی خطرہ لاحق ہے جن کو بولنے والوں کی تعداد کم سے کم پانچ سو اور زیادہ سے زیادہ سڑسٹھ ہزار ہے۔ چھ زبانیں ایسی ہیں جن کے بولنے والوں کی تعداد دو سو سے پچپن سو کے درمیان ہے، یہ زبانیں ختم ہونے کے شدید خطرے کا شکار ہیں۔ برطانوی قومی شماریات کی رپورٹ کے مطابق برطانیہ میں مقیم پاکستانی نژاد افراد کی ایک بڑی تعداد عام بول چال کے لیے 'پنجابی' زبان استعمال کرتی ہے اور 'پنجابی' زبان 'برطانیہ' کی تیسری بڑی زبان کے طور پر ابھر کر سامنے آئی ہے۔

دنیا میں اتنی زیادہ زبانوں کا پیدا کرنا یقیناً اللہ کی قدرت کی بہت بڑی نشانی ہے۔ایک انسان ہزاروں اور لاکھوں لوگوں کے مجمع میں اپنی زبان اور لہجے سے پہچان کرا لیتا ہے اور اس کی زبان اس کی قوم، ملک اور علاقے کا تعارف کرا دیتی ہے۔ زبان ایک ایسا سماجی ورثہ ہے جو زمانے کے ساتھ ساتھ ایک نسل سے دوسری نسل کو منتقل ہوتا رہتا ہے۔ زبان بلاشبہ کسی بھی انسان کی ذات اور شناخت کا اہم ترین جزو ہے۔ قومیتی شناخت اور تہذیبی و ثقافتی میراث کے طور پر مادری زبانوں کی حیثیت مسلمہ ہے۔مادری زبانوں کو انسان کی دوسری جلد بھی کہا جاتا ہے۔اس میں کوئی شک نہیں کہ مادری زبان اللہ تعالیٰ کی طرف سے ایک عطیہ ہے۔آج انسان ترقی کی جس منزل پر پہنچا ہے، اس میں ایک بڑا حصہ زبان کا ہے۔ مادری زبان کی حفاظت کے لیے ہر ممکن کوشش کرنی چاہیے۔ زبان کی اہمیت اپنی جگہ لیکن اس کا ہرگز یہ مطلب نہیں کہ انسان اپنی زبان پر فخر کرے اور دوسرے کی زبان کو حقیر جانے یا زبان کی بنیاد پر قتل و قتال کرنے لگے۔ اگر کوئی ایسا کرتا ہے تو وہ لسانیت کا دوست ہو سکتا ہے لیکن ہرگز ہرگز انسانیت کا دوست نہیں ہو سکتا۔

لسانی خاندان

ماہرین لسانیات نے دنیا کی زبانوں کو نو خاندانوں میں تقسیم کیا ہے۔ان میں 'انڈو یورپین' سب سے بڑا خاندان ہے جس میں یورپ اور ایشیا کی مشہور زبانیں مثلاً 'سنسکرت'، 'لاطینی'، 'فارسی'، 'انگریزی'، 'جرمن' وغیرہ شامل ہیں۔ ''رگ وید'' کے مطالعہ سے پتا چلتا ہے کہ آریاؤں کی آمد سے قبل 'سپت سندھو' میں کچھ اور قومیں آباد تھیں جن کے لیے ویدوں میں 'داس'، 'اشور'، 'نشادا'، 'پشاچہ' اور 'راکھشس' وغیرہ کے الفاظ استعمال کیے گئے ہیں۔ یہ بھی بتایا گیا ہے کہ وہ لوگ عجیب زبان بولتے تھے۔ان کے رسوم و رواج آریاؤں سے قطعاً مختلف تھے۔ موجودہ حالات میں حتمی طور پر کچھ نہیں

کہا جا سکتا کہ آریاؤں کی آمد سے قبل اس علاقے میں کون سی زبان بولی جاتی تھی نہ ہی یہ معلوم ہو سکا کہ پنجاب کی قدیم ترین زبان کون سی ہے کیونکہ 'ہڑپہ' اور 'موہنجوداڑو' سے دریافت شدہ تحریریں ابھی تک پڑھی نہیں جا سکیں۔ اُنیسوِیں اور بیسوِیں صدی کے شروع میں لِسانی مسائل میں سے سب سے زیادہ توجہ تبوِیب الالسنہ یعنی زبانوں کی شجرہ بَندی (Language Classification) پر دی جاتی رہی اور طے پایا کہ 'دراوڑی' اور 'آسٹرک' کے علاوہ برصغیر کی تمام زبانیں (Indo-European) 'ہِند آریائی' خاندان کی زبانوں سے تعلق رکھتی ہیں۔ ' اِیرانی' اور 'داردی' زبانوں کے علاقہ کو چھوڑ کر انڈک (Indic) شاخ کا وسیع خطہ سندھ سے لے کر بنگال تک پھیلا ہوا ہے۔

جب تک تاریخ پیش نظر نہ ہو، یہ جائزہ لینا محال ہے کہ پنجابی خالص ہند آریائی شاخ سے تعلق رکھتی ہے یا اس میں دوسرے خاندانوں کے اجزا بھی ہیں۔ اس سلسلے میں مختلف ماہرین لسانیات نے مختلف نظریات پیش کیے ہیں۔ ایک نظریے کے مطابق 'پنجابی' ہند آریائی زبان ہے اور 'ہندی'، 'سندھی' اس کی بہنیں ہیں۔ تاریخی اعتبار سے 'کول'، 'بھیل' اور 'سنتھال' قوموں کو یہاں کے قدیم باشندے سمجھا جاتا ہے اور ان کی زبانوں کو 'منڈا' خاندان کی زبانیں کہا جاتا ہے۔ اس کے بعد 'دراوڑ' خاندان یعنی 'تامل'، 'تلیگو'، 'ملیالم' وغیرہ کی باری آتی ہے۔ ان زبانوں میں کثرت سے ایسے الفاظ ملتے ہیں جو لہجہ کی خفیف سی تبدیلی کے بعد پنجابی زبان میں مستعمل ہیں۔ ان قبیلوں کے بارے میں شفقت تنویر مرزا نے اپنی کتاب میں لکھا ہے؛

> ''سر جان مارشل، ڈاکٹر ایچ آر پال، ولسن ہنٹر تے دوجے سیانیاں دا خیال اے پئی ہڑپا تے موہن جوڈرو دی تہذیب توں پہلاں ایس علاقے اندر آری نل تہذیب دا سا سی۔ تے آری نل تہذیب دا سلسلہ منڈا قبیلیاں نال جوڑیا جاندا اے جو دراوڑیاں توں پہلاں دے ایس علاقے دے وسنیک دسے جاندے نیں۔ ایہہ منڈا قبیلے کول، بھیل، سنتھال، منڈا، ساورا، ہو، کورو، جانگ، کدی پنجاب توں لے آسٹریلیا تے نیوزی لینڈ تائیں کھنڈے ہوئے سن پر اج ایہہ کجھ علاقیاں اندر خاص کر اجاڑاں تے جنگلاں اندر آباد نیں''۔ (6)

پس منظر

پنجابی زبان 'ہند یورپی' زبانوں کے گروہ کی زبان ہے۔ پنجابی زبان ہندوستانی اور ایرانی زبانوں کا امتزاج ہے اور اس کو ہندوستانی زبانوں میں مؤثر حیثیت حاصل ہے۔ پنجابی زبان کو ''آپ بھرنش'' پراکرت زبان سے نکلی ہوئی زبان کہا جاتا ہے۔ پنجابی قوم مختلف نسلوں کے اختلاط سے معرض وجود میں آئی ہے۔ پنجابی علاقوں پر حملہ آوروں کے علاوہ مہاجرت کے ذریعہ آباد ہونے والے قبیلوں میں سے زیادہ تر کا تعلق شمالی پہاڑی علاقوں اور ممالک سے تھا اور جن کی منتقلی کی وجوہ ان علاقوں میں روزگار کے کم مواقع، سخت موسمی حالات، زرعی اجناس کی کمی، پنجاب کی سرسبز زمین، لہلہاتے کھیت، پانی کی فراوانی، جانوروں کے لیے چراہ گاہوں کی بہتات اور دوسرے لوگوں کو اپنے علاقوں میں جذب کرنے کی مقامی آبادی کی صلاحیت تھی۔

پنجابی زبان کا اِرتقا اور ترویج

پنجاب کی تہذیب کا شمار دنیا کی قدیم ترین تہذیبوں میں ہوتا ہے۔ یہاں کئی تہذیبوں نے جنم لیا، پروان چڑھیں اور گردشِ زمانہ کی وجہ سے صفحۂ ہستی سے مٹ گئیں۔ ان تہذیبوں کے آثار کئی جگہوں سے دریافت ہوئے ہیں جن کی مدد سے ماہرینِ آثارِ قدیمہ ان تہذیبوں کا کھوج لگا کر ہمیں اس تہذیب و تمدن سے آشنا کر رہے ہیں۔(7)

ہر زبان کی طرح پنجابی زبان کی ابتدا کے بارے میں بھی مختلف نظریات سامنے آتے ہیں جن میں سے ایک نظریے کے مطابق یہ ''آریائی'' کنبے کی زبان ہے اور ''سنسکرت'' کی وارث ہے۔ دوسرا نظریہ ہے کہ پنجابی زبان ''دراوڑی'' اور ''منڈا'' کنبے کی زبان ہے۔ ان دونوں نظریات کے باوجود یہ بات اپنی جگہ پر خاصا وزن رکھتی ہے کہ ان گروہوں یا قبیلوں کے اس خطے میں آنے سے پہلے بھی یہاں پر کوئی مقامی زبان موجود تھی جس میں یہاں بسنے والے لوگ آپس میں گفت و شنید کرتے اور تعلقات برقرار رکھے ہوئے تھے۔

پنجابی زبان کا زیادہ تر علاقہ برصغیر پاک وہند کے اس علاقے سے تعلق رکھتا ہے جو آزادی سے پہلے ''پنجاب'' کہلاتا تھا۔ ملتان کا علاقہ 'ملی' قوم کی وجہ سے ''مولستھان'' کہلاتا تھا، محمد بن قاسم کی فتح سندھ سے لے کر محمود غزنوی کے زمانہ تک بالائی سندھ کے زیر اثر رہا۔ موجودہ علاقہ ''پنجاب'' فروری 1853ء میں چیف کمشنر (سر جان لارنس) کے تحت پہلی دفعہ سیاسی اکائی کی طرح لایا گیا۔ 'حصار' اور 'دہلی' ڈویژن پہلے 'آگرہ' گورنمنٹ کے ماتحت تھے، 1857 کے بعد انتظامیہ کی سہولت کی غرض سے پنجاب کے علاقہ میں منتقل کر دیے گئے۔ پاکستان میں شامل خطے کی تہذیبی میراث جس کے سارے فلسفے کا مرکز دینِ اسلام تھااور جو تقریباً ایک ہزار سال سے زائد پرانی روایات کی حامل ہے اور جو بعد میں پاکستانی قومیت کی اساس بنیں۔

پرانی پنجابی کے دور میں ''لہندی'' زبان زوروں پر تھی جس میں ''عربی''، ''ترکی'' اور ''فارسی'' کا اثر تسلیم شدہ تھا مگر اصلی پنجابی کی اصواتیات، الفاظ اور ہندوی کے افعال کی حالتیں نمایاں تھیں۔ موجودہ زمانہ کی دیسی بولیوں کی غیر تصیفی (Analytic) خصوصیات ابھی شروع نہ ہوئی تھیں بلکہ مضارع ہی آج کل کے بہت سے فعلوں کی بجائے استعمال ہوتا تھا اور جزو لاحق (Postpositions) استعمال میں نہ آتا تھا۔ اسم صفت اکثر زیر بڑھا کر بنا لیے جاتے تھے، برُجی کی اصواتیات کا اثر کہیں نہیں ملتا تھا۔ شروع شروع میں لاہور مسلمانوں کا دارالخلافہ رہااور اس عرصہ میں بیشمار غیر ملکی الفاظ پنجابی کی سان پر چڑھے، یہاں تک کہ جب 1193ء میں مسلمانوں نے دہلی کو دارالخلافہ بنایااور 'ریختہ' قسم کی شاعری شروع ہوئی تو اس کا اثر پنجابی شاعروں پر بھی ہوااور انھوں نے اُسی کی نقل میں شعر لکھے۔ ایسی پنجابی کو ہم اردو کا پیش خیمہ کہہ سکتے ہیں اور اسی وجہ سے اردو کو شروع شروع میں ''لاہوری'' کا نام بھی دیا گیا تھا اور بعینہ اردو کو ''ملتانی'' بھی کہا گیا، ورنہ پنجابی کی ملتانی بولی کے لیے تو لفظ ''ملتانی'' مقامی طور پر استعمال ہی نہیں ہوتا تھا۔

اقوامِ متحدہ نے زبان کے نام پر نسل کشی کو انسانیت کے خلاف ایک جرم قرار دیا ہے جبکہ پاکستان میں اشرافیہ پنجابی زبان کا مسلسل استحصال کر رہی ہے۔ ہندوستانی پنجاب میں پنجابی زبان کی حالت خاصی بہتر ہے۔ وہاں پر سکھوں کی شناخت پنجابی زبان کے حوالہ سے ہے اور ان کی مذہبی زبان پنجابی ہے۔ وہاں صوبے کی سرکاری زبان پنجابی ہے مگر ہندی اور انگریزی زبانوں کے دباؤ کے ذریعہ اس کو وہاں بھی محدود کرنے کی کوشش کی جا رہی ہے۔ وہ اس کو دقیانوسی اور قدامت پسند زبان قرار دیتے ہیں جس میں جدیدیت اور گلوبلائزیشن کے تقاضوں کے ساتھ چلنے کی صلاحیت موجود نہیں ہے اور یہ محض اب دیہاتیوں کی زبان ہے۔

برصغیر میں پنجابی کبھی ریاستی زبان نہیں رہی ہے حالانکہ مشرقی پنجاب میں یہ ایک صوبائی سطح کی سرکاری زبان ہے۔ عالمگیریت کے عہد میں جہاں پر ایک نیا عالمی تجارتی اور ثقافتی کلچر ابھر رہا ہے کسی علاقائی زبان کا ابھرنا ایک معجزے سے کم نہیں ہے۔ بیسویں صدی کے دوران سامراج نے اپنی مشکلات اور عالمی جنگ میں ہونے والے نقصانات کے بعد اپنی نوآبادیوں کو آہستہ آہستہ آزاد کرنا شروع کردیا جس سے دنیا کے نقشے پر کئی نئے ملک ابھر آئے۔ زبان کی یکساں شناخت کے باوجود سرحدیں، قومیں اور نسلی تضادات قائم رہے جس کا اظہار یوگوسلاویہ میں نسلی فسادات اور سویت یونین میں مسلمان ریاستوں کی آزادی سے ہوا۔ اس لیے شناخت کے معاملے کو صرف زبان تک محدود نہیں کیا جاسکتا بلکہ اس کے کچھ نسلی، علاقائی اور ثقافتی حوالے بھی ہیں۔

پاکستان کا قیام مسلمانوں اور ہندوؤں کے درمیان قومیت کا مسئلہ تھا۔ ہندوستان کی آزادی کے وقت سِکھوں نے اپنے ہم زبان پنجابی مسلمانوں کا ساتھ دینے کی بجائے ہندوؤں کے ساتھ ناتا جوڑا۔ آج گلوبل ٹریڈ نے ریاستوں اور علاقوں کے درمیان فاصلوں کو ختم کردیا ہے۔ تمام قومیں رنگ و نسل کی پرواکیے بغیر لین دین میں مصروف ہیں۔ قوموں کے درمیان نفرت کی دیواریں گررہی ہیں مگر ساٹھ سال گزرنے کے بعد بھی ہندوستان اور پاکستان کے درمیان اختلافات ختم نہیں ہوسکے حالانکہ دونوں طرف بسنے والے پنجابی ایک دوسرے کے ساتھ ملنا اور رابطے بڑھانا چاہتے ہیں۔ ممتاز دانشور اور شاعرہ امرتا پریتم کو تمام عمر اپنی جنم بھومی لاہور دیکھنے کی خواہش رہی۔ اس نے ''اج اکھاں وارث شاہ نوں'' میں اس کا اظہار کیا ہے۔

ملک میں ترقی پسند جماعتوں نے ہمیشہ علاقائی زبانوں کی حمایت کی ہے۔ بدقسمتی سے پنجاب میں اس زبان کے مختلف لہجوں اور تلفظ کی وجہ سے پنجابی زبان کے فروغ کی کوئی اجتماعی تحریک کامیاب نہیں ہوسکی۔ سابقہ پنجاب حکومت نے پنجابی کے فروغ کے لیے ادارے قائم کیے تھے اور اس ضمن میں کچھ تحقیق اور تخلیقی کام بھی شروع ہوا تھا۔ موجودہ حکومت کی بھی ذمہ داری ہے کہ وہ پنجابی زبان کے فروغ کے ادارے قائم کرے اور پرائمری کی سطح تک نصاب بھی پنجابی میں پڑھایا جائے۔

پنجابی زبان کا رابطہ اس علاقے کی قدیم ہڑپائی اور دراوڑی زبان سے ملتا ہے۔ تاریخی و جغرافیائی تبدیلیوں کے باعث اس کے مختلف لہجے یا بولیاں ہیں جن کو 'ماجھی'، 'پوٹھوہاری'، 'چھاچھی'، 'سرائیکی'، 'دھنی' اور 'شاہ پوری' جیسے مختلف ناموں سے موسوم کیا جاتا ہے۔ 'ماجھی' لہجہ معیاری لہجہ سمجھا جاتا ہے جو لاہور اور اس کے آس پاس کے علاقے میں مروج ہے۔ شروع میں یہ زبان ہندو جوگیوں اور مسلمان صوفیوں دونوں کی زندگیوں کا حصہ تھی۔ پنجابی زبان ایک وسیع و عریض خطے میں بولی اور سمجھی جاتی ہے جس کی حد دہلی (بھارت) سے لے کر خیر پور (سندھ) اور پشاور سے لے کر جموں (مقبوضہ کشمیر) تک پھیلی ہوئی ہے۔

حضرت نوشہ گنج بخش (1552) نے اس زبان کے لیے پنجابی کا لفظ استعمال کیا ہے۔

پنجابی وچ کیوں پڑھو، پڑھو عربی وچ
تورا کلمہ عرب ہے، پڑھے نہ ہوئے زچ

حافظ برخوردار نے "مفتاح الفقہ" (1669) میں لکھا ہے۔

حضرت نعمان دا فرمایا، اس وچ اوہ مسائل
تُرت پنجابی آکھ سناویں، جے کو ہوئے مائل

حافظ برخوردار نے "قصہ قضاو قدر" میں لکھا؛

حافظ آن سنایا قصہ بولی وچ پنجابی

مولوی کمال دین نے "انتخاب الکتب" (1708) میں لکھا؛

ویکھ کتاباں مسئلے جوڑے، وچ زبان پنجابی
یاد کرو تے پڑھو ہمیشہ، نال طبیعت تازی

سر گودھا کے صدیق لالی نے ''یوسف زلیخا'' (1725) میں لکھا ہے؛

ستارھویں ایہ حدیث نبیؐ دی، آکھ صدیق پنجابی

حافظ برخوردار رانجھا نے ''گنج العرش'' (1776) کے ترجمے میں لکھا؛

معنی گنج العرش دے پنجابی لکھ وکھائے

ڈیرہ غازی خان کے قاضی امام بخش شیروی ''باغ وبہار'' (1897) میں یوں لکھتے ہیں؛

بعد ازاں وچ اردو تھئے، تالیف حکم صبحانے

ہن بولی پنجابی جوڑیم، قصے بوہت پرانے

چکوال کے مولوی محمد سلیمان نے ''معراج نامہ کلاں'' (1899) میں کہا تھا؛

پشاور تھیں جمناتائیں، چنبہ تھیں تا ڈیرہ
بولن سمجھن لوگ پنجابی سچا سخن ایہہ میرا

مظفر گڑھ کے مولوی اللہ بخش خادم ''ہیر رانجھا'' (1923) میں یوں لکھا ہے؛

بلبل بُستاں، شعر پنجابی، شیرِ شکر اشعار اے
قرب جوار پنجاب اندر خود ایہہ شاعر جرار اے (8)

پنجابی زبان کے لہجے اور نام

یہ لسانی حقیقت ہے کہ ہر زبان اولاً محض ایک ''بولی'' (Dialect) ہوتی ہے جس کا دائرہ اثر ورسوخ ایک

چھوٹے سے علاقے یا خطے تک محدود ہوتا ہے۔ جب یہ 'بولی' بعض ناگزیر اسباب اور تقاضوں کے سبب جن میں سیاسی، سماجی اور تہذیبی و ثقافتی تقاضے بھی شامل ہیں، اہم اور مقتدر بن جاتی ہے، اس کا چلن عام ہو جاتا ہے، یہ اپنی علاقائی حد بندیاں توڑ کر دور دراز علاقوں میں اپنا سکہ جمانے لگتی ہے تو ''زبان'' کہلاتی ہے۔ پھر اس کا استعمال ادبی و دیگر مقاصد کے لیے ہونے لگتا ہے اور اس کی معیار بندی (Standardization) بھی عمل میں آتی ہے جس سے یہ ترقی یافتہ زبان کے مرتبے تک پہنچ جاتی ہے۔ پاکستان میں 69 سے زیادہ زبانیں بولی جاتی ہیں مگر قومی زبان 'اردو' اور صوبائی زبانوں 'پشتو'، 'سندھی'، 'پنجابی' 'براہوی' اور 'بلوچی' کے علاوہ دیگر زبانوں کا علم کم ہی لوگوں کو ہو گا۔ بہت سے لکھاری اور ماہرین دیگر زبانوں کو زبان ماننے کو تیار نہیں۔ وہ ان کو 'لہجے' یا 'بولی' ہی کہتے ہیں۔ 'بولی' کہنا اس حد تک صحیح ہے کہ اگر اس سے ان افراد کا مطلب ان زبانوں میں تحریر کا موجود نہ ہونا ہو۔

پنجاب میں ایک پرانی روایت ہے کہ لہجوں اور بولیوں کو علاقوں اور دریاؤں کے نام سے یاد کیا جاتا تھا۔

''پنجاب دی اِک بہوں نویکلی تے بُہوں منڈھ قدیمی رِیت اے بولیاں نوں شناخت کرن دی۔ کیہڑی؟

بولیاں نوں دریاواں دے ناواں نال جوڑ کے جیویں

'چنانہہ دی بولی'	'راوی دی بولی'
'بیاس دی بولی'	'جہلم دی بولی'
'ستلج دی بولی'	'سندھ دی بولی'

ایہہ بولیاں نیں اِک دوجے دے نال رَلویاں تے ملاوڑیاں، اِک توں دوجے بنےَ تائیں، اِک دریا توں دوجے دریا تائیں۔ ایہو پینگھ دا جھوٹا اے رنگ رنگیلڑا، بابا فرید شکر گنج توں خواجہ غلام فرید تائیں۔ ایہو نویکلا بخت اے پنجاب دا''۔ (9)

''بولیاں دی شناخت ہِک پاسے تاں دریاواں دے ناواں دے نال جوڑ کے تھِیندی رہی، دوجے پاسے علاقیاں دے ناواں دے نال جوڑن داڈھنگ شروع تھیا، جیویں

'دوآبے دی بولی'	'باردی بولی'
'لاہوری'	'ملتانی'
'ریاستی، بیکانیری'	'پنڈی وال'
'کیمبل پوری'	'ابھے دی بولی'
'لمے دی بولی'	

پورے پنجاب وچ جیویں جیویں وسوں دا ہک تھاں اُتے ٹِکاتے ہِک تھاں اُتے زندگی دا انحصار اپوندا گیا، پورے پنجاب وچ نِری ہِک بولی دا علاقہ اوویں نہ رہیا۔ الہواں رنگ تاں رہیا آپنی آپنی بولی دا، پَر اندروں اندر ہور بولیاں دی رَلت وی ٹُرپئی۔ ایہوا چیری پدھراتے جوڑویں وحدت اے۔
کہیں وی علاقے دی بولی دا اُلرواں رنگ نہیں مُگدا ابھاویں ایس بولی وچ بہوں ہور رَلویاں بولیاں وی آ رَلن۔ کہیں وی علاقے دی بولی نوں مُکن دا کوئی خطرہ نہیں۔ ہِک اچُیرے پدھر اُتے، کہیں بولی دادوجی رَلویں بولی دے نال رلن، بولی دا ودھااے، مُکن نہیں۔ کہیں بولی نوں مُکن دا کوئی خطرہ نہیں، رَلن دے نال پورے پنجاب وچ''۔(10)

پنجابی زبان کے لہجے اور علاقے

لاہوری: یہ لاہور اور اس کے ارد گر کے اضلاع میں بولی اور سمجھی جاتی ہے۔

سیالکوٹی: یہ سیالکوٹ اور اس کے ارد گرد کے اضلاع میں بولی اور سمجھی جاتی ہے۔

گجراتی لہجہ: ضلع گجرات اور جہلم کے اردر گرد بولا جاتا ہے

راولپنڈی کا لہجہ: جسے بعض افراد پوٹھواری بھی کہتے ہیں۔

ملتانی لہجہ: یہ ملتان میں سرائیکی اور بلوچی سے متاثر ہے اگرچہ پنجابی ہی شمار کی جاتی ہے۔

پڑوسی ملک بھارت کے علاقے مشرقی پنجاب جس کو اب مزید کئی صوبوں میں تقسیم کر دیا گیا ہے، اس میں زیادہ تر پنجابی زبان ہی بولی جاتی ہے مگر اس کا انداز اور لہجہ پاکستان میں بولی جانے والی پنجابی سے کافی مختلف ہو چکا ہے۔ بھارت میں پنجابی کے بڑے لہجے 'ماجھی'، 'دوآبی'، 'مالوی' اور 'پواڑھی' وغیرہ ہیں۔ پاکستان میں ماجھی، پوٹھوہاری، ملتانی وغیرہ بڑے لہجے ہیں۔ ماجھی لہجہ دونوں ممالک میں معیاری سمجھا جاتا ہے۔

ماجھی: ماجھی پنجابی کا معیاری لہجہ ہے یہ پنجاب کے دل اور تاریخی علاقے ماجھا میں بولا جاتا ہے۔ یہ لاہور، شیخوپورہ، قصور، اوکاڑہ، ننکانہ صاحب، فیصل آباد، گوجرانوالہ، وزیرآباد، سیالکوٹ، نارووال، گجرات، پاکپتن، وہاڑی، خانیوال، ساہیوال، حافظ آباد، منڈی بہاؤالدین میں بولی جاتی ہے۔ اس کے علاوہ یہ پاکستانی پنجاب کے بڑے شہروں میں بولی جاتی ہے۔ بھارت میں یہ امرتسر، ترن تارن، گوارد سپور کے اضلاع اور بھارتی پنجاب، ہریانہ، اترانچل پردیش، دہلی اور ممبئی جیسے بڑے شہروں میں بولی جاتی ہے۔

شاہپوری: شاہپوری لہجہ زیادہ تر پاکستانی پنجاب میں بولا جاتی ہے۔ یہ لہجہ پنجابی کے قدیم ترین لہجوں میں سے ہے جو سرگودھا ڈویژن میں بولا جاتا ہے اس کا نام ضلع شاہپور (جو ضلع سرگودھا کی ایک تحصیل ہے) سے اخذ کیا گیا ہے، اسے ماجھی پوٹھوہاری اور تھلوچی لہجوں کا مکسچر کہا جا سکتا ہے۔ ضلع خوشاب میں شاہپوری لہجہ تھلوچی سے زیادہ قریب لگتا ہے جبکہ جنوبی شاہپوری پر جھنگوچی کا اثر زیادہ ہے۔ یہ لہجہ زیادہ تر ضلع سرگودھا اور ضلع خوشاب میں بولا جاتا ہے اس کے علاوہ میانوالی اور بھکر وغیرہ میں بھی بولا جاتا ہے۔ یہ لہجہ دریائے چناب کے مغربی جانب دریائے جہلم کو پار کرتے ہوئے دریائے سندھ کے کنارے تک بولا جاتا ہے۔

جھنگوچی،چنگوی: جھنگوچی یاچنگوی پنجابی کاایک قدیم اور انفرادی مزاج رکھنے والالہجہ ہے اور جغرافیائی طور پر ایک وسیع رقبے پر بولا جاتاہے۔یہ خانیوال و جھنگ کے اضلاع میں دریائے چناب اور دریائے راوی کے درمیان کے علاقے میں بولا جاتاہے۔اس تمام علاقے کی ثقافت اور رسم و رواج تقریباً ایک جیسے ہیں۔ یہ علاقہ قدیم ثقافتی ورثے سے مالا مال ہے۔ اسی علاقے میں ہیر رانجھا اور مرزا صاحباں کی رومانوی کہانیوں کاآغاز ہوا تھا۔اس لہجے کو ''بھیچری''لہجہ کانام بھی دیاجاتاہے،یہ ضلع جھنگ میں بولا جاتاہے۔ جھنگوچی لفظ جھنگ سے ہی نکلا ہے۔چنگوی، چنگ سے نکلاہے جو پنجابی میں جھنگ کو کہا جاتا ہے۔یہ لہجہ چنیوٹ خانیوال اور ٹوبہ ٹیک سنگھ کے بھی کئی علاقوں میں بولا جاتاہے۔

جانگلی،رچنوی: پنجابی زبان کا یہ لہجہ ٹوبہ ٹیک سنگھ میں بولا جاتاہے۔اس کے علاوہ قلیل مقدار میں ساہیوال، چنیوٹ اور فیصل آباد کے اضلاع میں بھی بولا جاتا ہے۔

مالوی: یہ لہجہ بھارتی پنجاب اور پاکستانی پنجاب کے مشرقی حصے میں ضلع بہاولنگر، ضلع وہاڑی اور ضلع بہاولنگر کے سرحدی علاقے میں بھی بولا جاتاہے۔یہ لہجہ بھارتی پنجاب کے جنوبی حصوں لدھیانہ، امبالا،بٹھنڈا، گنگانگر،مالیر کوٹلا، فاضِلکااور فیروزپور کے اضلاع اور ہریانہ کے شمالی حصوں میں بھی بولا جاتاہے۔

دوآبی: دوآبی لہجہ بھارتی اور پاکستانی پنجاب دونوں میں بولا جاتاہے۔بنیادی طور پر یہ بھارتی پنجاب میں بولا جاتا ہے لیکن تقسیم کے بعد دوآبی مسلمانوں کی پاکستان ہجرت کی وجہ سے پاکستانی پنجاب میں بولا جاتا ہے۔لفظ دوآبی کا مطلب دو دریاؤں کے درمیان کی سرزمین ہے۔تاریخی طور پر یہ لہجہ دریائے ستلج اور دریائے بیاس کے درمیان دوآبہ کے علاقے میں بولا جاتا تھا۔اب یہ لہجہ ضلع جالندھر اور ضلع کپورتھلہ میں بولا جاتاہے۔ اس کے علاوہ یہ فیصل آباد اور ٹوبہ ٹیک سنگھ میں بولا جاتا ہے جہاں اسے فیصلابادی پنجابی کانام دیاجاتاہے۔

پواڑھی: پنجابی کا یہ لہجہ بھارتی پنجاب میں بولا جاتاہے۔

پوٹھوہاری، پہاڑی: یہ لہجہ شمالی پنجاب اور آزاد کشمیر میں بولا جاتا ہے۔بنیادی طور پر یہ سطح مرتفع پوٹھوہار میں بولا جاتا ہے۔ پوٹھوہار سے ہی اس لہجے کا نام پوٹھوہاری رکھا گیا ہے۔ یہ لہجہ شمال میں مظفرآباد تک بولا جاتا ہے جہاں اسے پہاڑی کہا جاتا ہے۔ جنوب میں یہ جہلم، گوجر خان، روات، راولپنڈی اور مری میں بولا جاتا ہے۔ شمال میں یہ بھمبر اور راولا کوٹ میں بولا جاتا ہے۔چیبھالی، ڈھونڈی اور کیرالی لہجے بھی پوٹھوہاری سے ملتے جلتے ہیں۔

ملتانی: پنجابی کا یہ لہجہ ملتان اور لودھراں کے اضلاع میں بولا جاتا ہے۔1920ء میں ماہر لسانیات گریریسن نے برصغیر کی زبانوں کے تذکرے میں اسے مغربی پنجابی یا لہندا کہا۔ 1962ء میں دعویٰ کیا گیا کہ یہ ایک الگ زبان ہے اور اسے سرائیکی کا نام دیا گیا۔

کوہاٹی، پشاوری، ہندکو: پنجابی کے یہ لہجے خیبر پختونخوا اور پنجاب کے سرحدی علاقوں میں بولے جاتے ہے۔ یہ لہجہ پشاور، نوشہرہ، کوہاٹ، ایبٹ آباد، مانسہرہ اور ہری پور کے اضلاع میں بولے جاتے ہیں۔ آزاد کشمیر میں یہ ضلع نیلم کے نچلے نصف حصے میں بولا جاتا ہے۔یہ تاریخی طور پر پنجابی کے لہجے مانے جاتے ہیں۔1920ء میں ماہر لسانیات گریریسن نے اسے مغربی پنجابی (لہندا) کا ایک لہجہ کہا۔ 'ہندکو' کو ایک الگ زبان ہونے کا دعویٰ بھی کیا جاتا ہے جو سچ نہیں لگتا۔

ڈیرہ والی: پنجابی کا یہ لہجہ زیادہ تر راجن پور اور ڈیرہ غازی خان کے اضلاع میں بولا جاتا ہے، دعویٰ کیا جاتا ہے کہ یہ الگ زبان سرائیکی کا ایک لہجہ ہے۔

گھیبی، آوانکاری: یہ لہجہ کافی حد تک پوٹھوہاری سے ملتا جلتا ہے۔ یہ لہجہ زیادہ تر تحصیل فتح جنگ اور تحصیل پنڈی گھیب میں بولا جاتا ہے۔میانوالی میں بولا جانے والا لہجہ آوانکاری بھی گھیبی سے کافی حد تک مماثلت رکھتا ہے۔

ریاستی: ریاستی لہجہ صوبہ پنجاب کے بہاولپور، لودھراں اور رحیم یار خان کے اضلاع میں بولا جانے والا پنجابی کا ایک لہجہ ہے۔ یہ بہاولپوری یا چولستانی کے نام سے بھی مشہور ہے۔ ریاستی نام ریاست سے بنا ہے کیوں کہ یہ علاقہ بہاولپور ریاست کا حصہ تھا۔ یہ لہجہ ملتانی، راجستھانی اور ماجھی کا مکسچر ہے۔ اس لہجے کو سرائیکی لہجے کا بھی نام دیا جاتا ہے جسے بعض اوقات الگ زبان ہونے کا بھی دعویٰ کیا جاتا ہے۔

چھاچھی: چھاچھی لہجہ پاکستانی پنجاب میں بولا جانے والا پنجابی کا ایک لہجہ ہے۔ یہ پوٹھوہاری لہجے اور ہندکو لہجے کا مکسچر ہے۔ اس کا نام ضلع اٹک کے علاقے چھچھ سے اخذ کیا گیا ہے۔ بنیادی طور پر یہ لہجہ ضلع اٹک، ہزارہ ڈویژن اور آس پاس کے صوبہ پنجاب اور خیبر پختونخوا کے علاقوں میں بولا جاتا ہے۔

جندالی: جندالی لہجہ پوٹھوہاری، چھاچھی اور تھلوچی کا مکسچر لہجہ ہے۔ اسے روہی بھی کہا جاتا ہے یہ ضلع اٹک کی تحصیل جنڈ میں بولا جاتا ہے۔

تھلوچی، تھلی: تھلوچی، تھلی لہجہ پاکستانی پنجاب کے صحرائے تھل میں بولا جاتا ہے۔ یہ لہجہ دریائے سندھ کے مشرقی جانب ضلع بھکر، ضلع لیہ، ضلع مظفر گڑھ میں بولا جاتا ہے اور مغربی جانب صوبہ خیبر پختونخوا کے ڈیرہ اسماعیل خان، بنوں اور ٹانک اضلاع میں بولا جاتا ہے۔ یہ لہجہ شاہ پوری لہجہ سے کافی ملتا جلتا ہے جو ضلع سرگودھا اور خوشاب میں بولا جاتا ہے۔

دھنی: یہ لہجہ راولپنڈی ڈویژن میں بولا جاتا ہے۔ اس کا نام وادیٔ دھن سے اخذ کیا گیا ہے جہاں پر یہ بولی جاتی ہے۔ یہ وادی ضلع چکوال میں واقع ہے۔ یہ لہجہ چکوال، جہلم اور اٹک کے اضلاع میں بولا جاتا ہے۔ پوٹھوہار کے علاقے کے لوگ پوٹھوہاری بولتے ہیں لیکن چکوال اور خاص طور پر دھنی علاقے کے لوگ پوٹھوہاری نہیں بولتے ہیں۔ دھنی لہجہ شاہ پوری لہجے کے زیادہ قریب ہے۔

جافری، کھیترانی: پنجابی کا یہ لہجہ ڈیروالی ہے جس پر بلوچی اور سندھی کے اثرات بہت زیادہ ہیں۔ اس لیے یہ ڈیرے والی سے مختلف لگتا ہے۔ یہ بلوچستان کے موسیٰ خیل اور بارکھان اضلاع میں بولا جاتا ہے۔

چناوری: پنجابی کا یہ لہجہ ضلع جھنگ میں دریائے چناب کے مغربی جانب بولا جاتا ہے۔ یہ تھلوچی اور جھنگوچی کا مکسچر لہجہ ہے۔ چناوری نام دریائے چناب سے نکلا ہے۔

پنجابی یونیورسٹی، پٹیالہ، بھارت کی لہجوں کی فہرست

جامعہ پنجابی پٹیالہ کی پنجابی کے لہجوں کی فہرست کے مطابق پنجابی کے درج ذیل لہجے ہیں؛

1۔ آوانکاری
2۔ باردی بولی
3۔ بانوالی
4۔ بھٹیانی
5۔ بھیروچی
6۔ چھاچھی
7۔ چکوالی
8۔ چمبیالی
9۔ چناوری
10۔ دھنی
11۔ دوآبی
12۔ ڈوگری
13۔ گھیبی
14۔ گوجری
15۔ ہندکو
16۔ جٹکی
17۔ جھنگوچی
18۔ ملتانی
19۔ کانگڑی
20۔ کاچی
21۔ لبانکی
22۔ مالوی
23۔ پہاڑی
24۔ پوٹھوہاری/پنڈی والی
25۔ پواڑھی
26۔ پونچھی
27۔ پشوری، پشاوری
28۔ راٹھی
29۔ سوائیں
30۔ شاہپوری
31۔ تھلوچی
32۔ وزیرآبادی۔(11)

Punjabi is spoken in mainly three areas of the world; in East Punjab (India) where it is a state language, in West Punjab (Pakistan) where it is most widely spoken and in the diaspora, particularly Britain, North America, East Africa and Australia. No exact figures are available on the number of Punjabi speakers, either as a first or second language, but if the speakers of various dialects of Punjabi are taken into account an approximation of 100 million would not be too far from the truth.

One of the main problems with designating the exact number of Punjabi speakers is the presence of a large number of distinct dialects that are spoken across the large geographical area of East and West Punjab. There are some recognized dialects of Punjabi according to Language Department of Punjab:

1. Pothohari	2. Jhangi	3. Multani	4. Dogri
5. Kangri	6. Pahari	7. Majhi	8. Doabi
9. Malwai	10. Powadhi	11. Bhattiani	12. Rathi

According to Linguistic Department of Punjabi University, Patiala there are following dialects of the Punjabi language.

1. Bhattiani	2. Rathi	3. Malwai	4. Powadhi
5. Pahari	6. Doabi	7. Kangri	8. Chambiali
9. Dogri	10. Wajeerawadi	11. Baar di Boli	12. Jangli
13. Jatki	14. Chenavri	15. Multani	16. Bhawalpuri
17. Thalochri	18. Thali	19. Bherochi	20. Kachi
21. Awankari	22. Dhani	23. Ghebi	24. Hindki
25. Swaen	26. Chacchi	27. Pothohari	28. Punchi

One of the more interesting facts about the Punjabi language is that where it is numerically the most widely spoken, in Pakistani Punjab, it is hardly written at all. Punjabi is most often written in East Punjab in the Gurmukhi script. It is also possible to write the language in the Persian script often referred to as Shahmukhi in this context.

Despite the modern day usage of Gurmukhi, the first Punjabi literature was written in Shahmukhi, and popular history associates this writing with Sheikh Farid and Goraknath. However, the literary period of the language begins with the sacred scriptures of the Sikhs, the Guru Granth Sahib, This collection of writings by the Sikh Gurus is probably the first manuscript of the Punjabi language. After the period of the Gurus, it was the Sufi poets who developed the Punjabi language. In fact it is the folk literature developed by the Sufis, and particularly the Quissa-Love ballad form-which has had a long and lasting impact on the development of Punjabi literature. The stories of Heer-Ranjha and Mirza-Sahiban are deeply embedded in the everyday life and culture of Punjab. (12)

پنجابی زبان کا فروغ

سولہویں سے انیسویں صدی کے دوران پنجابی زبان و ثقافت کا فروغ ہندو بھگتوں، سکھ گُوروؤں اور مسلمان صوفی شعرا کے ذریعہ ہوا جنھوں نے مضبوط نظریاتی پنجابیت کا درس دیا۔ اس عمل میں 'بابا بلھے شاہ' اور 'شاہ حسین' نمایاں رہے ہیں۔ انھوں نے علامتی اظہار کے ذریعہ شاہی روایات اور اقتدار کے خلاف تحریروں میں عوامی جذبات کا اظہار کیا تھا۔ ہندوستان کے پنجابی حکمران رنجیت سنگھ (1839-1799) نے پنجابی ریاست قائم کی مگر سرکاری زبان فارسی رکھی۔ 1849 میں پنجاب میں انگریزوں نے دیگر برطانوی نوآبادیاتی علاقوں میں رائج اردو زبان کو پنجاب میں سرکاری زبان قرار دیا جس سے شہری علاقوں میں یہ تاثر ابھارا گیا کہ پنجابی زبان اردو اور ہندوستان سے بھی تعلق رکھتی ہے، یہ بات تقریباً

درست تھی۔ پنجابی زبان کو کبھی ریاستی سرکاری زبان کا درجہ حاصل نہیں ہوا۔ پنجابی زبان کی پہلی لغت انیسویں صدی کے وسط میں لدھیانہ کے عیسائی مشنریوں نے شائع کی۔ بیسویں صدی کے نصف تک پنجابی شناخت نسلی تضادات کی وجہ سے متاثر ہوئی۔

اگر مسلمان پنجابیوں نے پنجابی کو سکھوں کی زبان سمجھتے ہوئے اس کو سمجھنے اور اس پر تحقیق کی کوشش نہیں کی تھی تو ہماری نئی نسل بھی پنجابی زبان سے دور ہوتی جا رہی ہے جس کی وجہ سے اس کی وجودیت کو خدشات لاحق ہو چکے ہیں۔ ہم پنجابی بولتے ہیں مگر اس کو لکھ پڑھ نہیں سکتے۔ ہم گورمکھی نہیں پڑھ سکتے ہیں لیکن کچھ محنت کے ساتھ فارسی رسم الخط (شاہ مکھی) میں لکھی پنجابی کو پڑھ سکتے ہیں۔ ہم پنجابی ہونے کے حوالے سے پنجابی زبان کو سیکھنا چاہتے ہیں جس کے لیے رومن سکرپٹ سب سے آسان ہو سکتا ہے۔ ترکی، ملائیشیا اور انڈونیشیا کے لوگ رومن سکرپٹ استعمال کرتے ہیں۔ اسی طرح بنگلہ دیش میں بنگالی سمجھنے والے نئے لوگ رومن سکرپٹ استعمال کرتے ہیں۔ رومن سکرپٹ کے ذریعہ مسلمان، سکھ، ہندو اور عیسائی پنجابی میں ایک دوسرے کے ساتھ تبادلہ خیالات (کمیونیکیشن) کر سکتے ہیں۔ پنجابی زبان کی ترقی کے سلسلے میں بھولا ناتھ وارث نے تحریر کیا ہے؛

> ’’مسلماناں توں لہہ کے پنجاب وچ ہندواں دی آبادی ہے پر سانوں افسوس نال کہنا پیندا اے جو ہندوؤاں نے پنجابی دی کوئی سیوا نہیں کیتی۔ ہندواں وچ نہ تاں کوئی چج دا شاعر جمیا نہ اوہناں وچوں کسے نے کوئی کتاب لکھی۔
>
> تیجی دھر پنجاب دی آبادی سکھ ہن۔ سکھ گرُوواں دا بھلا ہووے جینہاں پنجابی نوں سکھاں دی دھارمک بولی بنایا۔ سکھاں نے پنجابی نوں سوہنی طراں ودھایا پھلایا۔ دھرم دیاں پُستکاں لکھیاں، کوِتا تے قصہ کہانیاں بنیاں‘‘۔ (13)

پنجابی شاعری اور زبان کو زندہ رکھنے میں میلوں ٹھیلوں، تھیٹر کمپنیوں اور لوک فنکاروں کا خاص کردار ہے۔ بہرصورت معروضی صورتحال میں گلوبلائزیشن کے نئے کلچر، زبان و کردار کے باوجود پنجابی زبان میں زندہ رہنے کی صلاحیت موجود ہے۔ جو زبانیں مقامی ثقافت اور کسی مذہب کے ساتھ نسبت رکھتی ہیں وہ ہمیشہ زندہ رہتی ہیں۔ پاکستان میں پنجابی زبان کے ساتھ سوتیلا سلوک روا رکھنے کے باوجود یہ ابھی تک پنجاب میں اکثریتی آبادی کی زبان ہے۔ یہ پاکستان کی واحد زبان ہے جس کو دوسری زبانیں بولنے والے آسانی سے سمجھ اور بول لیتے ہیں۔ پنجابی زبان میں نثری ادب کے بارے میں یوں کہا گیا ہے؛

''ان پڑھ یاں ادھ پڑھ لوکاں وچ تھوڑا بہت پنجابی دا شوق ہے پر اوہناں وچوں وی جیہڑا اٹھدا ہے شاعر بنیا پھردا ہے۔ کدھرے کوئی دربار ہووے، پنجابی شاعر برساتی کیڑیاں وانگر نکل کے ٹرپیندے ہن۔ نثریاں سرل لکھن دی کوشش کوئی نہیں کردا۔ نِری کوِتا نال بولی دا وادھا نہیں ہو سکدا''۔ (14)

''پنجاب لٹریچر دا کال سبھ نوں دس رہیا ہے پر پنجابیاں نے اجیہی گوہ گالی ہے جو ویکھدے ہن پر اکھاں میٹی ہوئے ہن۔ خداتاں آکے نہیں لکھ جاندا کتاباں، لکھدے ہن لکھے پڑھے لوکی۔ ویکھو بنگال، مدراس، یوپی، سی پی والیاں نے کس طراں دا سوہنا لٹریچر اپنیاں بولیاں وچ لکھ کے بنالیا اے۔ اِک ساڈھے ول ویکھو، لکھے پڑھے پنجابی جد کتاب لکھن بہن گے تے انگریزی وچ۔ جد لیکچر دین کھڑون تے انگریزی وچ، پنجابی ورتدیاں اوہناں دی ہیٹھی ہوندی اے''۔(15)

''چوتھی اک ہور گل اے جو بعضے لوکاں دا خیال ہے جو پنجابی بولن نوں چنگی ہے پر علمی مطلب دے کم

دی نہیں۔ کئی ساڈے دوست لٹریری لیگ وچ بہہ کے وڈے وڈے کاف تے عین سنگھ وی تھلیوں وی

کڈھ کڈھ کے ہماتڑ پنجابی ڈھگیاں نوں ڈراندے رہندے نیں کہ پنجابی وچ فلانی گل نہیں تے ڈھینگری

گل نہیں''۔ (16)

پاکستان میں زبانوں پر تحقیق

پاکستان میں زبانوں پر جتنی بھی تحقیق ہوئی ہے اس میں ان زبانوں کا خاص ذکر نہیں کیونکہ ان لوگوں کی مؤثر سیاسی نمائندگی نہیں اور پاکستان میں زبان کا مسئلہ شروع سے تعلیمی سے زیادہ سیاسی رہاہے۔ ان زبانوں کے بولنے والے ترقی کے لحاظ سے (Marginalized) یعنی دھتکارے ہوئے ہیں۔ان میں سے چند ایک کو جن کا عقیدہ مختلف ہے، باقاعدہ دہشت گردی کا خطرہ لاحق ہے۔ حال ہی میں کالاش اور اسماعیلی برادری کو دھمکی دی گئی ہے۔ میڈیا کے اس دور میں بھی ان علاقائی زبانوں میں پروگرامز تو کجا ان کا ذکر تک نہیں کیا جاتا۔ باوجود ان اقدامات کے جو نجی سطح پر ان زبانوں کی بقا کے لیے کیے جاتے ہیں، خدشہ ہے کہ بہت جلد یہ زبانیں ختم ہو جائیں گی۔

ڈاکٹر سید عبداللہ اس بارے میں لکھتے ہیں؛

''ہر وہ زبان ترقی یافتہ کہلا سکتی ہے جس میں دیگر ادبیاتی سرمائے کے سائنٹفک اصول پر مرتب شدہ

لغات موجود ہوں۔ جس میں فقہ اللسان (لسانی اصول) مرتب ہو چکے ہوں۔ جس میں باوقار اور اونچے

درجے کے انسائیکلوپیڈیا مدون ہو چکے ہوں۔ جس میں اصطلاحاتِ علمی کا ذخیرہ جمع ہو چکا ہو۔ جس کا

عروض تنظیم پاچکاہو اور سب سے آخر میں یہ کہ جس میں ادب عالیہ کے شاہکار (اصل یا ترجمہ) موجود ہوں۔" (17)

"جب کسی زبان میں انسائیکلوپیڈیا مرتب ہونے لگیں تو سمجھیں کہ یہ زبان اپنے علمی پھیلاؤ کی بعید ترین وسعتوں تک پہنچ رہی ہے۔ (18)

ارتقائی منازل طے کرتے ہوئے معاشرے کے وجود میں آنے کے بعد جوں جوں انسان ترقی کرتا گیا، اس کی زبان بھی ترقی کی منزلیں طے کرتی چلی گئی اور اس زبان نے ایسا روپ اختیار کر لیا جو اس کے بولنے والوں کی مذہبی، سماجی، ثقافتی، تہذیبی، تعلیمی، جمالی، معاشی، معاشرتی اور تمام ضروریات کو پورا کرنے کے لیے کافی ہوتی ہے۔

"اس زبان کے ذریعے ہی ہم کسی معاشرے کے نظام زندگی اور ماضی کے بارے میں کافی کچھ جان لیتے ہیں۔ تہذیبی ترقی کا تعلق زبان کی ترقی کے ساتھ ہے۔ لہذا یہ یقین سے کہا جا سکتا ہے کہ تہذیب اور تمدن کے ساتھ زبان کی ابتدا بھی ہوئی ہو گی۔ پھر جیسے جیسے تہذیب نیا رنگ، نئی صورت اور نیا روپ اختیار کرتی گئی اور ترقی کی منزلیں طے کرتے گئی، زبان بھی اس سے متاثر ہوتی رہی اور تہذیب کے نئے روپ کے اثرات قبول کرتی رہی"۔(19)

"بعض لوگوں کے نزدیک زبان کسی بھی تہذیب و ثقافت کا مکمل اور جامع مظہر ہوتی ہے۔ اس لیے کسی زبان کی روح اور اس کے اصل کو سمجھنے کے لیے اس کی ثقافت کو سمجھنا ضروری ہے جس کے تحت وہ زبان پروان چڑھتی ہے"۔ (20)

کسی بھی زبان کی ترقی اور ترویج کے سلسلے میں تعلیمی، تحقیقی، علمی، ادبی اور اشاعتی اداروں کا کردار نہایت اہم ہے۔ مختلف ادوار میں قائم ہونے والے یہ ادارے کیسے اور کب قائم ہوئے۔ ان کے اغراض و مقاصد کیا تھے اور یہ کیا کام کرتے رہے اس بارے میں چند حقائق درج ذیل ہیں۔

1857 کے بعد علمی و ادبی ادارے

1857 کے ہنگاموں کے بعد ملک میں ایک تعطل پیدا ہو گیا تھا جس کو دور کرنے اور زندگی کو از سرِ نو متحرک کرنے کے لیے حکومتی ایما پر مختلف صوبوں اور شہروں میں علمی و ادبی سوسائٹیاں قائم کی گئیں۔ سب سے پہلے بمبئی، بنارس، لکھنو، شاہ جہاں پور، بریلی اور کلکتہ میں ادبی انجمنیں قائم ہوئیں اور ایسی ہی ایک انجمن لاہور میں جنوری 1865 میں قائم کی گئی جس کا پورا نام ''انجمن اشاعت مطالبِ مفیدہ پنجاب'' تھا جو بعد میں ''انجمن پنجاب'' کے نام سے مشہور ہوئی۔ اس انجمن کے قیام میں ڈاکٹر لائٹنر نے نمایاں خدمات انجام دیں۔ لاہور میں جب گورنمنٹ کالج لاہور قائم ہوا تو ڈاکٹر لائٹنر اس کالج کے پہلے پرنسپل مقرر ہوئے۔ ڈاکٹر لائٹنر کو نہ صرف علوم مشرقی کے بقا اور احیاء سے دلچسپی تھی بلکہ انہیں یہ بھی احساس تھا کہ لارڈ میکالے کی حکمت عملی کے مطابق انگریزی زبان کے ذریعے علوم سکھانے کا طریقہ عملی مشکلات سے دوچار ہے۔ اس بنا پر ڈاکٹر لائٹر نے اس خطے کی تعلیمی اور معاشرتی اصلاح کا فیصلہ کیا اور ''انجمن اشاعتِ مطالبِ مفیدہ پنجاب'' کی داغ بیل ڈالی۔

1857 کی جنگ آزادی کے بعد علم و دانش کی میراث بھی پنجاب منتقل ہو گئی تھی۔ ایسے میں چند مسلمانوں نے اپنی انفرادی اور اجتماعی کوششوں سے فلاحی، تعلیمی اور علمی تنظیموں کی بنیادیں رکھنی شروع کیں جو مسلم معاشرے کو فکری اور عملی طور پر ایک نئی جہت کی طرف لے جانے میں کافی حد تک کامیاب رہیں۔ ایک طرف سرسید کی تعلیمی سرگرمیوں کا مرکز علی گڑھ تھا تو دوسری طرف پنجاب، لاہور اور مختلف شہروں میں اہل علم اور دانشوروں کی انفرادی اور اجتماعی کوششوں سے مختلف انجمنیں، تنظیمیں اور ادارے قائم ہونے شروع ہوئے۔ یہ تمام ادارے اپنی انفرادیت اور جدا حیثیت کے ساتھ خود مختار تھے۔ ان سب کا نصب العین مسلمانوں کو ایک مقصد کے تحت مجتمع کر کے نئے دور کی ضرورتوں اور تقاضوں سے

ہم آہنگ کرتے ہوئے ترقی کی راہ پر لگاناتھا۔اس سلسلے میں مقامی لوگوں کے ساتھ باہر سے آنے والے کچھ دیگر لوگوں نے بھی یہاں کے لوگوں کی علمی وادبی معاملات میں بہت خدمت کی۔

تنظیموں کا قیام

سر سید احمد خان نے بنارس سے تحریک شروع کی تو پنجاب میں بھی 'انجمن پنجاب' اور 'انجمن قصور' جیسی تنظیموں نے کام کا آغاز کیا۔انجمن قصور کی تحریک کسی ایک فرد یا گروہ کی نہیں بلکہ پنجاب کی اجتماعی تحریک تھی جس نے بڑے منظم انداز میں علمی، تعلیمی، ادبی، سماجی، سائنسی، صنعتی وفنی خدمات انجام دیں۔

ڈاکٹر گٹلیب لائٹنر جو گورنمنٹ کالج لاہور (موجودہ گورنمنٹ کالج یونیورسٹی) کے پہلے پرنسپل، اورینٹل کالج اور یونیورسٹی آف دی پنجاب، لاہور جیسے اداروں کے بانی تھے۔انھوں نے تعلیمی نظام میں اصلاحات، مشرقی علوم کے فروغ اور پنجاب میں یونیورسٹی کے قیام کے لیے ایک طویل جدوجہد کی۔ڈاکٹر لائٹنر نے 21 جنوری 1865ء کو انجمن پنجاب کی شکل میں ایک مقامی ادبی سوسائٹی کی بنیاد رکھی اور اس کے سیکرٹری کے فرائض انجام دینے لگے۔انجمن کے مقاصد میں مشرقی تہذیب کے علم کو از سر نو زندہ کرنا، عہد حاضر کے مقبول علم کی مقامی زبانوں میں ترویج، نعت اور تجارت کا فروغ، دلچسپی کے سماجی، ادبی، سائنسی اور سیاسی موضوعات پر بحث اور صوبے کے پڑھے لکھے اور بااثر طبقات کے حکومتی عہدے داروں سے رابطے قائم کرنا شامل تھا۔انجمن کے قیام کے پہلے سال میں ہی ایک پبلک لائبریری، مطالعے کا کمرہ، مقامی اور کلاسیکی زبانوں کے تراجم کے ساتھ لاہور میں ایک اورینٹل سکول بھی قائم کر لیا گیا۔ اسی طرح کی سوسائٹیز امرتسر، گورداسپور اور راولپنڈی میں بھی قائم کی گئیں۔

10 جون 1865ء کو سر ڈونلڈ میکلوڈ نے ڈاکٹر لائٹنر (ڈائریکٹر آف پبلک انسٹرکشن) کو کہا کہ وہ مقامی زبانوں میں علمی کاموں کی ترویج، ان سے استفادے اور ان زبانوں میں مغرب کی سائنسی اور علمی تحریروں کو پہنچانے کے لیے تجاویز حاصل کر کے جمع کرائیں۔ ڈاکٹر لائٹنر نے لیفٹیننٹ گورنر کی تجویز کا خیر مقدم کرتے ہوئے فوری طور پر مختلف اداروں کے سربراہوں، سرکردہ افراد اور عام لوگوں کی اگست میں ایک میٹنگ بلائی اور ان کے سامنے لاہور میں ایک اورینٹل یونیورسٹی کے قیام کی تجویز رکھی تاکہ مشرقی زبانوں اور لٹریچر کے فروغ کے لیے کام کیا جاسکے۔اس تمام عرصے

کے دوران مختلف سطحوں پر یہ جدوجہد جاری رہی اور بالآخر انجمن پنجاب کے قیام کے ساڑھے پانچ سال بعد 1870ء میں پنجاب یونیورسٹی کالج کا قیام عمل میں آیا جو کہ مکمل یونیورسٹی کی طرف ایک قدم تھا۔ 14 اکتوبر 1882ء کو پنجاب یونیورسٹی کا قیام 1857ء کی جنگ آزادی کے بعد پنجاب کے لوگوں کی طرف سے مسلسل جدوجہد کے بعد عمل میں آیا۔

1950ء میں ہی سائنسی و ثقافتی تعلیم اور تحقیق کے فروغ کے لیے دارالحکومت کراچی میں ''پاکستان ہسٹاریکل سوسائٹی'' قائم کی گئی۔ اس ادارے نے اپنے قیام کے بعد تحقیق کے شعبے میں گراں قدر خدمات سرانجام دیں۔ پاکستان ہسٹاریکل سوسائٹی کے قیام کے بعد اسی سال لاہور کے مقام پر ''مجلس ترقی ادب'' کا قیام عمل میں لایا گیا۔ ابتدائی طور پر اس مجلس کا کام ترجمہ کا تھا لیکن بعد میں اس کا دائرہ عملی و ادبی، تاریخی اور اہم شخصیات پر تحقیق کتابیں شائع کرنے تک پھیل گیا۔ اس ادارے کے ذریعے ایک مجلہ بھی نکالا گیا تاکہ لوگوں کی ذہنی اور فکری تربیت اور تحقیقی کاموں میں سہولت بھی ہو سکے۔

1950ء میں ہی لاہور میں ''بزم اقبال'' کا قیام بھی عمل میں لایا گیا جس کا مقصد شاعرِ مشرق علامہ اقبال کے فلسفہ سیاست، تعلیم، مذہب و ملت پر تحقیقی کام کو مزید فروغ دینا تھا۔ اس ادارے کے قیام کا مقصد علامہ اقبال کی شاعری اور ان کے حالات زندگی کو مد نظر رکھتے ہوئے تعلیمی سرگرمیوں میں اردو زبان کا فروغ کرنا تھا۔

1951ء میں کراچی میں ''آل پاکستان ایجوکیشنل کانفرنس'' قائم کی گئی۔ یہ کانفرنس سرسید احمد نے علی گڑھ میں قائم کی تھی۔ جناب سید الطاف علی بریلوی نے پاکستان میں اس کانفرنس کا اعادہ کیا۔ سید الطاف علی بریلوی نے سرسید کی تعلیمی فکر کو سامنے رکھتے ہوئے اس ادارے کو عملی اور تحقیقی بنانے میں کامیابی حاصل کی۔ اس کانفرنس کے تحت سرسید گرلز کالج بھی قائم کیا گیا اور یہاں ایک بہت قیمتی لائبریری بھی موجود ہے جہاں محققین اپنی علمی، تاریخی، سیاسی، ثقافتی اور ادبی تحقیق کے لیے فائدہ اٹھانے آتے ہیں۔ اس ادارے کو بے شمار علمی اور تحقیقی کتابوں کی اشاعت کا اعزاز بھی حاصل ہے۔

1952 میں جب اسلامی موضوعات پر تحقیق کی ضرورت محسوس کی گئی تو ایک ادارہ ''تحقیقات اسلامی کراچی'' میں قائم کیا گیا جس کو بعد میں اسے اسلام آباد منتقل کر دیا گیا۔ اس ادارے کا بنیادی مقصد اسلامی فکر اور تحقیق کو فروغ دینا

اور اسلام کے بنیادی اصولوں کو سائنسی انداز میں واضح کرنا ہے۔اس ادارے نے اردو، انگریزی اور عربی زبان میں قابل ذکر تحقیقی کتابیں شائع کیں اور یوں علمی اور تحقیقی رسائل بھی منظر عام پر آئے۔

پاکستان میں اردو کے علاوہ سندھی، پنجابی، پشتو اور بلوچی زبانوں میں بھی تحقیقاتی مراکز قائم ہیں۔ صوبائی زبانوں کی اعلیٰ تعلیم جامعات کی سطح پر بھی فراہم کی جارہی ہے۔ ''پاکستان سائنس فاؤنڈیشن'' (پی ایس ایف)1973ء سے ملک میں سائنس و ٹیکنالوجی کی ترقی کے لیے کوشاں ہے۔ پی ایس ایف کے قیام سے اب تک جہاں سائنس فاؤنڈیشن نے ملک میں سائنس کو مقبول بنانے میں اپنا کردار ادا کیا وہیں سائنسی تحقیق کے کلچر کو بھی فروغ دیا ہے۔

آج کل پاکستان میں پچاس سے زیادہ تحقیقی مراکز نئے موضوعات، ایجادات تخلیق و تحقیق کے لیے سرگرم ہیں۔ ان تحقیقی اداروں کے ماتحت بھی کئی ادارے مختلف شہروں اور علاقوں میں کام کر رہے ہیں۔ان کے علاوہ بعض ادارے نجی سطح پر بھی تعلیم و تحقیق میں اپنا کردار سرگرم طور پر ادا کر رہے ہیں جن میں سرسید کالج اور اردو یونیورسٹی کے تحقیق و اشاعت کے ادارے بھی شامل ہیں۔

''پاک آرگنائزیشن آف ورکرز ان ایجوکیشنل ریسرچ'' کا ادارہ بھی کافی عرصے سے تعلیمی تحقیق کے سلسلے میں مختلف کورسسز کرا رہا ہے اور تعلیمی تحقیق بھی انجام دی جارہی ہے۔ ''پنجابی ادبی بورڈ'' اور ''پنجاب انسٹیٹیوٹ آف لینگویج'' جیسے ادارے تو بنائے گئے مگر بین الاقوامی سطح پر پنجابی اور دیگر مقامی زبانوں مثلاً سندھی، پشتو اور بلوچی و براہوی کے لیے جو کام ہونا چاہیے تھا، نہیں ہو سکا اور ہم تاحال مادری زبانوں اور ان سے وابستہ ثقافت و تاریخ کو نوآبادیاتی عہد کی طرح زہر قاتل ہی سمجھتے ہیں۔

قبل تقسیم اشاعت ادب اور طباعتی ادارے

قیام پاکستان سے قبل اشاعت ادب کے حوالے سے نہایت سرگرم مراکز لاہور، حیدرآباد (دکن)، دہلی اور لکھنو تھے۔ 1947 کے بعد ہنگامہ خیز اور پر آشوب دور میں اردو مطبوعات کے حوالے سے صرف لاہور کا مرکز اپنا اشاعتی اختصاص برقرار رکھنے میں کامیاب رہ سکا۔ تقسیم ہند کے اثرات کے باعث لاہور کی اشاعت و طباعت کو بھی کٹھن حالات کا

سامنا کرنا پڑا اور ''دارالاشاعت'' جیسے قدیم و ممتاز ادارے بتدریج زوال پذیر ہوگئے۔ البتہ ''فیروز سنز'' اور ''شیخ غلام علی اینڈ سنز'' جیسے اشاعتی اداروں کی مثالیں بھی ہیں جنھوں نے مشکلات اور کساد بازاری کے باوجود طباعتِ کتب خصوصاً اشاعتِ ادب کا سلسلہ جاری رکھا۔ خاطر غزنوی لکھتے ہیں:

''قیامِ پاکستان سے پیشتر اور بعد میں کئی ادبی انجمنوں اور تنظیموں نے ملک گیر اثرات مرتب کیے۔ ''انجمن حمایت اسلام'' اور ''انجمن ترقی اردو'' نے زبان وادب کی اشاعت اور تحقیق کے میدان میں جو کام کیا ہے وہ تاریخ کے صفحات سے کبھی نہیں مٹ سکتا''۔(21)

آزادی کے بعد لاہور میں متعدد طباعتی اداروں کی نمود ہوئی جنھوں نے کئی دہائیوں تک اشاعتِ ادب کے لیے خدمات انجام دیں لیکن بعد ازاں ان کے استحکام میں خلل پڑا، ان میں سے کچھ زوال آمادہ ہوئے جبکہ کچھ نے طباعتِ کتب کا سلسلہ قائم رکھا۔ اس تناظر میں کہا جا سکتا ہے کہ طباعتی نشیب و فراز کے باوجود شہر لاہور، اشاعتِ ادب کے حوالے سے پورے جنوبی ایشیاء میں قدیم ترین اشاعتی مرکز ہے۔

انگریزوں کے دور میں جب ادبی، علمی، معلوماتی اور درسی کتابوں کے علاوہ دینی کتابوں کی طباعت و اشاعت پر ہندوؤں کی اجارہ داری تھی تو ایک مسلمان چوہدری برکت علی نے کتابی دنیا میں قدم رکھا اور درسی کتابیں چھاپنے کا ادارہ ''پنجاب بک ڈپو'' قائم کیا اور اس شعبے میں جہاں نرائن دت سہگل، عطر چند کپور وغیرہ کو برتری حاصل تھی وہاں ایک مسلمان تاجر کتب نے اپنا ادارہ قائم کیا۔ 1929ء میں انھوں نے درسی کتابوں پر ہندوؤں کی اجارہ داری ختم کرنے اور مسلمانوں کی آنے والی نسلوں کیلیے تعلیمی فلاحی ادارے قائم کرنے کی طرف پوری توجہ دی۔ اس مقصد کے حصول کیلیے انھوں نے ''مسلم تعلیمی مجلس'' کی بنیاد رکھی اور ملتان روڈ، مصری شاہ، موہنی روڈ اور اردو بازار میں ''اسلامیہ سکول'' قائم کیے۔ جہاں مسلمانوں بچوں کو اسلامی شعائر کے مطابق اعلیٰ تعلیم دی جاتی تھی اور قوم کی سچی خدمت کیلیے شخصیت سازی کی جاتی تھی۔ چودھری برکت علی کی شبانہ روز محنت سے ادبی ادارہ ''مکتبہ اردو'' قائم ہوا اور 1935ء میں رسالہ ''ادبِ لطیف'' جاری کیا جو اپنی اشاعت کی ''ڈائمنڈ جوبلی'' منا چکا ہے اور اب تک جاری ہے۔

''ادبِ لطیف'' نے اردو ادب کو سیکڑوں نئے لکھنے والے عطا کیے جن کی ادبی تربیت ادبِ لطیف کے مدیران، مرزا ادیب، عارف عبدالمتین، ممتاز مفتی، قتیل شفائی، انتظار حسین، قاسم محمود، ناصر زیدی، اظہر جاوید اور شاہد بخاری نے کی۔ مکتبہ اردو کی نگرانی افتخار چودھری اور پنجاب بک ڈپو کی نگہداشت خالد چودھری کرتے ہیں۔ ان کے بھتیجے نذیر احمد نے ''نیا ادارہ'' اور بشیر احمد نے ''مکتبہ میری لائبریری'' قائم کیا۔ حنیف رامے نے ''مکتبہ البیان'' قائم کیا اور پنجاب کے وزیر اعلیٰ کے عہدے تک پہنچے۔ ریاض احمد چودھری نے ''مکتبہ قوسین'' بنایا۔

اداروں کا کردار

زبان کوئی بھی ہو وہ مختلف اداروں کے درمیان رابطے کے علاوہ اس زبان کے بولنے والوں کی تاریخ، تمدن، معاشرت، رہن سہن وغیرہ کو محفوظ کرنے کا ذریعہ بھی ہوتی ہے۔ زبان و ادب کے اداروں کا تعلق اور رابطہ محدود نہیں ہوتا بلکہ اداروں کے ذریعے دیگر معاشروں اور تہذیبوں سے بھی روابط بڑھنے کی وجہ سے ان زبانوں میں موجود علوم اور ان کے تجربات سے بھی استفادہ کیا جاتا ہے۔ اس طرح سے دوسرے معاشروں سے تبادلہ معلومات اور خیالات کے ذریعے زبانیں اور معاشرے ترقی کی منازل طے کرتے چلے جاتے ہیں۔

ہمارے ہاں بھی زبان و ادب کے ادارے ایسے مجموعی مقاصد کے تحت وجود میں آئے جن کے ذریعے سے زبان کی ترویج و اشاعت کے ساتھ اس کے ماضی کو بھی محفوظ کرنے کی بامقصد کوششیں کی گئیں۔ ایسے تمام اداروں میں کتاب ایک قدر مشترک ضرور رہی ہے۔ زبان و ادب کے اداروں اور کتابوں کا چولی دامن کا ساتھ ہے۔ اگر کتاب کے سلسلے میں ادارے کے کردار کو منفی کر دیا جائے تو ایک طرف خود اداروں کے وجود کو خطرہ پیدا ہو جائے گا اور دوسری طرف کتاب کے بغیر انسانی ترقی اور بقا محال ہو جائے گی۔

> ''کتاب کی افادیت روز اول سے مسلم ہے۔ تاریخ بتاتی ہے کہ جس قوم نے علم و تحقیق کا دامن چھوڑ دیا، وہ پستی میں گر گئی۔ مسلم امہ کا زوال اس کی واضح مثال ہے۔ ساتویں صدی سے تیرہویں صدی تک بغداد علم و ادب کو گہوارہ رہا۔ یہاں کے کتب خانے پوری دنیا کی علمی پیاس بجھانے کا ذریعہ تھے اور جہاں

سے اکتساب فیض کے لیے پورے یورپ کے عیسائی سر جھکا کر آنے پر فخر محسوس کرتے مگر رفتہ رفتہ علم

اور کتاب سے دوری مسلمانوں کو رسوائی کی طرف لے گئی''۔(22)

''آج دنیا کے اٹھائیس ممالک ایسے ہیں جہاں سب سے زیادہ کتابیں فروخت ہوتی ہیں۔ مگر ان میں سے

ایک بھی مسلمان ملک نہیں ہے''۔(23)

معاشرے کے فکری خلا اور ضرورتوں کو پورا کرنے کے لیے کتاب کی نشر و اشاعت از حد ضروری ہے اور یہ ضرورت اگر کسی حد تک پوری ہو رہی ہے تو وہ تحقیقی و لسانی اداروں کی مرہون منت ہے۔ زبان کے تحقیقی اداروں کی ضرورت اور قیام اس زبان کی ترقی اور ترویج کے لیے بنیادی جزو کی حیثیت رکھتے ہیں۔ ہم اگر اپنے تحقیقی اور اشاعتی اداروں کا مغرب کے اداروں سے مقابلہ کریں تو یہ احساس ابھر کر سامنے آتا ہے کہ ہمارے اور ان کے درمیان زمینی فاصلے گو کم ہوتے جا رہے ہیں مگر معیاری طور پر ہم ان سے صدیوں پیچھے ہیں کیونکہ وہاں پر ان اداروں کو جدید تر ضروریات کو مد نظر رکھتے ہوئے نہایت ماہرانہ انداز میں چلایا جاتا ہے۔

اس بات سے شاید ہی کوئی ذی شعور شخص اختلاف کر سکتا ہے کہ زبان نسلوں میں ہم کلامی کا ذریعہ ہونے کے ساتھ قوموں اور افراد کے درمیان اتحاد، رابطے اور ترقی کے لیے لازم و ملزوم کی حیثیت رکھتی ہے۔ دوسری طرف یہ پہلو بھی مد نظر رہنا چاہیے کہ قوموں کے درمیان زبان کی بنیاد پر ہی اختلافات پیدا ہوتے رہے ہیں۔ موجودہ عہد میں مختلف تہذیبوں کے آپس میں تصادم کی وجہ سے جغرافیائی حد بندیاں تبدیل ہو رہی ہیں اور اس کے پس منظر میں زبان کے کردار کو نظر انداز نہیں کیا جا سکتا۔اس کی مثال یوں دی جا سکتی ہے کہ تمام عرب ممالک کو ایک زبان کے رشتے نے آپس میں باندھ رکھا ہے ورنہ یہودی بھی اسی نسل سے تعلق رکھنے والے لوگ ہیں۔

''قوموں کی طرح لسانیات بھی پوری بنی نوع انسان کو ٹکڑوں میں بانٹتی ہے لیکن لسانی گروہ بہت بڑے

ہیں اور اکثر نے کئی ملکی سرحدوں کو مسمار کیا ہے''۔(24)

مختلف قومیتوں، نسلوں اور جغرافیائی فرق کے حامل افراد میں باہمی مفاد کے حصول اور اتحاد میں زبان نہایت جاندار طور پر کلیدی کردار ادا کرتی ہے کیونکہ زبان اجنبیت اور علاقائیت کے احساسات کو رد کرتے ہوئے قرب اور اپنائیت کے احساس کو جنم دیتی ہے۔ یوں افراد کے درمیان نفسیاتی ربط اور قربت پیدا ہوتی ہے۔ قربت اور اپنائیت کا احساس افراد میں باہمی محبت اور تکریم کو فروغ دیتا ہے اور یوں بڑھتے بڑھتے یہ احساس ایک قوم کی صورت میں نمودار ہوتا ہے۔

ادارے انسانی زندگی میں متحرک اور فعال کردار ادا کرتے ہیں۔ تحقیق کے سلسلے میں تعلیمی ادارے نہایت نمایاں کردار ادا کرتے ہیں اور قیام پاکستان کے وقت پاکستان کے حصے میں چند ہی تعلیمی ادارے آئے تھے۔ حکومت کے استحکام اور وقت گزرنے کے ساتھ ساتھ اعلی تعلیمی، فنی، سائنسی اور تحقیقی اداروں میں اضافہ ہوتا گیا۔ انسانی شخصیت پر ماں کی آغوش، گھر کا ماحول، خاندان، گلی، محلہ، معاشرہ، عبادت گاہیں اور درس گاہیں اداروں کی طرح ہی نہایت گہرے اثرات مرتب کرتی ہیں۔ زبان وادب کے ادارے بھی معاشرے میں موجود علمی ذخیرے کی اشاعت و ترویج کے ذریعے اس زبان کے علمی اور تہذیبی سرمائے میں اضافے کا باعث ہوتے ہیں۔ ادب تخلیقی ہو یا تحقیقی ہر دو صورت میں زبان کی ترقی کا باعث ہوتا ہے۔ اسی کے ذریعے کسی زبان کے بولنے والوں کے مزاج، ذوق، ذہنی اور مذہبی رجحانات کا پتا چلتا ہے۔ اس کے بعد تنقید کا درجہ آتا ہے جو کہ ادب کو نکھارنے کا اہم راستہ ہے کیونکہ تنقید کے ذریعے سے ہی کسی بھی صنف کے محاسن اور نقائص کی آگہی ہوتی ہے۔

قیام پاکستان کے بعد ادب سے محبت کرنے والی والی ہستیوں نے مختلف اداروں، انجمنوں اور اکیڈمیوں وغیرہ کے ذریعے ادب اور زبانوں کی خدمت کا تہیہ کیا اور پے درپے ایسے ادارے قائم ہوئے جو کثیر الجہتی انداز میں زبان وادب کی خدمت اور ثقافت کی ترویج کا عزم لیے ہوئے تھے۔ ان میں اکثریت ان اداروں کی تھی جو سرزمین لاہور پر وجود میں آئے۔ لاہور برصغیر کے قدیم شہروں ہڑپہ اور موہنجوداڑو کی طرح ہی قدیم شہر ہے اور یہ ہمیشہ آباد رہا ہے۔ یہ شہر علم و حکمت، تہذیب و ثقافت، تاریخ وادب، مصوری، خطاطی گویا ہر طرح کے علوم و فنون کا مرکز رہا ہے۔

شورش کاشمیری نے لاہور کے بارے میں درست طور پر کہا ہے؛

''زمانہ کے الٹ پھیر اور اتار چڑھاو کے زیر نظر یہ بات وثوق سے کہی جا سکتی ہے کہ لاہور کا کردار وقت کے مفہوم سے ہمیشہ آشنا رہا ہے اور شاید ہی کوئی ممتاز و منفرد دور ایسا گزرا ہو گا جس میں لاہور نے حصہ نہ لیا ہو''۔(25)

اے حمید کہتے ہیں؛

''لاہور کا نام آتے ہی اسرار کا ایک باب کھل جاتا ہے۔خود اس نام میں طلسم ہے۔لاہور ایک شہر نہیں ایک کیفیت ہے''۔(26)

لاہور کے بارے میں کچھ کتابوں میں یوں تحریر کیا گیا ہے؛

''عام گل ایہہ مشہور ہے کہ مہاراجہ رام چندر اوتار دے پُتر 'لو' نے ایہہ شہر وسایا تے ایس داناں 'لوپور' رکھیا''۔(27)

نور احمد چشتی نے لکھا ہے؛

''رام چندر دے دو پُتر اِک کشو تے دُوجا لوہو سی۔'لو ہو' نے شہر ''لہور'' وَسایا تے 'کشو' نے ''قصور'' دے ناں تو اِک پر سدھ شہر وسایا تے اوہ رام چندر دے مگروں اجو دِھیا دِی گدی اُتے بیٹھیا''۔ (28)

بھولا ناتھ وارث یوں رقمطراز ہیں؛

''دُنیادے شہراں وِچوں لہور اِک پُرانا شہر گِنیا جاندا اے۔ پر ایس شہر دے مُڈھ دِی تاریخ ہنیرے وِچ لُکی ہوئی اے۔ کہندے ہن جو رام چندر دے دو پُتر سن 'لو' تے 'کشو' 'لو' نے 'لوپور' تے 'کشو' نے 'کشور' یاں 'قصور' وسایا''۔(29)

تاریخ لہور میں جسٹس سید لطیف نے یوں ذکر کیا ہے؛

''ہندو رِیتیاں' اِک پُرانی رِیتی دے حساب وِچ 'لوہاوَر' جاں 'لاہور' (لہور) دِی نینہہ 'لوِ' جاں 'لوہ' نے دَھری سی۔ جیہڑا کہ پرسدھ داستان رامائن دے ہیرو عظیم راما دے دو پُتراں چوں اِک سی' آپنے بھرا (لوہ) وانگوں دُوجے پُتر 'کشو' نے 'لہور' دے نال اِک دُوجے شہر 'قصور' جاں 'قَص اَور' دِی نینہہ رکھی۔ ایس ناں دِیاں جڑاں ہندوواں دے اُچے شان والے ویلے' وَڈیاں شکتیاں والے سُورماواں تے مُڈھ قدیم وِچ آپنے وڈکیاں دے نال ساک رکھن والیاں دِی رہتل وِچ لبھدیاں نیں۔ کشمیر تے راجپوتاں ناں دِی وار وِچ لہور داناں ہندوراج دِی شکل وِچ لبھدا اے''۔(30)

میرا پیارا شہر لہور میں یوں ملتا ہے؛

''اِک پرسدھ رِیتی توں ایہہ گل دِسدی ہے کہ لاہور جاں لوہ۔ آور (سنسکرت شبد آورد جاں قلعہ) دِی نینہہ لو جاں لوہ نے رکھی جیہڑا کہ عظیم راما دے پُتراں چوں اِک سی''۔(31)

سید عبداللطیف نے تاریخ لہور میں لاہور کے نام مختلف یوں دیے ہیں؛

''اوہناں ناواں دے مگر دِی گل نُوں وِی نال رلا کے دَسیا جارہیا اے۔اِنج ایس مُدے اُتے ہوون والی چَرچا چنگے ڈھنگ نال سمجھی جاسکدی اے''۔

۱۔لہور نُوں وساون والے داناں ''لوہ'' سی تے ایہہ ''لوہ'' رام چندر جی دا پُتر سی۔
۲۔وشوابھاگا وِچ ایس داناں ''لوپور'' وِی دَسیا گیا اے۔
۳۔راجپوتاں دِی وار وِچ ایس داناں ''لوح کوٹ'' وِی لِکھیا گیا اے۔
۴۔فتوح البلدان دے لکھاری نے ایس نُوں ''الہاور'' وِی آکھیا اے۔
۵۔نزہت المشتاق فی افتخار الافاق (لکھاری الادریسی) نے ایس نُوں ''لوہاور'' دے ناں توں سَدّیا ہے۔
۶۔البیرونی نے ایس نُوں ''لہاور'' لِکھیا اے تے ایس نُوں ایلیٹ نے وَکھو وَکھ انگاں نال پڑھیا اے جیویں کہ 'لوہاوور' 'لہاوور' 'لوہارو' تے 'لہور'۔
۷۔امیر خسرو نے لاہور (لہور) نُوں ''لہانور'' آکھیا۔ایس وِچ اوہناں دا اِک شعر اِنج اے:

از حد سامانیہ تالہانور ہیچ عمارت نیست مگر در قصور

۸۔سیّد عبدالطیف دا ایہہ وِی آکھنا اے کہ تھورٹن نے لھانور' لھا نگر نُوں لاہور (لہور) دِے وِگڑی شکل دسیا اے۔
۹۔جامع التواریخ وِچ امیر الدین نے ''لاہور'' اِی لِکھیا اے۔
۱۰۔پٹولومی نے ایس نُوں 'لوبوکلا' لِکھیا اے ہوسکدا اے کہ 'لوبو' توں لوا تے لوہ وِی ہوسکدا اے۔ (32)

بھولا ناتھ وارث نے لاہور کے مختلف پرانے نام بھی دیے ہیں؛

''کہانیاں دے نال نال لہور شہر دے بہت ناں وی دسے جاندے ہن۔ ٹالمی دے جغرافیے وچ 'لولوک' تے 'لوکلا' آوندا اے۔ جس نوں کئی وددوان لہور شہر سمجھدے ہن۔ فیر 'لوہکوٹ'، 'لہاور'

تے 'لوپور' وی ملدا اے۔ مسلمان اتہاسک (تاریخ دانوں) ایس نوں 'لوہار'، 'لوہر' تے 'راہوار' وی لکھدے ہن''۔(33)

بھولا ناتھ وارث آگے لکھتے ہیں؛

مسلمان مؤرخ لکھدے ہن جو محمود نے لہور دے راجے اتے فتح پا کے لہور شہر وسایا۔ شہر دی نیہہ رکھن دی تاریخ خلاصہ التواریخ دا کرتا لکھدا اے۔

محمود بنا کرد چو لاہر لہانور، در ہند یکے کعبہ مقصود بنا کرد

اندیشہ چو کردم پے تاریخ بنائیش فی الفور خرد گفت کہ محمود بنا کرد

''کہ محمود بنا کرد'' توابجد دے حساب نال 1004 تاریخ نکلدی ہے''۔(34)

بھولا ناتھ وارث اس وقت کے لاہور کے حالات کے بارے میں لکھتے ہیں؛

''شہر لہور دا حال اگے لکھن توں پہلاں سانوں ایس گل دی لوڑ ہے جو مسلماناں دے ایس ملک وچ آون اتے مسلمانی تہذیب نال وٹا سٹا ہون توں پہلاں پنجاب دیس دا کیہ حال سی، کپڑے، لیڑے کس طراں دے پاوندے سن، گھر کس طراں دے بناوندے سن، ویہار کیہ سی، اک تھاں تو دوجی تھاں کس طراں جاندے سن، راج کس طراں دا سی اتے دین دھرم اوہناں دا کیہ سی؟'' (35)

پنجابی زبان کے بارے میں انھوں نے تحریر کیا ہے کہ ؛

''بابا فرید، داتا گنج بخش، بہاوالدین ذکریا ورگے بزرگاں نے پاکپتن، لہور، ملتان، جالندھر، سرہند وچ تکیے بنا کے مسلمانی دھرم دا پرچار شروع کیتا۔ پنجاب دے لوک فارسی تے عربی نہیں سن جاندے۔

ایس کر کے اوہناں بزرگاں پہلے آپ پنجاب دی بولی سکھی تے پنجابی بولی وچ اسلام دی شکشا دینی شروع کیتی۔ مسلمان دھرم دیاں کتاباں پنجابی وچ ترجمہ کیتیاں۔ اوہناں نوں فارسی حرفاں وچ لکھیا۔ اسلام دین دے ٹوٹکے تے موٹیاں موٹیاں گلاں لکھ کے نکیاں نکیاں آسان کتاباں بنا کے پنجابی مسلماناں دے ہتھ پھڑائیاں۔ ایس دا نتیجہ ایہہ ہویا جو تھوڑے چر وچ چار بنیوں اللہ اکبر اللہ اکبر دیاں گونجاں اٹھ پئیاں۔ پنڈاں دے پنڈ مسلمان ہو گئے۔ نالو نال لوکاں دے دل پرچون دی خاطر لیلیٰ مجنوں، شیریں فرہاد، امیر حمزہ دے قصے فارسی عربی وچوں لے کے پنجابی وچ لکھ سٹے۔ غزلاں بیت، رباعیاں وی پنجابی وچ بنیاں۔ تشبیہ، استعارہ، ردیف، قافیہ، بحر دا پنجابی کوتا وچ رواج ہوا۔ مدا کیہ جو فارسی عربی دا رنگ چاڑھ کے پنجابی اچیاں اچیاں علمی اڈاریاں لین لگ پئی۔'' (36)

کوئی بھی ادبی، تاریخی یا تنقیدی تصنیف کسی بھی معاشرے، قوم اور افراد کے مزاج اور ان میں موجود سیاسی، سماجی، معاشرتی اور مذہبی رجحانات کی نشاندہی بھی کرتی ہے۔ لاہور اور پنجابی زبان کے بارے میں بیان کرتے ہوئے ایک جگہ پر وہ مسلمانوں کے مذہبی رجحان کا جن الفاظ میں تذکرہ کیا ہے، ان کو ضمناً بیان کیا جا رہا ہے۔ وہ یوں رقمطراز ہیں؛

''دیوی دیوتے مندراں وچوں تاں نکلے پر نکل کے مسلمانی قبراں تے مقبریاں وچ جا وڑے۔ مسلمانی مورتی پوجا نوں کفر کہندے سن۔ قبراں تے مقبریاں اگے سجدے تے پیراں فقیراں نوں سلاماں کرن لگ پئے۔ برہمن، راجپوتاں دیاں تھاواں سید تے پٹھاناں نے ملیاں۔ رب دے سکے بن کے سبھ کولوں اچے بن بیٹھے۔ کئی ہندوانیاں رسماں جو مذہب دا انگ منیاں جاندیاں سن، مسلماناں نے لے لیئاں۔'' (37)

تقسیم ہند کے بعد قائم ہونے والے تعلیمی و تحقیقی ادارے

تقسیم ہند کے وقت چونکہ پاکستان میں قابل ذکر تعلیمی اور ادبی ادارے موجود نہیں تھے۔اس لیے قیام پاکستان کے بعد ان اداروں کی ضرورت اور اہمیت کے پیش نظر حکومت اور مختلف انجمنوں کے تحت علمی، ادبی اور اشاعتی اداروں کا وجود عمل میں لایا گیا جن میں سے چند اداروں کا ذکر ذیل کیا جارہا ہے۔

لاہور کا 'اورینٹل کالج، تقسیم ہندوستان کے نتیجے میں پاکستان کے حصے میں آیا۔یہ ادارہ 1872ء میں قائم کیا گیا تھا۔اس کی بنیاد 'انجمن پنجاب' نے رکھی تھی' رفتہ رفتہ یہ ایک اعلی تحقیق کا بلند پایہ ادارہ بن گیا۔آج یہ پاکستان کا نمایاں تحقیقی ادارہ ہے۔اس ادارے کی بدولت پاکستان میں تحقیقی سرگرمیوں کو کافی فروغ حاصل ہوا ہے۔اورینٹل کالج کے بعد 1948 میں کراچی میں بابائے اردو مولوی عبدالحق نے 'انجمن ترقی اردو پاکستان' کا ادارہ قائم کیا۔اس ادارے نے ملک میں علم، اشاعت اور اعلی تحقیقی سرگرمیوں کے فروغ کو چار چاند لگادیئے۔قیام پاکستان کے وقت ملک تعلیم و تحقیق کے شعبے میں بہت پیچھے تھا اور ملک میں تعلیمی فروغ کی سخت ضرورت تھی۔اس اہم مسئلے پر غور کرتے ہوئے 1950ء میں لاہور میں 'ادارہ ثقافت اسلامیہ' قائم کیا گیا جس کا مقصد مسلمانوں کے روشن ماضی کو اجاگر کرنا اور تعلیم کو فروغ دینا تھا۔ملک کے مستقبل کی بنیادیں جدید سائنسی تحقیق پر استوار کرنے اور اسلامی ثقافت کو زندہ جاوید کرنے کے لیے اس ادارے نے نہایت خوش اسلوبی سے اپنے فرائض سرانجام دیے۔اس ادارے کے ذریعے ہر موضوع پر تحقیقی کا کام ہوا اور بہت سی قیمتی کتابیں منظر عام پر آئیں۔

مختلف شہروں میں قائم ہونے والے علمی وادبی ادارے

اسلام آباد

1۔ ادارہ تحقیقات اسلامی

2۔ ادارہ ثقافت اسلامی

3۔ اسلامی نظریاتی کونسل

4۔ اکادمی ادبیات پاکستان

5۔ انسٹیٹیوٹ آف پالیسی سٹڈیز

6۔ علامہ اقبال اوپن یونیورسٹی

7۔ قومی ادارہ برائے تاریخی و ثقافتی تحقیق

8۔ قومی طبّی کونسل

9۔ مرکز تحقیقات فارسی

10۔ مقتدرہ قومی زبان

11۔ نیشنل بک کونسل پاکستان

لاہور

1۔ ادارہ تالیف و ترجمہ جامعہ پنجاب، پنجاب یونیورسٹی لاہور

2۔ ادارہ تعلیم و تحقیق جامعہ پنجاب، نیو کیمپس، لاہور

3۔ ادارہ ثقافت اسلامیہ، کلب روڈ لاہور

4۔ ادارہ معارف اسلامی، ملتان روڈ، لاہور

5۔ ادارہ تعلیمی تحقیق، اچھرہ، لاہور

6۔ اردو دائرہ معارف اسلامیہ، پنجاب یونیورسٹی، لاہور

7۔ اردو سائنس بورڈ 229 اپر مال، لاہور

8۔ اقبال اکادمی پاکستان، میکلوڈ روڈ، لاہور

9۔ انجمن حمایت اسلام، ریلوے روڈ، لاہور

10۔ بزم اقبال، کلب روڈ، لاہور

11۔ پنجاب آرٹس کونسل، ڈیورنڈ روڈ، لاہور

12۔ پنجابی ادبی اکیڈمی، ماڈل ٹاؤن، لاہور

13۔ ریسرچ سوسائٹی آف پاکستان، کلب روڈ، لاہور

14۔ علما اکیڈمی، لاہور

15۔ مجلس ترقی ادب، کلب روڈ، لاہور

16۔ مغربی پاکستان اردو اکیڈمی، لوئر مال روڈ، لاہور

17۔ پاکستان پنجابی ادبی بورڈ، لاہور

18۔ پنجابی ادبی سنگت، لاہور

19۔ مجلس شاہ حسین، لاہور

20۔ لہراں بورڈ

قصور

1۔ انجمن مفید عام، قصور

2۔ پنجابی کھوج گڑھ

شکر گڑھ

1۔ تنظیم ماں بولی، شکر گڑھ

ساہیوال

1۔ لوک لہر، ساہیوال

بہاولپور

1۔ اردو اکیڈمی بہاولپور

پشاور

1۔ اباسین آرٹس کونسل
2۔ ادارہ مصنفین پاکستان
3۔ پشتو اکیڈمی پشاور
4۔ گندھارا ہندکو بورڈ

حیدر آباد

1۔ ادارہ سندھیات، سندھ یونیورسٹی، جام شورو
2۔ سندھی ادبی بورڈ
3۔ شاہ ولی اللہ اکیڈمی

فیصل آباد

1۔ زرعی یونیورسٹی، فیصل آباد

کراچی

1۔ آل پاکستان ایجوکیشن کانفرنس

2۔ انجمن ترقی اردو، پاکستان

3۔ ادارہ یادگار غالب، ناظم آباد، کراچی

4۔ اردو لغت بورڈ، گلشن اقبال، کراچی

5۔ بہادر یار جنگ اکادمی

6۔ پاکستان ہسٹاریکل سوسائٹی

7۔ سائنٹفیک سوسائٹی، پاکستان

8۔ شعبہ تصنیف وتالیف وترجمہ، جامعہ کراچی

9۔ قائداعظم اکادمی

10۔ وفاقی گورنمنٹ اردو سائنس کالج

11۔ وفاقی گورنمنٹ اردو کالج

12۔ ہمدرد فاونڈیشن، ہمدرد مرکز، کراچی

13۔ سندھی ادبی بورڈ، کراچی

14۔ بلوچ ایجوکیشنل سوسائٹی، کراچی

کوئٹہ

1۔ بلوچی اکیڈمی، پٹیل روڈ، کوئٹہ

2۔ بلوچستان رائٹرز ایسوسی ایشن کوئٹہ

3۔ مکتبہ دُرخانی، ڈھاڈر

ان علمی اداروں کے علاوہ بھی ملک بھر میں دینی اور دنیاوی علوم کے بہت سے معروف اور غیر معروف ادارے تصنیف وتالیف میں مصروف ہیں۔ ان میں سے بعض ایسے ہیں جو اردو، انگریزی دونوں زبانوں کے علاوہ مقامی زبانوں میں بھی کتابیں شائع کرتے ہیں۔ مثلاً ''مرکزی اقبال اکیڈمی''، ''ادارہ ثقافت اسلامیہ لاہور''، ''ہسٹاریکل سوسائٹی آف

پاکستان کراچی''، ''ادارہ فروغ سائنس پشاور''، ''نیشنل بک فاؤنڈیشن''، ''صریر خامہ''، ''پنجابی یونین''، ''سانجھ''، ''سجار''، ''لالہ اکیڈمی'' وغیرہ وغیرہ۔

سرکاری ادارے

زبان کی ترویج وترقی کے لیے سرکاری یا حکومتِ وقت کی سرپرستی نہایت اہم کردار ادا کرتی ہے۔ پاکستان کے وجود میں آنے کے بعد ملک کے لکھنے والے طبقے کی سرکاری سرپرستی کی ضرورت اس وقت محسوس ہوئی جب ترقی پسند ادب اور ترقی پسند مصنفین ملک کے گوشے گوشے میں اثر انداز ہونے لگے۔ اس وقت کے صدر پاکستان کے وزیر اور مشیر خاص قدرت اللہ شہاب کی ایما پر یہاں ''انجمن ترقی پسند مصنفین'' کی سرگرمیوں کا توڑ نکالنے کے لیے ''انجمن مصنفین'' پاکستان بنائی گئی جسے انگریزی زبان میں ''پاکستان رائٹرز گلڈ'' کا نام دیا گیا۔ اس کے علاوہ کچھ دیگر اداروں کا تذکرہ ذیل میں کیا جارہا ہے۔

پاکستان رائٹرز گلڈ

جب پاکستان اور ہمسایہ ملک بھارت میں ترقی پسند ادب کی تحریک زوروں پر تھی، ادب کے حوالے سے غیر ملکی نظریات اور اس حوالے سے لکھنے والوں میں اتفاقِ رائے پیدا ہونا اور انجمن ترقی پسند مصنفین کا قیام اور اس کی سرگرمیوں نے حکومت وقت کے دانش مند طبقے کو سوچنے پر مجبور کر دیا اور جنرل ایوب خان کی کابینہ کے رکن ممتاز دانشور قدرت اللہ شہاب نے انجمن ترقی پسند مصنفین کے مقابلے میں انجمن مصنفین پاکستان کی بنیاد ڈالی اور انگریزی میں اسے پاکستان رائٹرز گلڈ کے نام دیا گیا۔ اس تنظیم کو جزوی طور پر سرکاری سرپرستی حاصل ہونے کے علاوہ مشہور زمانہ قلم کاروں کی تائید وحمایت حاصل رہی۔ پاکستان رائٹرز گلڈ کے بانی اراکین میں قدرت اللہ شہاب کے علاوہ قرۃ العین حیدر، جمیل الدین عالی، غلام عباس، ابن الحسن، ابن سعید، اور عباس احمد عباسی جیسی شخصیات شامل تھیں۔ 29، 30، اور 31 جنوری 1959 کو کراچی میں کل پاکستان رائٹرز کنونشن میں مغربی اور مشرقی پاکستان سے 212 ادیب شامل ہوئے اور یوں ملک گیر سطح پر اس تنظیم کی بنیاد ڈال دی گئی۔

اکادمی ادبیات پاکستان

'اکادمی ادبیات پاکستان' یا اکیڈمی آف لیٹرز حکومت پاکستان کی سرپرستی میں کام کرنے والا قومی سطح کا علمی اور ادبی ادارہ ہے جو ملک بھر کے شاعروں اور ادیبوں کی فلاح و بہبود اور ان کی حوصلہ افزائی کے لیے 1976 میں قائم ہوا۔ ممتاز شاعر احمد فراز اکادمی ادبیات پاکستان کے پہلے پراجیکٹ ڈائریکٹر تھے۔ یہ ادارہ حکومت پاکستان کی سرپرستی میں ملک کی جملہ علاقائی زبانوں کے لکھنے والوں کی حوصلہ افزائی کے علاوہ ان کی مالی امداد بھی کرتا ہے۔ اکادمی ادبیات پاکستان ہر سال پاکستانی زبانوں کی بہترین ادبی اور تنقیدی کتب کو ایوارڈز دیتا ہے۔ پاکستان کے تمام صوبوں میں بھی اکادمی ادبیات پاکستان کے ذیلی دفتر قائم ہیں جو اس صوبے کے ادیبوں اور شاعروں کی علمی اور ادبی سرگرمیوں پر گہری نظر رکھتے ہیں۔

لوک ورثہ

پاکستان کی علاقائی زبانوں اور فنون لطیفہ کو تحفظ فراہم کرنے کے لیے بین الاقوامی تنظیموں کے علاوہ سرکاری سرپستی میں کام کرنے والے قومی لوک ورثہ ادارے نے بھی علاقائی ہنرکاروں، لوک ادب، موسیقی، رقص اور رسوم و رواج کو قابل قدر تحفظ فراہم کیا ہے۔

اباسین آرٹس کونسل پشاور

اباسین آرٹس کونسل صوبہ خیبر پختونخوا کے دارالحکومت پشاور میں یہاں کے ادیبوں شاعروں اور فنون لطیفہ کے دیگر شعبوں سے منسلک افراد کے فن پاروں کی ترویج و ترقی کے لیے ایک نہایت قدیم ادارہ ہے۔ یہ ادارہ مسرت حسین زبیری کمشنر پشاور ڈویژن کی صدارت میں سال 56-1955 کے دوران قائم ہوا۔ شروع میں اس ادارے کا نام اباسین آرٹس سوسائٹی تھا جب کہ سال 1960 کے دوران اس کا نام بدل کر اباسین آرٹس کونسل رکھ دیا گیا۔

انٹرنیٹ پر علمی و ادبی سرگرمیاں

اکیسویں صدی میں کمپیوٹر اور انٹرنیٹ کی وجہ سے دنیا ایک گاؤں کی شکل اختیار کرتی جا رہی ہے جس کے ذریعے کسی بھی ضمن میں کسی بھی عنوان کے بارے میں نہایت تیز رفتار انداز سے معلومات حاصل کی جا سکتی ہیں۔ اسی وجہ سے تقریباً تمام ادارے اپنی اپنی ویب سائٹس (websites) کے ذریعے اپنے ادارے کے بارے میں معلومات دنیا بھر میں پہنچا رہے ہیں اور اس ذریعے سے تمام علوم تک رسائی بھی ممکن بنا دی گئی ہے۔ اسی لیے تقریباً تمام ادبی و اشاعتی اداروں نے بھی اپنی اپنی ویب سائٹس بنا لی ہیں۔ ان کے علاوہ انٹرنیٹ پر پنجابی زبان کی چند ویب سائٹس میں وِچار ڈاٹ کام، اپنا ڈاٹ کام، فوک پنجابی ڈاٹ کام، پنجابکس ڈاٹ کام وغیرہ شامل ہیں جن کے ذریعے پنجابی زبان میں ہونے والی ترقی اور شائع شدہ کتابوں کے علاوہ نئی کتابوں کے بارے میں بھی معلومات موجود ہیں۔

حوالے باب اول

1۔سید محمد لطیف،تاریخ پنجاب،لاہور، تخلیقات،1994،ص 71۔

2۔سورۃ روم آیت نمبر22۔

3۔سورۃ ابراھیم،آیت نمبر4۔

4۔ دکن میں اردو، طبع پنجم،لاہور،اردو مرکز،1960،ص10۔

5۔ www.cia.gov/library/publications/the-world factbook dt. 17-8-2014

6۔ادب راہیں پنجاب دی تاریخ، طبع اول،لاہور، پاکستان پنجابی ادبی بورڈ،2014،ص48۔

7۔حمید اللہ ہاشمی، مختصر تاریخ زبان وادب،اسلام آباد، مقتدرہ قومی زبان،2012،ص22۔

8۔محمد آصف خاں،ہور نک سک،لاہور، پاکستان پنجابی ادبی بورڈ، 2000،ص45،46۔

9۔عابد عمیق،پنجاب وچ زبان دا مسئلہ،ماہانہ پنچم puncham.com۔

10۔ایضاً

11۔www.learnpunjabi.org/intro1.asp۔

12۔ایضاً

13۔تاریخ شہر لہور، طبع دوم،لاہور، گراف،1998،ص187۔

14۔ایضاً،ص186۔

15۔ ایضاً،ص185۔

16۔ ایضاً،ص187۔

17۔ تحریک نفاذ اردو،ص238۔

18۔ تحریک نفاذ اردو،ص239۔

19۔ غلام علی الانہ،ڈاکٹر،زبان اور ثقافت،اسلام آباد،علامہ اقبال اوپن یونیورسٹی،1987،ص13۔

20۔اسلم انصاری،ڈاکٹر،اردو زبان اور عصری آگہی،جلد8،2011،ص 3۔

21۔ ادبی انجمنیں اور صوبہ سرحد، گل بکف،اسلام آباد، بزم علم و فن،1994،ص48۔

22۔اردو ڈائجسٹ، مدیر الطاف حسن قریشی، مارچ 2012، ص 13۔

23۔ایضاً

24۔ گیان چند جین، ڈاکٹر، لسانی جائزے، مغربی پاکستان اردو اکیڈمی لاہور، 2005، ص 15۔

25۔ سید لطیف، جسٹس، تاریخ لہور۔

26۔بیپسی سدھوا، میرا پیارا شہر لہور، ص الف۔

27۔لیفٹیننٹ کرنل، خواجہ عبدالرشید، نقوش، لہور نمبر ص 17۔

28۔تحقیقاتِ چشتی، ص 57۔

29۔تاریخ شہر لہور، طبع دوم، لاہور، گراف، 1998، ص 15۔

30۔تاریخ لہور، ص 1۔

31۔بیپسی سدھوا، میرا پیارا شہر لہور، ص الف۔

32۔لیفٹیننٹ کرنل خواجہ عبدالرشید، نقوش، لہور نمبر، ص 17۔

33۔تاریخ شہر لہور، ص 15۔

34۔ایضاً، ص 16۔

35۔ایضاً، ص 27۔

36۔ایضاً، ص 104۔

37۔ایضاً، ص 109۔

باب دوم

پاکستان پنجابی ادبی بورڈ کا قیام، مقاصد اور خدمات

ادارہ

کسی ادارے کی تعریف اس طرح سے کی جا سکتی ہے کہ ایسا حلقہ جو مخصوص ہدایات کے تحت کسی مخصوص فن، ہنر، فضیلت یا علمی ضرورت کے سلسلے میں افراد کو ایسے مواقع مہیا کرے جن کے ذریعے وہ زندگی کے مخصوص شعبے میں اپنی صلاحیتوں کا اظہار کر سکیں اور اس کی ترویج اس ادارے کے ذریعے سے منظم طور پر ہو۔ ایسے مقصد کے لیے وجود پانے والے حلقے کو ادارہ، اکیڈمی، بورڈ اور اس قسم کے دیگر نام دیے جا سکتے ہیں۔ ادارے اپنی مطبوعات سے پہچانے جاتے ہیں جو کتابوں کی شکل میں ہوتی ہیں۔ کتاب کی اہمیت مسلم ہونے کے باوجود فی زمانہ اس کے ساتھ بے اعتنائی ہمارا وتیرہ ہے۔ کتابوں کی اہمیت کا احساس معدوم تر اور ذوقِ مطالعہ تقریباً ختم ہوتا جا رہا ہے۔ کتاب کی زوال پذیری کے باوجود کچھ ادارے لوگوں کو کتاب سے وابستہ رکھنے کی کوشش فروغ ادب کے جذبے کے تحت کر رہے ہیں۔ ان اداروں کی صف میں شامل پاکستان پنجابی ادبی بورڈ پہلا ادارہ ہے جس نے پنجابی زبان کی تعلیم وترقی، ترویج واشاعت کی طرف مناسب طور پر توجہ دی اور نہایت فعال کردار ادا کیا ہے۔ اس ادارے نے پنجابی زبان کے مشہور ادیبوں کی خدمات حاصل کیں اور ان سے کتابیں لکھوائیں۔ دوسری زبانوں کی کتابوں سے پنجابی تراجم کا اہتمام کیا۔ پاکستان پنجابی ادبی بورڈ نے قصے کہانیوں کی کتابوں کے علاوہ دوسرے مفید اور دلچسپ موضوعات مثلاً قواعد، لغت، تاریخ، تذکرہ، مذہب، اخلاق وغیرہ پر کتابیں شائع کی ہیں۔ یہ پہلا علمی وادبی ادارہ ہے جس نے تصنیف وتالیف کو بھی اپنا نصب العین بنایا۔ پاکستان پنجابی ادبی بورڈ نے نثر کے اعلیٰ نمونے پیش کیے اور بے مثل کتابیں چھپوائی ہیں جن سے پنجابی ادب کے سرمائے میں قابل قدر اضافہ ہوا۔ عالمگیریت کی اس دوڑ میں ایسے غیر سرکاری اقدامات ان زبانوں کی بقا کے لیے ہرگز ناکافی ہیں۔ جب تک ہماری ریاست ان زبانوں کی سرپرستی نہ کرے اور جب تک حکومت ان زبانوں کو ابتدائی تعلیم کے لیے ذریعہ تعلیم (medium of instruction) نہ

بنائے آنے والی نسلیں زبان سے بے اعتنائی کی وجہ سے اپنی زبانیں بھول جائیں گی اور یوں پاکستان اپنے ثقافتی ورثے کے ایک بڑے حصّے سے محروم ہو جائے گا۔ دستیاب اور معلوم پنجابی ادب میں 'بابا فرید' کو اولیت حاصل ہے لیکن ڈاکٹر شہباز ملک کے مطابق؛

"بابا فرید (1175-1265) توں لے کے شیخ ابراہیم فرید ثانی (1450-1575) تیکر دا دور پنجابی ادب دی دستیابی پاروں خالی دور اے۔ ایہہ نہیں کہ ایس دو سو ورہے وچ پنجابی وچ کجھ لکھیا نہیں گیا جیویں کہ اسیں حاجی بابا رتن جی تک بابا فرید گنج شکر دے کلام توں گویڑ لا سکنے آں کہ پنجابی اپنے اک وکھ پچھاتے جان والے روپ وچ نکھڑ چکی سی"۔(1)

ڈاکٹر شہباز ملک کے مطابق اس دور کا پنجابی ادب بوجوہ دستیاب نہیں ہے لیکن یہ نہیں ہو سکتا کہ اس دور میں اتنے وسیع علاقے کی زبان میں کوئی ادب تخلیق نہ کیا گیا ہو۔ درحقیقت اس کا کھوج لگانے کی ضرورت ہے۔

معلوم تاریخ کے مطابق اس زبان میں ادب کا آغاز 'بابا فرید الدین گنج شکر' سے ہوتا ہے۔ اس کے بعد سکھ مت کے بانی 'بابا گورو نانک' کا نام آتا ہے۔ سکھوں کے پانچویں گورو 'ارجن دیو' نے "گورو گرنتھ صاحب" گورمکھی رسم الخط میں تالیف کی اور اس میں پنجابی کے ساتھ ساتھ برج بھاشا اور کھڑی بولی کا استعمال بھی کیا گیا ہے۔ پندرہویں سے انیسویں صدیوں کے درمیان مسلمان صوفی بزرگوں اور عالموں نے پنجابی زبان میں بے مثال منظوم تحریروں کے ذریعے پنجابی کی خدمت کی۔ سولہویں اور انیسویں صدی کے دوران پنجابی زبان و ثقافت کا فروغ مسلمان صوفی شعرا، سکھ گوروؤں اور ہندو بھگتوں کے ذریعے ہوا اور انھوں نے مضبوط نظریاتی پنجابیت کا درس دیا۔ اس عمل میں 'بابا بلھے شاہ' اور 'شاہ حسین' نمایاں مقام رکھتے ہیں جنھوں نے علامتی اظہار کے ذریعے شاہی روایات اور اقتدار کے خلاف تحریروں میں عوامی جذبات کا اظہار کیا۔ مقبول پنجابی صوفی شعرا میں 'شاہ حسین'، 'بابا بلھے شاہ'، 'سلطان باہو'، 'خواجہ غلام فرید' اور 'میاں محمد بخش' وغیرہ شامل ہیں۔ 'وارث شاہ' کی "ہیر" کی مقبولیت میں کسی بھی دور میں کمی نہیں آئی بلکہ یہ قصہ ان کے قلم سے رقم ہو کر امر ہو

چکا ہے۔ مہاراجہ رنجیت سنگھ نے پنجابی ریاست قائم کی جو 1799 سے 1839 تک قائم رہی لیکن اپنے مؤثر اظہار، فصاحت و بلاغت کے باوجود تاریخی طور پر پنجابی زبان کو کبھی ریاستی سرکاری زبان کا درجہ حاصل نہیں ہوا۔ پنجابی زبان کی پہلی لغت انیسویں صدی کے وسط میں لدھیانہ کے عیسائی مشنریوں نے شائع کی۔ پنجابی کی موجودہ شکل کے بننے میں عربی، فارسی اور ترکی زبانوں کا اہم کردار ہے۔

بورڈ کے قیام کا پس منظر

کسی بھی قوم کی ترقی کا راز، اس کی بہتر تعلیمی شرح میں ہے اور بہتر تعلیمی شرح کا حصول اس کی اپنی مادری اور قومی زبان ہی میں ممکن ہوتا ہے۔ ترقی یافتہ ممالک کی تاریخ اٹھا کر دیکھیں تو یہ راز کھلے گا کہ بہتر تعلیمی شرح اور اپنی مادری زبان میں تعلیم کے حصول نے نہ صرف اس قوم و ملک کی ترقی میں اہم کردار ادا کیا بلکہ وہاں امن و امان اور بہتر معاشرتی اور معاشی ترقی میں بھی اپنا حصہ ڈالا۔ خیالات کے اظہار اور اپنے جذبات دوسروں تک پہنچانے کے لیے اشاروں کی زبان سے ترقی کرتے ہوئے حرف، لفظ اور جملے وجود میں آئے اور اس طرح صدیوں کے عمل سے زبانیں وجود میں آئیں۔ پنجابی زبان کا تعلق ہند یورپی زبانوں کے ایرانی گروہ سے ہے۔ پنجابی زبان پاکستان بھر میں بولی اور سمجھی جاتی ہے پاکستانی پنجاب، بھارتی پنجاب، پاکستانی کشمیر، صوبہ خیبر پختونخوا کے بڑے حصے میں بولی جاتی ہے۔ پاکستان و بھارت کے علاوہ انگلستان، کینیڈا، امریکہ، یورپ اور عرب ممالک میں بھی اس زبان کے بولنے والے موجود ہیں۔ اس وقت اس زبان کے بولنے والوں کی تعداد پندرہ کروڑ سے زیادہ ہے۔ اقوام متحدہ کے سروے کے مطابق یہ زبان دنیا میں دسویں زیادہ بولی جانے والی زبان ہے۔

پاکستان میں کئی مسئلوں کی طرح زبان اور لسانی شناخت کا مسئلہ شروع سے رہا ہے۔ پاکستان میں ''ثقافتی اور لسانی تکثیریت'' کے بجائے ہمیشہ ''یکسانیت'' پر زور دیا گیا ہے اور جن لوگوں نے اس نکتہ نظر سے اختلاف کیا ان کو غدّار قرار دیا گیا۔ غدّاری کے اس نظریے کی بنیاد خود بانی پاکستان حضرت قائداعظم نے رکھی جب انھوں نے 1948 میں ڈھاکہ میں زور دیکر کہا؛

> ''مجھے ایک بات بڑی واضح طور پر کہنے دیں کہ صوبے کی زبان جو بھی ہو لیکن پاکستان کی قومی زبان اردو ہی ہوگی اور جو اس سے اختلاف کرے گا وہ 'ملک دشمن' ہوگا۔'' (2)

واضح رہے کہ قائدِ اعظم کی یہ تقریر انگریزی میں ہی تھی۔ بنگالی جو کہ برِ صغیر ہند میں آزادی کی تحریک میں بڑے شد و مد سے شریک تھے، روزِ اوّل سے اس رجحان کے مخالف تھے جس میں اردو کو مسلمانوں کی شناخت کا واحد ذریعہ گردانا گیا۔ انھوں نے اپنے تحفظات کا اظہار بیسویں صدی کے اوائل میں ہی کیا تھا لیکن ان کی زبان کو ہمیشہ یہ کہہ کر رد کیا گیا کہ وہ 'ہندوانہ اثرات' رکھتی ہے۔ یہ غالباً قائدِ اعظم اور پاکستان کے پہلے وزیرِ اعظم لیاقت علی خان کی تقریروں کا ہی اثر تھا کہ آخر کار 1952ء کو ڈھاکہ یونیورسٹی کے طلبہ نے پر تشدد احتجاج کیا اور نتیجتاً 21 فروری کو کئی طلبہ پولیس کی گولیوں کا نشانہ بنے۔ دنیا میں لسانی حق کے لیے شاید یہ سب سے بڑی تحریک تھی جو ایک اکثریت کی زبان کو اقلیت میں تبدیل کرنے کے خلاف چلائی گئی۔ یہی وجہ ہے کہ اس دن کی نسبت سے یونیسکو نے 21 فروری کو "مادری زبانوں کا عالمی دن" قرار دیا۔

ہمارے قائدین کے یکسانیت کے جنون نے پاکستان کو ایک تکثیری انسانی معاشرے میں تبدیل نہ ہونے دیا۔ انھوں نے ہمیشہ اس نئی نویلی قوم کو یکجا رکھنے کی خاطر تاریخ سے متصادم حکمت عملیوں کا سہارا لیا اور آخر کار پاکستان دو لخت ہوا۔ رہا سہا پاکستان بھی بس اب جی رہا ہے کیوں کہ اس پر اب بھی وہی طبقہ مسلّط ہے جو تاریخ کی الٹ سمت میں سفر پر ترجیح دیتا ہے۔ پاکستان بننے سے پہلے اردو زبان کو قومی تشخص کی علامت بنا دیا گیا۔ نہ صرف یہ بلکہ اسے "اسلامایا" گیا اور یوں اردو کو صرف مسلمانوں کی زبان قرار دیکر ہندی سے الگ زبان بنانے کی کوشش کی گئی۔ واقعتاً، ہندی-اردو میں کوئی بڑا لسانی فرق نہیں ماسوائے چند الفاظ کے جو اردو میں فارسی یا عربی سے ڈالے گئے ہیں ورنہ دونوں کے قواعد اور ہیت ایک ہی جیسی ہے۔ صرف رسم الخط کا فرق ہے اور یہ فرق کبھی بھی زبانوں کو الگ نہیں کر سکتا۔ اگر ایسا ہوتا تو مغربی پنجاب کی پنجابی اور مشرقی پنجاب کی پنجابی بھی دو الگ زبانیں ہوتیں کیونکہ ایک عربی رسم الخط میں لکھی جاتی ہے اور دوسری گورمکھی میں۔

جب کوئی ملک کسی خاص قومی پس منظر کی بجائے ایک مبہم نظریے پر قائم کیا جاتا ہے تو اس کو استبداد اور جبر سے یا پھر کسی بیرونی دشمن کی موجودگی یا "تصوّر و تخلیق" سے منظّم رکھنے کی کوشش کی جاتی ہے تب اقلیتیوں کو کچلا جاتا ہے اور اس کے لیے غدّاری کے فتوے ہمہ وقت تیار رکھے جاتے ہیں۔ یہ سب پاکستان میں آزمایا گیا اور مسلسل آزمایا جا رہا ہے۔ پاکستان کو ایک نظریے، ایک زبان اور ایک قوم کے مثالیت پسندانہ عمل سے گزارا گیا۔ نتیجے میں نظریے نے کئی گروہوں

کو جنم دیا جو باہم متصادم اور ہمہ وقت دست و گریبان بھی ہیں۔ رہ گئی زبان کی صورت میں "یک رنگی"، وہ بھی کامیاب نہ ہو سکی۔ الٹا رنجشوں کو پروان چڑھاتی رہی۔ قومی زبان قرار دیے جانے کے باوجود اردو زبان کا بھی کوئی ایسا ادارہ قائم نہیں ہوا جسے اس کی ترقی کے ساتھ نفاذ و ترویج کا کام سپرد ہو۔ اسی طرح سے علاقائی زبانوں کے معاملہ میں عملی مشکلات تو اپنی جگہ پر تھیں لیکن سب سے پہلے ذہنی مشکلات کی طرف توجہ دی جانی چاہیے تھی اس کے علاوہ جو بھی خوف علاقائی زبانوں کے رائج یا نفاذ کے سلسلے میں موجود تھے یا ان کے پیدا ہونے کا خدشہ تھا ان کو بطریقِ احسن دور کرنے کی کوشش کی جانی چاہیے تھی مگر ایسا نہیں کیا گیا۔

اس عمل کا اثر دوسری لسانی اکائیوں پر بہت برا ہوا۔ ریاست کی جانب سے مسلسل انکار کی بدولت ان اکائیوں کی شناخت اور زبانیں ختم ہونے لگیں۔ ان زبانوں میں اکثریت اب معدومی کے خطرے سے دوچار ہیں اور کئی ایک تو پہلے سے ہی مٹ چکی ہیں۔ ان میں کئی زبانیں شمال مشرقی پاکستان میں بولی جاتی ہیں۔ ان زبانوں میں "انڈس کوہستانی"، "کھوار"، "کلاشہ"، "پلولہ"، "شینا"، "وخی"، "بروشسکی"، "بلتی"، "دمیلی"، "گاؤری" اور "توروالی" وغیرہ شامل ہیں۔ دو پاکستانی زبانیں حالیہ سالوں میں مٹ چکی ہیں۔ "ڈوماکی" گلگت بلتستان میں بولی جاتی تھی جبکہ "اشوجو" سوات کے بشیگرام وادی میں بولی جاتی تھی۔ یہ زبانیں اپنے بولنے والوں کی طرح کئی مسئلوں سے دوچار ہیں۔ تقریباً ساری زبانوں میں کوئی معیاری (Standardized) رسم الخط موجود نہیں اور اس وجہ سے ان زبانوں کو لکھنے کا رواج عام نہیں ہوا۔ ان زبانوں میں البتہ لوک ادب اپنی صورت میں موجود ہے تاہم یہ ادب سینہ بہ سینہ نسلوں میں منتقل ہوتا ہے۔ لکھائی کا نظام نہ ہونے کی وجہ سے مقامی حکمت اور تاریخ کے یہ خزینے معدوم ہوتے جا رہے ہیں۔ ان کمیونیٹیوں میں "لسانی تبدیلی" یعنی (language shift) کا عمل تیز تر ہے کیونکہ ریاستی عدم دلچسپی کی وجہ سے لوگ اپنی زبانوں کو ترقی میں رکاوٹ سمجھ رہے ہیں۔ ان میں سے کوئی زبان بھی اسکولوں میں ذریعہ تعلیم نہیں اور نہ ہی مضمون کے طور پر پڑھائی جاتی ہے۔ اسی وجہ سے بچّوں اور نوجوانوں میں اپنی زبان چھوڑنے کا عمل تیز ہے۔

میڈیا کے دور میں کہیں بھی ان زبانوں میں پروگرامز تو کجا ان کا ذکر تک نہیں کیا جاتا۔ ایسے میں خدشہ ہے کہ بہت جلد یہ زبانیں ختم ہو جائیں گی۔ نجی سطح پر کیے جانے والے اقدامات کے ساتھ ساتھ ان زبانوں کی بقا کے لیے جب تک ریاست سرپرستی نہ کرے اور جب تک حکومت ان زبانوں کو ابتدائی تعلیم کے لیے ذریعہ تعلیم (medium of instruction) نہ بنائے، آنے والی نسلیں اپنی زبانیں بھول جائیں گی اور پاکستان اپنے ثقافتی ورثے کے ایک بڑے حصّے

سے محروم ہو جائے گا۔ حقیقت ہے کہ ہمیں انگریزی کی ضرورت ہے کیوں کہ آج کی دنیا میں اس کے بغیر جدید علوم تک رسائی ممکن نہیں لیکن اردو بھی بہت اچھی زبان ہے کیوں کہ اس میں میر، غالب، منٹو، اقبال اور فیض احمد فیض جیسے لوگوں نے لکھا ہے۔ ہماری نسبت پنجابی، پشتو، سندھی، سرائیکی، بلوچی، براہوی اور دیگر مقامی زبانوں سے بھی ہے کیونکہ ان میں بابا فرید، شاہ حسین، بلھے شاہ، وارث شاہ، سلطان باہو، خواجہ غلام فرید، شاہ حسین، غنی خان، رحمان بابا، خوشحال خان خٹک، شاہ عبدالطیف بھٹائی، سچل سرمست، مست توکلی، میر گل خان نصیر، جام درک، حمزہ خان شنواری جیسے شعرا اور مصنفین نے عقل و دانائی اور حکمت کے موتی بکھیرے ہیں۔ ہمیں اپنی اپنی ماں بولیوں سے محبت اور نسبت ہے کیوں کہ ہم نے بولنا شروع کرتے وقت ان ہی زبانوں میں پہلے الفاظ ادا کیے۔ دیگر تمام زبانوں کے بارے میں جانتے اور سمجھتے ہوئے بھی ہم اپنی ماں بولی میں خواب دیکھتے ہیں۔ اگر ماں بولی کو ہمارے لیے ذریعہ تعلیم بنا دیا جائے اور ابتدائی تعلیم اسی زبان میں دی جائے تو اس سے تمام علاقوں میں شرح خواندگی بڑھنے کے ساتھ ساتھ ان زبانوں میں موجود علوم اور عقل و دانش کی باتوں کے مقبول عام ہونے کے ساتھ ساتھ ان کی ثقافت بھی ترقی کرے گی۔

1951ء میں گورنمنٹ دیال سنگھ کالج لاہور میں اُس وقت کے پرنسپل سیّد عابد علی عابد کے تعاون سے عُلما کا ایک اجلاس منعقد ہوا، جس میں صوفی غلام مصطفٰی تبسم، مولانا عبدالمجید سالک، ایم ڈی تاثیر، ڈاکٹر محمد باقر، پروفیسر تاج محمد خیال اور اُستاد کرم امرتسری جیسے دیگر کئی علمائے کرام شریک ہوئے۔ اِس اجلاس میں مرکزی خطاب بابائے پنجابی ڈاکٹر فقیر محمد فقیر نے کیا اور پنجابی زبان کی اہمیت اور ضرورت پر مفصل گفتگو کرتے ہوئے پنجابی کی دِگرگوں حالت کا تذکرہ کیا۔ یہاں پر پنجابی زبان کے فروغ اور ادبی سرمائے کی حفاظت کے لیے ایک تنظیم ''پاک پنجابی لیگ'' تشکیل دی گئی۔ اس تنظیم کے صدر مولانا عبدالمجید سالک اور سیکریٹری ڈاکٹر فقیر محمد فقیر بنائے گئے۔ اس تنظیم کے پہلے باقاعدہ اجلاس میں پنجابی زبان میں ایک ماہوار رسالہ شروع کرنے کی ذمہ داری بابائے پنجابی کو سونپی گئی اور مولانا عبدالمجید سالک کو اُن کی معاونت کے لیے کہا گیا۔ ''ماہوار پنجابی لاہور'' ستمبر 1951ء سے اپریل 1960ء تک شائع ہوتا رہا۔

ماہنامہ پنجابی کے بعد 1962ء میں ہفتہ وار ''وارث'' کے نام سے رسالہ شروع ہوا۔ مسعود کھدر پوش نے دینی موضوعات پر پنجابی زبان میں اوّلین ماہنامہ رسالہ ''حق اللہ'' کے نام سے شروع کیا۔ 1952ء میں ماہوار پنجابی سے نثری انتخاب کرکے ''لہراں'' کے نام سے ایک ضخیم پنجابی نثر کی شاہکار کتاب مرتب کی گئی۔ یہ کتاب قیامِ پاکستان کے بعد پاکستانی پنجاب میں اوّلین نثر کی کتاب تھی، جس میں کہانیاں، افسانے، مضمون انشائیے وغیرہ سب کچھ شامل کیا گیا۔

1957ء میں اوری اینٹل کالج لاہور کے پرنسپل پروفیسر ڈاکٹر محمد باقر کے اشتراک سے ''مغربی پاکستان پنجابی ادبی اکادمی'' کی بنیاد رکھی گئی اور اس اکادمی کے زیرِ اہتمام پنجابی زبان کے تمام تر صوفیائے کرام کے کلام کو مرتب کر کے تحقیقی اور تنقیدی مقدمے لکھ کے شائع کیے گئے۔ ان میں ''کلیاتِ بُلھے شاہ''، ''ہیر وارث شاہ''، ''ہیر شاہ جہان مقبل''، ''میاں محمد بخش'' کی ''سیف الملوک''، ''نادر شاہ دی وار از نجابت''، ''پیر محمد کی چٹھیاں دی وار''، ''شاہ محمد کی سِکھاں دی وار''، ''پیلو کی مرزا صاحباں''، ''حافظ برخوردار کی مرزا صاحباں''، ''کلیاتِ ہدایت اللہ از میاں ہدایت اللہ''، ''کلیاتِ علی حیدر ملتانی''، ''ٹکارے''، ''کُلیاتِ ہاشم شاہ'' اور ''بول فریدی از بابا فرید الدین گنج شکرؒ'' شامل ہیں۔

مندرجہ بالا حقائق کی روشنی میں یہ بات سامنے آتی ہے کہ پنجابی زبان اس علاقے میں بسنے والے لوگوں میں سے اکثریت کی زبان تھی لیکن اس کی ترقی و ترویج کا کام کرنے والا کوئی مؤثر ادارہ موجود نہیں تھا۔ اس لیے یہ ضرورت محسوس کی گئی کہ ایسا ادارہ بنایا جائے جو پنجابی زبان کے ادب کی ترویج و اشاعت کا کام بخوبی انجام دے۔ پاکستان پنجابی ادبی بورڈ کے وجود میں آنے سے پہلے پنجابی زبان کے ادب اور اس کی ترویج و ترقی کے سلسلے میں کچھ انفرادی اور اجتماعی کوششیں بھی ہوتی رہیں۔ 'پاک پنجابی لیگ'، 'پنجابی ادبی اکیڈمی'، 'مجلس شاہ حسین' جیسی تنظیمیں بھی وجود میں آتی رہیں اور کچھ عرصے کے بعد عدم دلچسپی یا اور وجوہات کا شکار ہو کر بند ہو جاتی رہیں۔ اس لیے پنجاب کے معروف ادیبوں، شاعروں، دانشوروں اور پنجابی زبان سے محبت کرنے والوں کے اجلاس میں پاکستان پنجابی ادبی بورڈ کا قیام عمل میں لایا گیا۔ اس بورڈ کے قیام کے پیچھے ایک تاریخ چھپی ہوئی ہے جس کا تفصیلی ذکر اوپر ہو چکا ہے۔ **سید سبط الحسن ضیغم نے 30 مئی 1975 کو دن گیارہ بجے دیال سنگھ مینشن لاہور میں اس تنظیم کا اجلاس بلایا جس کی صدارت جناب ایم مسعود نے کی اور اس میں راولپنڈی سے لے کر ملتان تک کے لوگ موجود تھے۔ جن میں حکیم محمد موسیٰ، ولی محمد واجد، افضل پرویز، میاں محمد شفیع، ذوالفقار تابش، ریاض احمد شاد، انور علی، اکرام چغتائی، الطاف رانا وغیرہ شامل ہیں۔**

پہلے اجلاس میں متفقہ طور پر تنظیم کا نام ''پاکستان پنجابی ادبی بورڈ'' منظور کیا گیا۔ جس طرح تمام اداروں کو چلانے کے لیے کچھ اصول، ضابطے اور قانون مقرر کیے جاتے ہیں جن کی روشنی میں وہ ادارے اپنی منزلیں طے کرتے ہیں۔ اسی طرح اس اجلاس میں بورڈ کا دستور تیار کرنے کا فیصلہ بھی کیا گیا اور ''سندھی ادبی بورڈ'' کا دستور منگوا کر اس سے

استفادہ کرتے ہوئے ضروری ترامیم کر کے بورڈ کا دستور تیار کیا گیا۔ دستور بنانے والوں میں ایم مسعود، میاں محمد شفیع، ریاض احمد شاد، اکرام چغتائی اور سید سبط الحسن ضیغم شامل تھے۔ ان لوگوں نے دو گھنٹے کی محنت کے بعد ایک دستور تیار کیا جس کو اتفاق رائے سے منظور کر لیا گیا۔

بورڈ کے دستور کی چیدہ چیدہ شقیں

دستور کے مطابق اس تنظیم کا نام 'پاکستان پنجابی ادبی بورڈ' ہو گا جو ایک آزاد اور خود مختار ادارہ ہو گا۔ بورڈ کے ممبران کی تعداد 32 ہو گی جن میں سے 11 ممبران مستقل ممبر ہوں گے۔ باقی 21 ممبران کا انتخاب کیا جائے گا اور ان میں سے ہر ممبر دو سال کے لیے منتخب کیا جائے گا۔ بورڈ کا صدر مقام اور اس کی مجلس عاملہ کے اجلاس لاہور ہی میں ہوں گے۔ ماہ مارچ کے آخری ہفتے میں بورڈ کا عام سالانہ اجلاس ہو گا یا بورڈ کے پانچ ممبران صدر کو کسی خاص اجلاس یا کام کے لیے بورڈ کا اجلاس بلانے کے لیے درخواست دے سکتے ہیں اور صدر اس درخواست کے ملنے کے بعد پندرہ دنوں میں یہ اجلاس بلائے گا۔ کسی ممبر کی موت یا استعفے کی صورت میں بورڈ کے ممبران کے اکثریتی فیصلے کے ذریعے نیا ممبر چنا جائے گا۔ کوئی ممبر اگر بورڈ کے اصولوں کی خلاف ورزی کرے گا تو مجلس عاملہ اس بارے میں غور کرے گی اور غیر تسلی بخش رویے کی صورت میں اس ممبر کی ممبر شپ بورڈ کے اگلے اجلاس تک معطل کر سکے گی اور بورڈ کے اجلاس میں اس ممبر کی ممبر شپ ختم کی جا سکے گی۔

بورڈ کی مجلس عاملہ کے چودہ (14) ممبران کا انتخاب بورڈ کے ممبران میں سے ہو گا جو بورڈ کے بارے میں تجاویز اور مشورے دے گی اور بورڈ کی طرف سے کیے گئے فیصلوں پر عمل درآمد کرائے گی۔ بورڈ کے تمام اجلاس کی صدارت صدر کرے گا۔ وہ بورڈ کے انتظامی اور مالی معاملات کی نگرانی کرے گا اور ایسے تمام معاملات بورڈ کے سامنے پیش کرے گا۔ صدر بورڈ میں کام کرنے والے عہدیداروں اور کام کرنے والوں پر نظر رکھنے کے ساتھ انتظامی اور مالی معاملات بھی دیکھے گا۔

صدر کی غیر موجودگی میں نائب صدر بورڈ کے اجلاس اور مجلس عاملہ کی صدارت کرے گا۔ وہ صدر یا بورڈ کی طرف سے دی گئی ذمہ داریاں پوری کرے گا۔ اگر صدر کا عہدہ خالی ہو یا صدر تین ماہ یا اس سے زائد عرصے کے لیے کہیں گیا ہو تو صدر کی ذمہ داریاں نبھائے گا۔

سیکریٹری بورڈ کا سب سے بڑا منتظم ہو گا اور بورڈ کی طرف سے سونپی گئی ذمہ داریوں سے عہدہ براہونے کے ساتھ ساتھ بورڈ کے دستور کے مطابق وقتاً فوقتاً صدر، مجلس عاملہ یا نائب صدر کی طرف سے جاری کردہ ہدایات کے مطابق بورڈ کی طرف سے خط و کتابت کرے گا۔ سیکریٹری بورڈ کے تمام ریکارڈ اور جائیداد کی حفاظت کرے گا۔ بورڈ کے افسران اور دیگر ملازمین کی نگرانی کرنے کے ساتھ دفتر کے نظم و ضبط کا ذمہ دار ہو گا۔ بورڈ کا سیکریٹری بورڈ کا خزانچی بھی ہو گا۔ سیکریٹری بورڈ کا آڈٹ کرائے گا اور بورڈ کے اجلاس میں آڈیٹر کی رپورٹ بورڈ کی منظوری کے لیے پیش کرے گا۔ اس کے علاوہ آنے والے سال کے لیے بورڈ کا بجٹ بورڈ کے اجلاس میں پیش کرے گا جس کی منظوری بورڈ ضروری ترامیم کے ساتھ دے گا۔

مسودے کی جانچ پڑتال

جب کوئی مصنف یا لکھاری اپنا مسودہ بورڈ کے سیکریٹری کے پاس پہنچاتا ہے تو سیکریٹری اشاعتی کمیٹی کا اجلاس بلاتا ہے۔ کمیٹی مسودے کی جانچ پڑتال کرتے ہوئے یہ دیکھتی ہے کہ جس موضوع پر کتاب تحریر کی گئی ہے کیا اس کو چھاپنے کی ضرورت ہے۔ اشاعتی کمیٹی کی منظوری سے اس کتاب کے مسودے کو اس موضوع سے متعلقہ ماہر کو اس کی رائے لینے کے لیے بھیجا جاتا ہے۔ وہ ماہر اس مسودے کو پڑھنے اور جانچنے کے بعد رائے دیتا ہے کہ یہ کتاب چھپنے کے قابل ہے یا نہیں۔ اس ماہر کا فیصلہ بھی اشاعتی کمیٹی کے اجلاس میں کیا جاتا ہے اور رائے دینے والے ماہر کا نام خفیہ رکھا جاتا ہے۔ عمومی طور پر بورڈ کا سیکریٹری قابل اشاعت کتابوں کو اسی سال میں چھاپنے کا اہتمام کرتا ہے لیکن اگر فنڈز کی کمی ہو تو اگلے سال وہ کتاب لازماً چھپ جاتی ہے۔

جہاں اچھے کام ہوتے ہیں انسانی جبلت ہے کہ اس کے کچھ مخالفین بھی پیدا ہو جاتے ہیں یا پھر وہ کام کرنے والا اپنے آپ کو کچھ لوگوں سے برتر سمجھتے ہوئے نہ چاہتے ہوئے بھی غلطیاں کر جاتا ہے۔ ایسا ہی معاملہ یہاں پر بھی ہو جاتا ہے کیونکہ یہ ممکن ہے کہ جو تصنیف ایک شخص کو بہت اچھی لگ رہی ہو اور اگر وہ تصنیف اس کی اپنی ہو تو لازم ہے کہ وہ اس کو اچھی

لگے مگر اس کو اشاعتی کمیٹی یارائے دینے والا ماہر قابل اشاعت قرار نہ دے تو پھر وہ مصنف اس کو زیادتی قرار دیتا ہے لیکن کبھی کبھار ایسا بھی ہو جاتا ہے کہ اس تصنیف کو پیشہ ورانہ چپقلش کی بنیاد پر نامنظور کر دیا جاتا ہے جب کہ اس سے کم درجے کی تصانیف چھپ چکی ہوتی ہیں۔ اس لیے یہ فیصلہ کرنا انتہائی مشکل ہے اور ایک مقررہ معیار پر ہمیشہ سو فیصد عمل کرنا ممکن بھی نہیں ہے۔

پاکستان پنجابی ادبی بورڈ کے تمام ممبران اور عہدے داران میں پنجابی زبان سے محبت کرنے والے اور اعلٰی درجے کے مصنفین شامل ہیں جو دن رات پنجابی زبان کی ترقی و ترویج کے لیے کوشاں ہیں۔ یوں ان مصنفین نے اپنی ماں بولی کو اس کا جائز مقام دلانے کے سلسلے میں اپنا کردار بخوبی ادا کیا ہے اور نئے لکھاریوں کے ساتھ پنجابی پڑھنے والوں کو بھی اپنی زبان کی طرف متوجہ کیا ہے۔ جس سے پنجابی زبان کے ادب میں اضافہ تو ہوا ہی ہے لیکن بہت سی انمول تصنیفات بھی سامنے آئی ہیں۔ یوں پنجابی زبان کے بہت سے گمنام شعرا، نثر نگاروں اور ان کی لکھتوں کے بارے میں عام لوگوں کو جانکاری حاصل ہوئی ہے۔ ان قابل تقلید اور ماں بولی کے خدمت گاروں میں مسعود کھدر پوش، اشفاق احمد خاں، حکیم موسیٰ امرتسری، ڈاکٹر نذیر احمد، سجاد حیدر، نجم حسین سید، شفقت تنویر مرزا، ڈاکٹر سیف الرحمٰن ڈار، پروفیسر شریف کنجاہی، سید سبط الحسن ضیغم، راجا رسالو، محمد آصف خاں اور مشتاق صوفی شامل ہیں۔

پاکستان پنجابی ادبی بورڈ نے اپنی کتابوں کی قیمت کے سلسلے میں بھی ایک اصول رکھا ہے اور اس کی قیمت کو لاگت سے کم ہی رکھا جاتا ہے تاکہ عام آدمی اس کو خرید سکے تاکہ اس کی جیب پر بوجھ نہ پڑے اور پنجابی زبان میں موجود علم اپنے پڑھنے والوں میں پھیل سکے گا۔ بورڈ لکھاریوں کو کتابوں کا معاوضہ بھی ادا کرتا ہے اور پنجابی ادیبوں کو قابل ذکر معاوضہ پہلی مرتبہ پاکستان پنجابی ادبی بورڈ نے ہی ادا کیا۔

کتابوں کی اشاعت کا طریقہ کار

پاکستان پنجابی ادبی بورڈ نے کتابوں کی اشاعت کے سلسلے میں باقاعدہ ایک طریقہ کار طے کیا ہے۔ کوئی بھی مصنف، شاعر، مترجم اور مرتب کار اپنی کتاب کا مسودہ بورڈ کے سیکریڑی کو دیتا ہے۔ سیکریڑی اشاعتی کمیٹی کا اجلاس بلاتا ہے جس میں اس کتاب کے موضوع کے بارے میں فیصلہ کیا جاتا ہے کہ اس موضوع پر کتاب چھاپنے کی ضرورت ہے یا نہیں۔

قابل اشاعت مسودے پر رائے کے لیے اس موضوع کے کسی نامور لکھاری کے نام کا تعین کیا جاتا ہے جو اس کتاب کے بارے میں اپنی رائے دے گا۔ اس طرح سے وہ مسودہ اس صنف کے ماہر کے پاس مزید تحقیق کے لیے بھیجا جاتا ہے جو یہ بتاتا ہے کہ یہ مسودہ اشاعت کے قابل ہے یا نہیں۔ اس محقق یا دانشور کی اس مسودے کے بارے میں رائے کو خفیہ رکھا جاتا ہے۔ قابل اشاعت مسودے کو سیکریٹری بورڈ اسی سال چھاپنے کا بندوبست کرتا ہے تاہم ناگزیر وجوہات کی بنا پر اگر وہ کتاب اس سال نہ چھپ سکے تو اگلے سال ضرور چھاپ دی جاتی ہے۔

لائبریری

پاکستان پنجابی ادبی بورڈ کی ایک لائبریری بھی ہے جس میں پنجابی کے ساتھ ساتھ اردو، انگریزی، ہندی، سندھی، بلوچی، پشتو اور کچھ دیگر زبانوں کی خاصی کتابیں موجود ہیں۔ پاکستان پنجابی ادبی بورڈ کے پاس چونکہ اپنی کوئی عمارت موجود نہیں ہے اور موجودہ عمارت میں لائبریری کے لیے مناسب جگہ نہ ہونے کی وجہ سے کتابوں کو ترتیب سے نہیں رکھا جا سکتا۔ اسی وجہ سے ان کتابوں سے فی الفور استفادہ نہیں کیا جا سکتا۔ ان کتابوں کے لیے جگہ کے ساتھ ساتھ تجربہ کار لائبریرین اور دوسرے عملے کی بھی ضرورت ہے تاکہ کتابوں کو ترتیب کے ساتھ منظم انداز میں رکھا جا سکے۔ یوں یہ کتابیں محفوظ رہیں گی اور ان کو استعمال میں بھی لایا جا سکے گا۔ اس کے علاوہ بورڈ کے دوسرے عملے کی تعداد بھی انتہائی کم ہے جو سیکریٹری کی زیر نگرانی بورڈ کے دیگر کاموں کے ساتھ کتابوں کی دیکھ بھال بھی کرتا ہے۔

پاکستان پنجابی ادبی بورڈ کے عہدیدار

بورڈ کے پہلے اجلاس میں ہی یہ فیصلہ کر لیا گیا تھا کہ بورڈ کے کون سے عہدیدار ہوں گے اور یہ طے ہوا کہ بورڈ کے تین عہدیدار صدر، نائب صدر اور سیکریٹری ہوں گے۔ عہدیدار، مجلس عاملہ اور دوسری کمیٹیوں کا انتخاب ہر دو سال بعد بورڈ کی میٹنگ میں ہو گا۔

مجلس عاملہ

مجلس عاملہ صدر، نائب صدر، سیکریٹری اور گیارہ ممبران پر مشتمل ہے۔ مجلس عاملہ کے لیے ممبران کا انتخاب ہر دو سال کے بعد کیا جاتا ہے۔

دیگر کمیٹیاں

بورڈ کی دو کمیٹیاں، فنانس کمیٹی اور ثقافتی کمیٹی ہیں۔ عمومی طور پر یہ کمیٹیاں تین ممبران اور ایک معاون پر مشتمل ہوتی ہیں۔ اس کے علاوہ ایک اشاعتی کمیٹی بھی ہے۔ ان کمیٹیوں کے ناموں سے ظاہر ہوتا ہے کہ ایک کمیٹی مالی معاملات وغیرہ، دوسری کمیٹی مختلف تقریبات کے انتظامات وانعقاد کے سلسلے میں کام کرتی ہے جبکہ اشاعتی کمیٹی بورڈ کی طرف سے چھپنے والی کتابوں کا فیصلہ کرتی ہے۔

پاکستان پنجابی ادبی بورڈ کے صدور

پاکستان پنجابی ادبی بورڈ کے اب تک چھ صدور رہے ہیں جن کے نام بالترتیب درج ذیل ہیں۔

1۔ ایم مسعود کھدر پوش
2۔ نذیر احمد
3۔ سجاد حیدر
4۔ اشفاق احمد
5۔ شفقت تنویر مرزا
6۔ مشتاق صوفی

پاکستان پنجابی ادبی بورڈ کے نائب صدور

1۔ میاں محمد شفیع
2۔ ایم۔اے مسعود
3۔ اشفاق احمد خاں
4۔ راجار سالو
5۔ پروین ملک

پاکستان پنجابی ادبی بورڈ کے سیکریٹری

سیکریٹری کا عہدہ کلیدی حیثیت رکھتا ہے اور پاکستان پنجابی ادبی بورڈ کے تمام سیکریٹری نہایت کہنہ مشق اور تجربہ کار مصنف، محقق اور نقاد کی حیثیت سے جانے جاتے ہیں۔

1۔ سید سبط الحسن ضیغم
2۔ محمد آصف خاں
3۔ نادر علی
4۔ راجار سالو
5۔ پروین ملک

بورڈ کے بانی ممبران

بورڈ کے بانی ممبران میں مندرجہ افراد شامل تھے۔

1۔ ایم مسعود دیال سنگھ مینشن، لاہور

2۔	میاں محمد شفیع	موتی جھیل، گوجرانوالہ
3۔	عابدہ حسین	شاہ جیونہ، جھنگ
4۔	اشفاق احمد خان	گلبرگ، لاہور
5۔	حکیم محمد موسیٰ امرتسری	ریلوے روڈ، لاہور
6۔	ولی محمد واجد	روزنامہ امروز، ملتان
7۔	انور علی (ننھا)	پاکستان ٹائمز، لاہور
8۔	سید سبط الحسن ضیغم	کرشن نگر، لاہور
9۔	میاں سلیم جہانگیر	راج گڑھ، لاہور
10۔	نجم حسین سید	جیل روڈ، لاہور
11۔	فقیر سید اعجاز الدین	الفلاح بلڈنگ، لاہور

پہلے نامزد یا عام ممبران

بورڈ کے دستور کے مطابق نامزد کردہ 22 ممبران کے نام درج ذیل ہیں۔

1۔	جوشوا فضل الدین	لاہور
2۔	پروفیسر انور بیگ اعوان	اسلام آباد
3۔	اعجاز بلوچ	میانوالی
4۔	افضل پرویز	راولپنڈی
5۔	محمد اکرم چغتائی	لاہور
6۔	ظفر لاشاری	بہاولپور
7۔	منو بھائی	لاہور
8۔	فاروق القادری	رحیم یار خان
9۔	حکیم اللہ بخش اسد انصاری	ملتان

10۔ مخدوم حسن رضا گردیزی — ملتان
11۔ الطاف رانا — فیصل آباد (لائل پور)
12۔ ریاض احمد شاد — لاہور
13۔ عظیم بھٹی — اٹک (کیمبل پور)
14۔ گلزار احمد — ملتان
15۔ باغ حسین کمال — جہلم
16۔ شرافت نوشاہی — گجرات
17۔ اے۔ ڈی۔ اعجاز — ساہیوال
18۔ ذوالفقار احمد تابش — لاہور
19۔ پرفیسر شریف کنجاہی — گجرات
20۔ ڈاکٹر سیف الرحمٰن ڈار — لاہور
21۔ پروفیسر محمد منشا سلیمی — ٹوبہ ٹیک سنگھ
22۔ شفقت تنویر مرزا — لاہور

بورڈ کے موجودہ ممبران

1۔ مشتاق صوفی — صدر
2۔ قاضی جاوید — نائب صدر
3۔ پروین ملک — سیکریٹری
4۔ ڈاکٹر محسن مگھیانہ
5۔ افضل احسن رندھاوا
6۔ رمضان شاد
7۔ ثروت محی الدین

8۔ ظفرلاشاری
9۔ سلیم شہزاد
10۔ سجاد حیدر پرویز
11۔ ڈاکٹر سعید بھٹہ
12۔ سعید احمد
13۔ امجد سلیم
14۔ عابد عمیق
15۔ ڈاکٹر رزاق شاھد
16۔ نسرین امجد بھٹی
17۔ طالب جتوئی
18۔ اقبال قیصر
19۔ ڈاکٹر اظہر چوہدری
20۔ ڈاکٹر ارشد محمود ناشاد
21۔ نذیر کھوٹ
22۔ غلام حسین ساجد
23۔ ڈاکٹر دلشاد ٹوانہ
24۔ ریاض احمد شاد
25۔ حنیف چودھری
26۔ رحیم طلب
27۔ مسرت کلانچوی
28۔ وسیم گردیزی

بورڈ کے اہداف اور منصوبہ جات

پاکستان پنجابی ادبی بورڈ نے کچھ اہداف مقرر کرتے ہوئے منصوبے بنائے تھے۔ جن میں پنجابی کلاسیکی شاعری کی اشاعت، طباعت اور ترویج کے لیے معروف کلاسیکی شعرا کے کلام کو اکٹھا کر کے اور باقاعدہ تحقیق کر کے اصل کلام کو شائع کرنا شامل تھا تاکہ نہ صرف پنجابی زبان کا سرمایہ محفوظ ہو جائے بلکہ آئندہ پڑھنے والوں کو باآسانی دستیاب بھی ہو۔اس سلسلے میں پاکستان پنجابی ادبی بورڈ نے کلاسیک کی تقریباً چالیس کے قریب کتابیں شائع کی ہیں۔ کسی بھی زبان کے ادب میں تحقیق کے بغیر ترقی اور ارتقا کا عمل ممکن نہیں ہوتا۔اس لیے پاکستان پنجابی ادبی بورڈ نے ایک درجن سے زائد تحقیقی اور علمی کتابیں شائع کی ہیں۔ان کتابوں کے مصنفین میں محمد آصف خاں، سید سبط الحسن ضیغم، شریف صابر، علامہ غلام یعقوب انور، تنویر بخاری، ڈاکٹر آفتاب احمد نقوی، ڈاکٹر دلشاد ٹوانہ، رحمان مذنب اور دیگر کہنہ مشق محققین اور نقاد شامل ہیں۔

کلاسیکی ادب

پنجابی کے تقریباً تمام صوفی شاعروں نے تصوف کو موضوع بنا کر اپنی بات کہی ہے۔اس سلسلے میں تصوف پر بھی بورڈ کی کتابیں منظر عام پر آچکی ہیں۔ علی عباس جلالپوری کی کتاب ''وحدت الوجود تے پنجابی شاعری'' میں تصوف کی ابتدا سے لے کر برصغیر میں پنجابی صوفی شعرا کے دور تک کے بارے میں مکمل معلومات مہیا کی گئی ہیں اور علی عباس جلالپوری جیسے محقق کی کتاب قارئین کو تصوف کا مکمل پس منظر اور پیش منظر بیان کرتی ہے۔اسی طرح سے قاضی جاوید کی کتاب ''پنجاب دی صوفیانہ روایت'' ہماری کلاسیک میں شامل شعرا اور دیگر مقامی شعرا کی شاعری اور صوفیانہ روایت کے بارے میں معلومات مہیا کرتی ہے۔

جدید ادب

دیگر زبانوں کے ترقی یافتہ ادب میں موجود نئی اصناف سے متاثر ہو کر پنجابی مصنفین نے بھی نئی نثری اور شعری اصناف کو پنجابی زبان میں شامل کیا اور اس سلسلے میں بورڈ نے افسانوں، کہانیوں، ڈراموں، ناولوں، سفر نامے اور آپ بیتی

وغیرہ کی ساٹھ سے زائد کتابیں شائع کی ہیں۔ معروف ناول نگاروں میں ظفر لاشاری، افضل احسن رندھاوا، سجاد حیدر، کہکشاں ملک اور پروفیسر سردار خان شامل ہیں۔ڈرامہ نگاروں میں سجاد حیدر، منو بھائی، نواز، شفقت تنویر مرزا، منیر نیازی، افضل احسن رندھاوا نمایاں ہیں۔ معروف افسانہ نگاروں اور کہانی کاروں میں نواز، انور علی، اکبر لہوری، فرخندہ لودھی، حنیف چودھری، حنیف باوا، سجاد حیدر، محمد منشا یاد، کنول مشتاق، افضل احسن رندھاوا، سلیم خان گمی، ڈاکٹر محسن مگھیانہ، رفعت، راجار سالو، پروین ملک اور عائشہ شامل ہیں۔

اہم شخصیات کا تعارف

ہماری تاریخ ایسی شخصیات سے بھری پڑی ہے جن کے نقش قدم پر چلتے ہوئے زندگی کے ہر میدان میں کامیابیاں حاصل کی جاسکتی ہیں۔اس لیے ان شخصیات کی زندگی کے حالات بیان کرنا از حد ضروری ہے تاکہ اپنے اسلاف اور ان کے کارناموں سے آگاہی حاصل کرتے ہوئے اپنے مستقبل کا تعین کر سکیں۔ پاکستان پنجابی ادبی بورڈ نے آقائے دوجہاں نبی کریم محمد مصطفیٰ ﷺ، بانی پاکستان، قائداعظم محمد علی جناح، فیروز دین شرف، احمد خان کھرل، ڈاکٹر فقیر محمد فقیر اور دوسری شخصیات کی زندگی کے بارے میں معلومات سے بھرپور کتابیں شائع کی ہیں جن کی تعداد دس کے قریب ہے۔ان میں کچھ کتابوں میں ایک سے زائد شخصیات کا تذکرہ کیا گیا ہے۔اس کے علاوہ پاکستان پنجابی ادبی بورڈ نے کچھ شخصیات پر تماہی ''پنجابی ادب'' کے خاص نمبر بھی شائع کیے گئے ہیں۔

ضلعی تاریخ

پاکستان پنجابی ادبی بورڈ کے منصوبوں میں ایک منصوبہ یہ بھی تھا کہ پنجاب کے مختلف اضلاع کی تاریخ مرتب کی جائے۔ اس لیے مختلف اضلاع سے تعلق رکھنے والے مصنفین کو چنا گیا اور ان سے متعلقہ اضلاع کی تاریخی، ادبی، سیاسی، سماجی، جغرافیائی، معاشی، معاشرتی اور دیگر حوالوں سے تاریخ مرتب کرنے کا کام سونپا گیا۔پنجاب کا ہر ضلع اپنی الگ پہچان، لہجے، روایات، ثقافت، رسوم اور تاریخ کا حامل ہے۔ ملتان، مظفر گڑھ، وہاڑی، گجرات، بہاولپور اور خوشاب کے بارے میں کتابیں شائع کی جا چکی ہیں اور دیگر اضلاع کی تاریخ مرتب کرنے کا کام جاری ہے۔ یہ تاریخ نہایت اہمیت کی حامل ہے کیونکہ

اس کو مرتب کرتے وقت طے شدہ حدود میں باقاعدہ تحقیق اور حوالوں کے ذریعے سے مرتب کیا گیا ہے۔اس لیے یہ کتابیں آئندہ پڑھنے والوں کو ان تمام حوالوں سے اور ہر زاویے سے معلومات فراہم کریں گی جو ان کو درکار ہوں گے۔ ضلعی تاریخ کے علاوہ کچھ شہروں کے بارے میں کتابیں شائع کی گئی ہیں جو مفید معلومات کی حامل ہیں۔ان شہروں میں ٹیکسلا، ملتان، راولپنڈی، ہڑپہ اور اعوان قوم کے علاقے شامل ہیں۔

سیاست

سیاست کے حوالے سے ''قائداعظم سوچ تے سیاست'' اور ''تحریک آزادی تے پاکستان وچ پنجاب دا حصہ'' جیسی کتابیں شائع ہو چکی ہیں۔ ''سورس میٹریل آن دی پنجاب''، ''قادر یار اے کرٹکیل انٹروڈکشن'' اور ''ورلی فین'' کے نام سے پنجابی کی تین کتابیں انگریزی میں شائع ہو چکی ہیں۔ان کتابوں کے انگریزی ترجمے سے انگریزی پڑھنے والے مقامی افراد کے علاوہ دیگر ممالک کے قارئین بھی استفادہ کر سکتے ہیں اور یوں پنجابی زبان کے ادب کی ترویج اور اس کے بارے میں بین الاقوامی سطح پر تعارف کرانے میں مدد مل رہی ہے۔

لوک ادب

کسی بھی زبان کا لوک ادب اس زبان کے بولنے والوں کی رسوم و روایات، تہذیب و ثقافت، سماجی و معاشرتی اقدار، سیاسی و اقتصادی حالات اور تاریخ کا آئینہ دار اور امین ہوتا ہے۔اس میں پیش کیے جانے والے مضامین اور عنوانات مختلف نوعیت اور اہمیت کے حامل ہوتے ہیں۔اس ادب کی سینہ در سینہ منتقلی نے اس کو محفوظ بنایا اور معاشرے کے عام و خاص طبقوں میں اس کی مقبولیت ہمیشہ انتہائی حدوں کو چھوتی رہی ہے۔ پاکستان پنجابی ادبی بورڈ نے اس حوالے سے خصوصی طور پر کردار ادا کرتے ہوئے شعری اور نثری لوک ادب پر بہت زیادہ کام کیا ہے۔ مقامی شعری لوک ادب کے ساتھ ساتھ دیگر ممالک کے ادب کا پنجابی میں ترجمہ کیا گیا ہے۔لوک ادب کی تقریباً بیس سے زائد کتابیں شائع ہو چکی ہیں۔ لوک ادب کی ان کتابوں کے مرتبین اور محققین میں تنویر بخاری، شفقت تنویر مرزا، پروفیسر شارب، مشتاق صوفی، ڈاکٹر ارشد محمود ناشاد، ڈاکٹر سیف الرحمٰن ڈار، پروفیسر شاہین ملک، الیاس گھمن اور اقبال اسد وغیرہ نمایاں ہیں۔

بچوں کا ادب

دنیا بھر کی زبانوں میں بچوں کے ادب پر خصوصی توجہ دی جاتی ہے اور اس کے لیے ماہر مصنفین کے تجربے سے استفادہ کیا جاتا ہے۔ اس لیے پاکستان پنجابی ادبی بورڈ نے بھی اس طرف خصوصی توجہ دیتے ہوئے بچوں کے ادب کے علاوہ درسی کتب شائع کرنے کا اہتمام بھی کیا ہے گو کہ ناگفتہ بہ حالات کی وجہ سے اس سلسلے میں خاطر خواہ کامیابی نہیں ہو سکی لیکن پھر بھی بچوں کی کچھ درسی کتب شائع کی گئی ہیں۔ اس کے علاوہ چھوٹی چھوٹی کہانیوں پر مشتمل افضل پرویز، ریاض احمد شاد، مسرت کلانچوی، پروفیسر اجمل نیازی کی کتابیں بھی شائع کی گئی ہیں۔

متفرق کتابیں

پاکستان پنجابی ادبی بورڈ نے کچھ متفرق قسم کی کتابیں بھی شائع کی ہیں جن میں شہد کی مکھی، چیونٹی اور مکڑی، ذرائع آمد و رفت، کپاس، انسانی جسم، خوراک، کھیلوں، دستکاریوں، پودوں، کائنات، سائنسی ایجادوں، بچوں کی دیکھ بھال کے بارے میں معلومات مہیا کی گئی ہیں۔ اس کے علاوہ پنجابی کہاوتیں، عورت کے روپ، شہر اور دیہات کی زندگی، طب، اور موسیقی علوم کے سلسلے میں مفید باتیں تحریر کی گئی ہیں۔

ڈکشنری (لغت)

تقسیمِ ہند سے پہلے سردار محمد خان نے پنجابی اُردو ڈکشنری مرتب کرنا شروع کی تھی جو ستر کی دہائی کے آخری حصے میں آکر مکمل ہوئی۔ سردار خان مرحوم کا تعلق جالندھر سے تھا لیکن تقسیمِ ہند کے بعد وہ پاکستان آ گئے تھے۔ سردار خان کی اس کاوش کو سب سے پہلے پنجابی کے سکالر محمد آصف خاں نے پذیرائی بخشی اور اس کی اشاعت کے لیے کوششیں کیں جو بار آور ثابت نہ ہو سکیں۔ یہ ڈکشنری سچل سٹوڈیوز اور پاکستان پنجابی ادبی بورڈ کی کوششوں سے مرتب ہونے کے تیس برس بعد شائع ہو سکی۔ اس ڈکشنری کا دُنیا کی دیگر ڈکشنریوں سے موازنہ کرنا اس لیے مناسب نہیں ہے کہ کہ ویبسٹر یا آکسفورڈ کی

ڈکشنریوں کے مرتبین میں ہر مضمون کے ماہرین شامل ہیں جبکہ یہ پنجابی اُردو ڈکشنری محض ایک شخص کی ذاتی اور تنہا کاوش ہے۔ پنجابی کی بین الاقوامی معیار کی ڈکشنری مرتب کرنے کے لیے ماہرین کی بہت بڑی ٹیم کی خدمات درکار ہوں گی۔

پنجاب میں برطانوی دور سے پہلے کسی پنجابی ڈکشنری کا کوئی سراغ نہیں ملتا اور انگریزوں نے اپنے دورِ حکومت میں چونکہ مقامی زبانیں سیکھنے پر خاص توجہ مرکوز کر رکھی تھی اس لیے اُنہوں نے لدھیانہ میں پنجابی زبان میں تراجم کا ایک مرکز قائم کیا تھا۔ اس مرکز میں ہونے والے کام کی وجہ سے بھارتی پنجاب میں سکھ سکالرز کو بہت مدد ملی اور گرُمکھی کی کافی ڈکشنریاں مرتب ہو گئیں۔ پنجاب میں پنجابی زبان کی ترویج واشاعت اور ڈکشنریاں مرتب کرنے کا کام نسبتاً بہت کم ہوا ہے مگر یہاں اچھے معیار کا پنجابی ادب تخلیق ہوتا رہا ہے۔ تقسیمِ ہند کے بعد ڈکشنریوں کی طرف توجہ ہوئی، تاہم پاکستانی پنجاب میں یہ توجہ برائے نام ہی رہی۔ پنجاب یونیورسٹی کے پنجابی ڈیپارٹمنٹ نے جو ڈکشنری مرتب کی وہ سردار خان کی اس ڈکشنری کے دسویں حصے کے برابر ہے اور اُردو سائنس بورڈ نے اس کے بعد دو چھوٹی چھوٹی پنجابی ڈکشنریاں مرتب کیں جن کے بعد اقبال صلاح الدین کی مرتب کردہ ایک بڑی ڈکشنری شائع ہوئی ہے لیکن وہ ڈکشنری سردار خان کی مرتب کردہ ڈکشنری سے چھوٹی ہے۔

پنجابی لغت کے حوالے سے پاکستان پنجابی ادبی بورڈ نے نہایت کارآمد اور جامع لغت مرتب کرنے اور چھاپنے کے سلسلے میں اہم کردار ادا کیا ہے اور سردار خان کی مرتب کردہ ''پنجابی اردو ڈکشنری'' کو ایک اور ادارے کے تعاون سے چھاپا ہے۔ یہ لغت دو جلدوں میں ہے اور اس میں تقریباً پونے دو لاکھ کے قریب الفاظ دیے گئے ہیں۔

رسالہ

پاکستان پنجابی ادبی بورڈ کے مقاصد میں ایک علمی، ادبی اور ثقافتی رسالے کا اجرا بھی شامل تھا لیکن بعض ناگزیر وجوہات کی بنا پر بارہ سال کے بعد جنوری 1987 میں تماہی پنجابی ادب کے نام سے ایک رسالہ نکالا گیا۔ اس کے پہلے ایڈیٹر محمد آصف خاں مقرر ہوئے کیونکہ ان کو 1960 سے 1970 تک مہینہ وار پنجابی ادب شائع کرنے کا تجربہ بھی تھا۔ محمد آصف خاں نے پنجابی ادب کے بارے میں یہ لکھا؛

''ایس رسالے داناں تاں ''پنجابی ادب'' ہے پر ایس وچ نرا پُرا ادب نہ ہوسی۔ لسانیات، معاشیات، ثقافت، آثار قدیما، تاریخ نفسیات دے نال نال سائنسی علماں جویں فزکس، کیمسٹری، جیالوجی تے بیالوجی وغیرہ بارے وی کھوج بھرے مضمون لوڑیندے ہن۔ ایس پاسے ول اچیچا دھیان دین دی لوڑ ہے۔ عالمی ادب دے نال نال اپنیاں پاکستانی بولیاں جیویں سندھی، پشتو، بلوچی توں ترجمے لوڑیندے ہن۔ اک دوجے دی سوچ توں جانو تھیون نال سانجھ پڑ موکلا ہوندا ہے۔ سانجھ ودھدی اے۔ سانجھ ودھے تاں دوجے دے دُکھ سُکھ وچ بھیالی پائی جاسکدی ہے تے انج جیون پینڈے نوں ودھیرے سکھاواں بنایا جاسکدا ہے۔ ساڈے توں جو بنیا جڑیا ہے، اوہ اساں تہاڈے موہرے دھر دتا ہے'' (3)

اس سے پہلے اپنی بات کا آغاز کرتے ہوئے محمد آصف خاں نے لکھا ہے؛

''پنجابی ادب دا بُوٹا حضرت بابا فرید گنج اپنے مبارک ہتھاں نال لایا ہائی۔ وت ایس بوٹے دا پالن تے راکھی بابا گورو نانک، نوشہ گنج بخش، شاہ حسین، سلطان باہو، علی حیدر، بلھے شاہ، وارث شاہ، سچل سرمست، لطف علی، میاں محمد بخش، خواجہ غلام فرید جیہے لوکاں کیتی۔ ساڈے توں پہلیاں پیسڑیاں دے اُدّم تے سرڑ پاروں ایہہ بُوٹا ہن گھنیری چھاں والا بوہڑ بن گیا ہے''۔(4)

1987 میں جنوری تا مارچ تک کا ''پنجابی ادب'' کا پہلا شمارا شائع ہوا جس کی قیمت 15 روپے تھی اور سال کے 90 روپے مقرر کیے گئے تھے (بعد میں قیمت کم کر دی گئی تھی)۔ یہ بڑے سائز کا 158 صفحات کا رسالہ تھا جس کے ایڈیٹر محمد آصف خاں تھے۔ اس رسالے میں پروفیسر افضل ملک، قاضی جاوید، افضل پرویز، ڈاکٹر سیف الرحمٰن ڈار، پروفیسر شاہین ملک، تنویر بخاری، ستار طاہر، نذیر خالد، امرتا پریتم، نواز، منشا یاد، حنیف باوا، عاشق رحیل، فوزیہ طاہر، ارشد میر، میرزا

ادیب، ڈاکٹر عبدالسلام خورشید، مقصود ثاقب، یوسف حسن اور محمد آصف خاں کے مختلف موضوعات پر تحقیقی اور تنقیدی مضامین شامل تھے۔ اس شمارے میں مسعود پرویز کی حمد چھاپی گئی تھی جب کہ نعت کی سعادت ماجد صدیقی اور حسین شاد کے حصے میں آئی تھی۔ شعری ادب کے حصے میں احمد راہی، نادر جاجوی، سلمان سعید، کنول مشتاق، اقبال قیصر، زبیر رانا، نسرین انجم بھٹی، ریاض احمد شاد، یوسف حسن، اکرم شیخ، عبدالکریم قدسی اور آسی خانپور کی کاوشیں شامل تھیں۔ اس شمارے میں دیگر زبانوں سے نثری اور شعری ادب میں تراجم میں شامل کیے گئے تھے۔ ان زبانوں میں پشتو، ایرانی، فرانسیسی اور افریقی زبانیں شامل ہیں۔ اسی شمارے میں ''پنجابی ادبی کانفرنس'' اور سندھ سے آئے ہوئے مہمانوں کے ساتھ منائی جانے والی ایک شام کی تفصیل بھی دی گئی ہے۔

''پنجابی ادب'' کے پہلے شمارے سے اس بات کا اندازہ لگانا مشکل نہیں ہے کہ اس رسالے میں کس قسم کے مضامین اور شاعری شائع کی جائے گی۔ یہ رسالہ کلاسیکی ادب کے ساتھ دورِ جدید کے ادب کے فروغ میں بھی اپنا کردار ادا کرے گا۔ اس کے ساتھ ساتھ اس میں نہ صرف پنجابی ادب ہو گا بلکہ دیگر زبانوں کے ادب کی مختلف نثری اور شعری اصناف کو بھی پنجابی میں ترجمہ کر کے شائع کیا جائے گا۔

''پنجابی ادب'' میں لسانیات کے موضوع پر لکھے جانے والے مضامین میں ڈاکٹر غلام علی الانہ، سردار محمد خان، محمد منصور آفاق، شریف کنجاہی، ڈاکٹر الیاس عشقی، سجاد حیدر اور ایسے ہی ماہر لسانیات شامل ہیں۔ تصوف کے موضوع پر پروفیسر افضل ملک، قاضی جاوید، ڈاکٹر عبدالسلام خورشید، ڈاکٹر سید اختر جعفری، ڈاکٹر عصمت اللہ زاہد، محمد آصف خاں، سید نصیر شاہ جیسے مصنفین کے مضامین شائع ہو چکے ہیں۔ ''پنجابی ادب'' کے خاص نمبر بھی شائع ہوتے رہتے ہیں جن میں سے کچھ شخصیات کے بارے میں اور کچھ علاقوں کے بارے میں ہیں۔ معروف ادبی شخصیات کی یاد میں مضامین اکثر شامل اشاعت ہوتے رہتے ہیں۔ ان لکھاریوں میں اشفاق احمد، احمد راہی، سجاد حیدر، امرتا پریتم، فرخندہ لودھی، منیر نیازی، شریف کنجاہی، چودھری فضل حسین، محمد آصف خاں، راجار سالو، انور علی اور ایسے ہی بہت سے روشن ستارے شامل ہیں۔

''پنجابی ادب'' میں مادری زبان کو ذریعہ تعلیم بنانے کے لیے بھی مضامین شائع ہوتے رہے ہیں جن کے ذریعے سے بچوں کو پرائمری سطح تک ان کی مادری زبانوں میں تعلیم دینے کے فوائد بتاتے ہوئے پنجابی زبان کو بھی ذریعہ تعلیم بنانے کی مانگ کی گئی ہے۔ یہ مضامین ''پنجابی ادب'' کے مختلف شماروں میں چھپتے رہے ہیں۔ ان میں سے جنوری۔ مارچ 2001

اور جنوری۔مارچ 2009 کے شمارے شامل ہیں۔ محمد آصف خاں کا یہ مضمون اس سے پہلے 1998 میں مسعود کھدر پوش ٹرسٹ کے ایک اجلاس میں بھی پڑھا جا چکا ہے۔(5)

''پنجابی ادب'' کو یہ اعزاز حاصل ہے کہ اس میں کسی قسم کے تعصب کو چاہے وہ لسانی ہو یا علاقائی جگہ نہیں دی جاتی اور اس کے ساتھ سیاسی معاملات میں الجھنے کی بجائے خالصتاً پنجابی ادب کی ترقی اور ترویج کے لیے کام کیا جاتا ہے۔ نثری ادب کے ساتھ ساتھ شعری ادب پر بھی خصوصی توجہ دی جاتی ہے۔ دیگر اصناف مثلاً ناول، افسانہ، ڈرامہ، انشائیہ، سفر نامہ، آپ بیتی اور دوسری معروف اصناف پر بھی مضامین اور تعارف شامل اشاعت رہتے ہیں۔ اس لیے بجا طور پر اس کو پنجابی زبان کے بارے میں شائع ہونے والے رسالوں میں نمایاں حیثیت حاصل ہے۔

پاکستان پنجابی ادبی بورڈ نے پنجابی کے کلاسیکی اور جدید ادب کی اشاعت و ترویج کے سلسلے میں جو خدمات انجام دی ہیں، ان کا تفصیلی ذکر اگلے ابواب میں آئے گا۔

بورڈ کے مسائل

پاکستان پنجابی ادبی بورڈ کو جن مسائل کا سامنا ہے، ان میں سے چند درج ذیل ہیں؛

- بورڈ کو جدید خطوط پر استوار کرنے کی ضرورت ہے جس کے لیے مالی وسائل موجود نہیں ہیں۔
- بورڈ کے پاس اپنی عمارت نہ ہونے کی وجہ سے دفاتر کے لیے مناسب اور ضرورت کے مطابق جگہ نہیں ہے۔
- دفتر کے کرائے، عملے کی تنخواہوں، دفتری ضروریات اور دیگر اخراجات کے لیے فنڈز نہ ہونے کے برابر ہیں۔
- بورڈ کی لائبریری کے لیے کوئی جگہ اور عملہ نہیں ہے۔
- بورڈ کو وفاقی حکومت کی طرف سے انتہائی کم مالی امداد ملتی ہے۔
- حکومت پنجاب بھی بورڈ کو مالی امداد اور دیگر معاملات میں اتنی معاونت فراہم نہیں کرتی جتنی اس صوبے کی زبان کے سلسلے میں ہونی چاہیے۔
- مالی امداد کی کمی کی وجہ سے بہت سی کتابیں چھپنے سے رہ جاتی ہیں اور قارئین بہت سی اہم کتابوں سے محروم رہتے ہیں۔
- اگر حکومتی سطح پر ادارے کی مالی معاونت کی جائے تو پنجابی زبان کی ترویج و ترقی کے نئے منصوبوں کا آغاز ہو سکتا ہے۔
- ایک وسیع علاقے اور اتنے زیادہ لوگوں کی زبان کی ترقی و ترویج کے لیے کام کرنے والے بورڈ کے عملہ کی تعداد بہت کم ہے۔
- انٹرنیٹ پر موجود ویب سائٹ کو up date کرنے کے لیے عملہ اور معاونت موجود نہیں ہے۔ جب کہ اس ذریعہ سے پنجابی زبان کے لیے بہت کام کرنے کی گنجائش موجود ہے۔

حوالے باب دوم

1۔ نتارے، لاہور، تاج بک ڈپو، 1979، ص26۔

2۔ محمد علی جناح کا ڈھاکہ میں مورخہ 21مارچ 1948 کو عوامی اجتماع سے خطاب۔

3۔ سانجھ وچار، پنجابی ادب، تماہی لہور، جلد نمبر 1، شمارہ نمبر 1، جنوری-مارچ 1987، ص5۔

4۔ ایضاً

5۔ محمد آصف خاں، پنجابی ادب، مضمون (پرائمری پدھر تے ماں بولی)، شمارہ جنوری۔مارچ، 2001، ص7۔

باب سوم

کلاسیکی پنجابی ادب کی اشاعت میں پاکستان پنجابی ادبی بورڈ کی خدمات

کتاب کے ذریعے وہ لوگ بھی بولتے ہیں جو ہمارے درمیان موجود نہیں ہوتے لیکن ہم ان کی بات سن اور سمجھ سکتے ہیں۔ وہ لوگ جن کی قوت گویائی موت نے چھین لی ہے، ہم سے کتاب کے ذریعے سے ہم کلام ہوتے ہیں۔ یوں کتاب زمانی بعُد ختم کر کے ہمیں بچھڑے ہوئے عالموں کے تجربات اور علوم سے روشناس کرنے کا ذریعہ ہے۔ اس لیے کہا جاتا ہے کہ کتاب مرِدوں کی زبان ہے۔ کتاب کے ذریعے سے اہل علم اپنے وجود کا احساس دلاتے ہیں اور یہ علم کی ترسیل کا سب سے مستند اور اہم ذریعہ ہے۔ کتاب کے ذریعے ہی ہم ان علوم تک رسائی حاصل کر سکتے ہیں جن کے بارے میں بہت سے عالم تحقیق کے ذریعے نتائج اخذ کر کے اپنا علم آنے والی نسلوں کے لیے کتابوں میں محفوظ کر چکے ہیں۔ اس سلسلے میں یہ بات بھی قابل ذکر ہے کہ بہت سے ادبی رسالے بھی اس سلسلے کی ایک کڑی ہیں۔

ڈاکٹر انور سدید کے مطابق؛

''ادبی رسالہ بیک وقت مکتب بھی ہے اور مخزن بھی۔ یہ اپنی ایک ادبی شخصیت بھی رکھتا ہے اور اسے انجمن کا درجہ بھی حاصل ہے۔ ادبی رسالہ محض حال کا ترجمان نہیں ہوتا بلکہ آج کا ادب جب ماضی کا حصہ بنتا ہے تو ادبی رسالہ ہی اس خزینے کو تحفظ عطا کرتا ہے اور یہ تنقید و تحقیق کے لیے بنیادی ماخذ کی حیثیت اختیار کر جاتا ہے''۔(1)

کسی بھی کتاب کو پڑھتے ہوئے اگر مصنف کے بارے میں بھی کچھ معلومات پڑھنے والے کے علم میں ہوں تو اس تحریر کا لطف دوبالا ہو جاتا ہے لیکن تصنیف سے مکمل طور پر استفادہ کرنے اور اس کو تحقیقی و تنقیدی نکتہ نظر سے پرکھنے کے لیے مزید کچھ چیزوں کا جاننا ضروری ہوتا ہے۔ جن میں اس مصنف کی تحریر کے ماخذات، خاندان، شخصیت، علاقہ، ماحول،

معاشرے میں مقام، لسانیات کا علم، سیاسی، سماجی، معاشرتی، معاشی اور مذہبی تاریخ کے ساتھ اس کے بارے میں عمومی رائے وغیرہ کے بارے میں معلومات موجود ہوں تو اس تصنیف کی حقیقی اہمیت کے بارے میں رائے قائم کی جا سکتی ہے۔ اس لیے اس باب میں جہاں پر پاکستان پنجابی ادبی بورڈ کی کلاسیکی پنجابی شاعری کے لیے خدمات کا جائزہ لیا گیا ہے، وہیں پر کلاسیکی شعرا کے بارے میں بھی کچھ معلومات شامل کی گئی ہیں تاکہ ان تحریروں کی حقیقی اہمیت اجاگر کی جا سکے۔ یوں ان عظیم ہستیوں کو نہ صرف خراج عقیدت پیش کرنے کی ایک شعوری کوشش کی گئی ہے بلکہ اس کلاسیکی شاعری کو اس کے پس منظر کے ساتھ سمجھانے کا سبب پیدا کیا گیا ہے۔ ڈاکٹر سید اختر حسین اختر نے اس بات کو یوں تحریر کیا ہے؛

"ایسے کر کے آکھیا جاندا اے پئی جد تائیں ایس کلام وچ ورتیاں گئیاں رمزاں دی سمجھ نہ ہووے ایس کلام نوں پڑھ کے سمجھیا نہیں جا سکدا۔ جد تائیں ایہدے وچ کیتی گئی گل دی اگاڑی پچھاڑی توں بندا واقف نہ ہوئے گا ایس کلام دی اصل روح نوں نہ اپڑ سکے گا"۔ (2)

پنجابی شعری ادب

مجموعی طور پر پنجابی شاعری میں تصوف کے اسرار و رموز کا بیان خاص طور پر پایا جاتا ہے۔ ان میں شاہ حسین، (مادھو لال حسین) سلطان باہو، بلھے شاہ اور خواجہ فرید شامل ہیں۔ تصوف کے ساتھ ساتھ اپنے زمانے کے معاشرتی و سیاسی حالات کے رنگ و اثرات ان پر غالب تھے۔ اس کا اظہار خاص اور عام فہم علامتوں میں نظر آتا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ ان کا کلام عوام میں بے حد مقبول ہے۔

پنجابی شاعری میں داستان گوئی بھی ایک خصوصی مقام رکھتی ہے۔ جن شعرا نے پنجابی کی لوک داستانوں کو منظوم کیا ان میں وارث شاہ کا قصہ 'ہیر رانجھا'، ہاشم شاہ کا قصہ 'سسی پنوں'، فضل شاہ کا قصہ 'سوہنی مہینوال'، حافظ برخوردار کا قصہ 'مرزا صاحباں' وغیرہ مشہور ہیں۔ ان قصوں میں اعلیٰ درجے کی شاعری کے ساتھ ساتھ پنجاب کی تاریخ نیز معاشی،

مذہبی اور معاشرتی زندگی کی بھرپور جھلک بھی دکھائی دیتی ہے۔ پنجابی زبان میں ناول بھی لکھے گئے۔ مشہور ناول نگاروں میں دبیر سنگھ، میرن سنگھ اور سیدان بخش منہاس کے ناول بہت مشہور ہیں۔

پنجابی ادب اپنے اظہار کے حوالے سے ایک بھرپور موثر اور بے باک تصویر پیش کرتا ہے جس کی دنیا کے ادب میں نظیر نہیں ملتی۔ اس کے اصناف سخن کی تعداد زندگی کے ہر شعبے پر پھیلی ہے جن میں زندگی کی چھوٹی چھوٹی محسوسات تک کا اظہار کرنے کی صلاحیت پائی جاتی ہے۔ ان میں وار، ڈھوٹ، ماہیا، دوھے، گھوڑی، سٹھنیاں، ٹپے، سمی اور بولیاں وغیرہ شامل ہیں۔ بیسویں صدی سے پہلے پنجابی نثر میں بہت کم کام ہوا تھا اور جو ہوا وہ بھی صرف مذہبی علم تک محدود تھا۔ بعد میں ناول نویسی، ڈرامہ نویسی، تذکرہ نویسی، تحقیق و تنقید اور دوسرے اصناف نثر میں مختلف لوگوں نے گراں قدر کام کیا ہے۔ اب ٹیلی وژن اور ریڈیو کی وجہ سے ڈرامہ نویسی میں بھی ترقی ہو رہی ہے۔ پنجاب یونیورسٹی کے علاوہ دیگر یونیورسٹیوں میں پنجابی کے شعبے قائم ہو چکے ہیں جہاں ایم اے پنجابی اور پی ایچ ڈی کروائی جاتی ہے۔

برصغیر پاک و ہند میں بسنے والی اقوام کے مشاہیر کو دنیا بھر میں ایک خاص مقام حاصل ہے جنھوں نے اپنے اپنے خیالات کو موتیوں کی لڑی میں پرو کر مخلوق خدا کی رہنمائی کرتے ہوئے ان کو دین اسلام کا سیدھا راستہ دکھایا۔ ان صوفی، درویش، باصفت عالموں اور باعمل بزرگوں میں بابا فرید، حضرت داتا گنج بخش، حضرت سلطان باہو، پیر وارث شاہ، بلھے شاہ، شاہ عبدالطیف بھٹائی، میاں محمد بخش، رحمان بابا، شاہ حسین اور ان جیسے دیگر باکمال بزرگ شامل ہیں۔ جنھوں نے مخلوق خدا کی اللہ تعالیٰ کے عنایت کیے ہوئے علم سے رہنمائی کی اور آنے والی نسلوں کے لیے راہ عمل متعین کرتے ہوئے راستہ دکھایا۔

پنجابی ادب کی تاریخ

پنجابی زبان کے علم و ادب کی نشان دہی محمود غزنوی کی آمد کے زمانے سے ہوتی ہے۔ اس سلسلہ میں سب سے پہلے حضرت بابا فرید گنج شکر کا نام آتا ہے۔ ان کی شاعری کا موضوع تصوف، پیار محبت اور حب الوطنی ہے۔ محمود غزنوی نے 1014 میں مغربی پنجاب کو اپنی مملکت میں شامل کیا۔ اس کی وفات کے بعد امیر مسعود تخت نشین ہوا۔ اس زمانہ میں خواجہ سعد سلمان لاہور آئے، ان کے فرزند مسعود سعد سلمان بلند پایہ شاعر تھے۔ امیر خسرو نے اپنی کتاب ''غرۃ الکمال'' اور

محمد عوفی نے ''لب الالباب'' میں لکھا ہے کہ انھوں نے عربی، فارسی اور ہندوی میں تین یادگار دیوان چھوڑے ہیں۔ وہ لاہور میں رہتے تھے اور اس زمانے میں کچھ لوگ پنجاب کی زبان کو ''ہندوی'' بھی کہتے ہوں گے۔ ان کا ہندوی دیوان دستیاب نہیں ہے لیکن چونکہ وہ لاہور میں رہتے تھے اس لیے یہ کہا جا سکتا ہے کہ انھوں نے لاہور کی زبان میں شعر کہے ہوں گے جس کو پنجابی ہی کہا جا سکتا ہے۔اس طرح خواجہ مسعود سعد سلمان (1046تا1121) پنجابی کے پہلے شاعر تھے۔ ان کے بعد پنجابی شاعری کے سلسلے میں بابا فرید الدین مسعود گنج شکر (1174تا1265) کا نام آتا ہے۔ان کے اشلوک سکھوں کی کتاب ''آد گرنتھ'' میں موجود ہیں۔ یہاں ضمناً یہ ذکر کیا جا رہا ہے کہ ہندو ادب نے ''رامائن'' اور ''مہا بھارت'' دو عظیم منظوم داستانیں دی ہیں۔ رامائن میں موجود واقعات کو تقریباً1000 سال قبل مسیح سے منسوب کیا گیا ہے لیکن اس کو مرتب کرنے کا زمانہ بعد کا ہے اور اس کا مصنف شہرت یافتہ شاعر ''والمیکی'' تھا۔دوسری داستان مہابھارت کا تعلق تقریباً1200 قبل مسیح سے ہے۔اس منظوم داستان میں عظیم جنگ کی کہانی بیان کی گئی ہے۔

یہ بات طے ہے کہ جب تک پنجابی کے پاس بابا فرید گنج شکر، وارث شاہ، شاہ حسین، بلھے شاہ، سلطان باہو اور میاں محمد بخش موجود ہیں، اس زبان کو کہیں سے کوئی خطرہ نہیں تاہم یہ بات زبان کے بولنے اور سننے کی حد تک ہے۔ لکھنے کے معاملے میں سکھوں نے ''گورمکھی'' کے ذریعے اپنی زبان کا تحریری صورت دی اور وہ اس رسم الخط کے ذریعے پنجابی کی تمام آوازوں کو تحریر کرنے کی خصوصیت کی وجہ سے مشرقی پنجاب میں کامیابی سے استعمال کرتے ہوئے ادب تخلیق کر رہے ہیں۔ گورمکھی رسم الخط سے ناآشنا پنجابی بولنے والے مسلمان گورمکھی سے کٹ گئے اور شاہ مکھی رسم الخط سے ناآشنا سکھ شاہ مکھی سے کٹ گئے۔ شاہ مکھی رسم الخط تمام تر اردو حروف تہجی پر مشتمل ہے لیکن حقیقت یہ ہے کہ اردو کے حروف تہجی پنجابی زبان کی ضرورت پوری کرنے کے لیے ناکافی ہیں۔ کم از کم پانچ صوتی حروف ایسے ہیں جو پنجابی کو شاہ مکھی میں لکھنے کے لیے درکار ہیں لیکن شاہ مکھی صدیوں سے ان پانچ حروف سے محروم ہے۔ پنجابی زبان وادب کی ترویج کے لیے قائم ادارے عموماً اور پنجاب انسٹی ٹیوٹ آف لینگوئج آرٹ اینڈ کلچر خصوصاً اس چیلنج کو پورا کرنے میں ناکام رہا ہے۔ پنجابی زبان کو پنجابیوں کی تمام تر بے اعتنائی صدیوں نقصان نہیں پہنچا سکی کیونکہ اسے عوامی مقبولیت پنجابی شاعری نے عطا کی ہے۔ جس زبان میں بابا فرید کے اشلوک، وارث شاہ کی ہیر، شاہ حسین اور بلھے شاہ کی کافیاں اور سلطان باہو کے ابیات ہوں اسے مضبوطی اور دوام کے لیے کسی اور چیز کی شاید ضرورت بھی نہیں ہے۔(3)

پنجابی کلاسیکی شاعری

کلاسیکی شعرا

پاکستان پنجابی ادبی بورڈ نے پنجابی زبان کے بہت سے نامور اور گمنام شاعروں اور نثر نگاروں کی کتابوں کو شائع کیا ہے۔ان تصانیف کے بارے میں بات کرنے سے پہلے ان عظیم ہستیوں اور ان کی تصانیف کے بارے میں چند معلومات بھی دی جا رہی ہیں جن سے پڑھنے والوں کو ان ہستیوں کی زندگی اور تصانیف کے بارے میں آگاہی ہو گی۔ کوشش یہ کی گئی ہے کہ کتابوں کو اسی ترتیب سے شامل کیا جائے جس ترتیب سے یہ شائع کی گئی ہیں۔

پاکستان پنجابی ادبی بورڈ کی طرف سے چھاپا جانے والا کلاسیکی ادب

بابا فریدؒ

بابا فرید الدین گنج شکرؒ 1173 میں ملتان کے ایک قصبے کوٹھے وال میں پیدا ہوئے تھے۔ کہا جاتا ہے کہ ان کے آباو اجداد کابل کے فرخ شاہ کی اولاد سے تھے۔ سیر العارفین (تصنیف 1311ھ مطبوعہ رضوی دہلی) کے مصنف حامد بن فضل اللہ جمالی کہتے ہیں کہ بابا فریدؒ کے والد شیخ شعیب سلطان محمود غزنوی کے بھانجے تھے جو شہاب الدین غوری کے زمانے میں ملتان کے قصبہ کھوتووال میں آکر آباد ہوئے۔ بعض روایات کے مطابق ان کے دادا ہجرت کر کے لاہور آئے اور اس کے بعد کچھ وقت قصور میں گزار کر کھوتوال چلے گئے۔

بابا فریدؒ نے زندگی کو ذاتیات سے بالاتر ہو کر عوام کے دکھوں کے حوالے سے دیکھا۔ بابا فریدؒ ملتان میں منہاج الدین کی مسجد میں زیر تعلیم تھے جہاں ان کی ملاقات جناب بختیار کاکیؒ سے ہوئی اور وہ ان کی ارادت میں چلے گئے۔ اپنے مرشد کے حکم پر قندھار اور دوسرے شہروں میں تعلیم حاصل کرنے کے بعد دلی پہنچ گئے۔ مرشد کی وفات پر ان کو چشتیہ سنگت کا سربراہ بنا دیا گیا۔ معین الدین چشتیؒ اور بختیار کاکیؒ کے بعد بابا فریدؒ چشتیہ سنگت کے تیسرے سربراہ تھے۔ کہا جاتا ہے

کہ ان کو دلی کی شان و شوکت پسند نہیں تھی جس وجہ سے وہ پہلے ہانسی اور پھر اجودھن یا پاک پتن میں آباد ہو گئے لیکن کچھ روایات ایسی بھی ہیں کہ دلی اور اس کے گرد و نواح کی چشتیہ اشرافیہ کو ملتان کے ایک نوجوان کی سربراہی قبول نہیں تھی۔ اس لیے ان کے خلاف سازشیں ہو رہی تھیں جس وجہ سے وہ پاکپتن تشریف لے آئے۔ شاید دونوں باتیں ہی درست ہوں کہ ان کے خلاف سازشیں بھی ہو رہی ہوں اور ان کو اپنے دیس کی عوامی زندگی بھی پسند ہو۔ وہ کہتے ہیں ;

فریدا برے دا بھلا کر غصہ من نہ ہنڈا   دیہی روگ نہ لگیے، پلے سب کجھ پا

(فریدا، برے کا بھلا کر تا کہ تمہارا دل غصے کے تصرف میں نہ چلا جائے، غصے کی نظر نہ ہو جائے۔ اگر تم جسم کو روگ نہیں لگانا چاہتے ہو تو سب غصے والی چیزیں سمیٹ لو)۔

پاکپتن اس زمانے میں تجارتی شاہراہ پر ایک اہم مقام تھا اور دریائے ستلج کو یہیں سے پار کیا جاتا تھا۔ یہ بات حادثاتی نہیں ہے کہ پنجابی کے دوسرے کلاسیکی دانشوروں نے تجارتی مقامات پر زندگی گزاری جہاں ان کو دنیا کے بارے میں اطلاعات ملتی رہتی تھیں۔ بہت سی تاریخی دستاویزات سے پتا چلتا ہے کہ بہت سے عالم دور دراز سے گرائمر اور زبان دانی کے مسائل حل کرانے کے لیے بابا فریدؒ کے پاس پاکپتن آتے تھے۔ پاکپتن کی عوامی زندگی بھی کوئی آسان نہ تھی کیونکہ وہاں بھی مذہب کا ٹھیکیدار قاضی موجود تھا جو ان کو ہر طرح سے تکالیف پہنچانے کے لیے تیار رہتا تھا۔ اس کے اکسانے پر لوگ آپ کی اولاد کو آزار پہنچاتے تھے لیکن بابا فریدؒ کچھ زیادہ توجہ نہ دیتے تھے۔ قاضی کو اس پر بھی چین نہ آیا اور اس نے ملتان کے علما کو اطلاع دی اور سوال کیا کہ کیا یہ جائز ہے کہ ایک شخص جو خود کو اہلِ علم اور درویش کہلوائے، ہمیشہ مسجد میں رہے اور وہاں گانا سنے اور رقص کرے۔

ان مشکلات کے باوجود بابا فریدؒ نے زندگی کو ذاتیات سے بالاتر ہو کر عوام کے دکھوں کے حوالے سے دیکھا۔

میں جانیا دکھ مجھ کو دکھ سبھائے جگ   اچے چڑھ کے ویکھیا تاں گھر گھر ایہو اگ

(میں سمجھا تھا کہ دکھ صرف مجھے ہی ہے لیکن دکھ تو سارے جہان کو ہے۔ اوپر چڑھ کر دیکھا تو پتا چلا کہ گھر گھر یہی آگ سلگ رہی ہے)۔

بابا فریدؒ کو عوام کے ساتھ ذاتی اور نظریاتی دونوں ہی اعتبار سے محبت اور پیار تھا۔ وہ کہتے ہیں؛

فریدا خالق خلق میں، خلق وسے رب ماہنہ   مندا کس نوں آکھیے جاں تس بن کوئی ناہنہ

(فریدا خدا مخلوق میں اور مخلوق خدا میں جا گزین ہے۔ کس کو برا کہیں جب تمہارے بغیر کوئی نہیں ہے)

فریدا خاک نہ نندیئے خاکو جیڈ نہ کوئے   جیوندیاں پیراں تھلے، مویاں اپر ہوئے

(فریدا خاک کی ناقدری نہ کرو کیونکہ زندگی میں اس پر کھڑے ہوتے ہیں اور مرنے پر یہ اوپر سے ڈھانپتی ہے)

بابا فریدؒ 93سال کی عمر پا کر 1266 میں رخصت ہوئے۔ انھوں نے خود ہی کہا تھا؛

کندھی اتے رکھڑا کچرک بنھے دھیر   کچے بھانڈے رکھیے کچر تائیں نیر

(دیوار پر اگا درخت کب تک حوصلہ مند رہیگا۔ کچے برتن میں کب تک پانی سنبھالا جا سکتا ہے)۔ ایسے قادر الکلام شاعر کے کلام پر پاکستان پنجابی ادبی بورڈ نے مندرجہ ذیل عنوان سے کتاب چھاپی ہے۔

1۔ آکھیا بابا فریدؒ نے (محمد آصف خاں)

اس کتاب کا پہلا ایڈیشن 1978 میں چھپا تھا۔ اس کتاب کے مصنف محمد آصف خاں نے بابا فریدؒ کی زندگی کے بارے میں مختلف عنوانات کے تحت بیان کیا ہے جیسے ''جمن تے مرن'' میں ان کی پیدائش اور وفات کے بارے میں مختلف مصنفین کی طرف سے بتائی گئی تاریخوں کا ذکر کیا گیا ہے اور اس کی وضاحت کرنے کے لیے اڑتالیس حوالے دیے ہیں۔ ''جمن بھوئیں تے وڈکے'' ان کی جائے پیدائش اور بزرگان سے متعلق ہے۔ محمد آصف خاں نے یہ بھی بتایا ہے کہ وہ حضرت عمر تعالٰی کی اولاد نہیں تھے۔

''ایہناں ساریاں گلاں توں ایہہ نکھڑ تے نتر کے ساہمنے آجاندا ہے کہ بابا فرید دا کرسی نامہ اکا ای غلط ہے لکھیاراں تے ایہہ تیار کرن لگیاں کجھ اجیہے بھلیکھے پائے ہن کہ ہن اوہناں نوں دور نہیں کیتا جاسکدا''۔ (4)

''شلوکاں دے پڑاء تے پندھ'' میں انھوں نے بابا فریدؒ کے اشلوکوں کے بارے میں وضاحت کی ہے کہ یہ کن کن ہاتھوں سے ہو کر ہم تک پہنچے ہیں اور ان کو کس طرح سے محفوظ کیا گیا۔ ''کیہ ایہہ شلوک بابا فرید دے ہن'' میں اس

بات کی وضاحت بھی کی ہے کہ یہ اشلوک ابراہیم فرید ثانی کے نہیں ہیں اور اپنی رائے کو ثابت کرنے کے لیے اٹھاون حوالہ جات درج کیے ہیں۔

''دکھ دی گل ایہہ ہے کہ اساں مسلماناں مقدس ویداں نوں پڑھنا چھڈیا کیوں جو ہندواں نے اوہناں نوں آپنیاں مذہبی کتاباں وچ سبھ توں اچی تھاں دتی سی۔ جد کہ جے ایہناں ویداں نوں خاص کر کے ''رگ وید'' نوں دھیان نال پڑھیا جاوے تاں پنجاب دی سماجی، اقتصادی تے سیاسی تاریخ وڈے پسریویں نال اگھڑ کے ساہمنے آوندی ہے''۔(5)

''کجھ بھلاں بارے'' میں شلوکوں کے بارے میں بہت سے لوگوں کے شکوک دور کیے گئے ہیں۔ ''گورو گرنتھ صاحب توں باہرلے شلوک'' میں یہ بتایا گیا ہے کہ بابا فریدؒ کی شاعری کو محفوظ رکھنے کا ذریعہ ''گرو گرنتھ''، ہی نہیں بلکہ دیگر حوالے بھی ہیں۔ ''شلوک کیہ ہے'' میں شلوک کی صنف کی وضاحت کی گئی ہے۔ ''بولی'' کے عنوان کے تحت بابا فریدؒ کی زبان پنجابی کا پس منظر اور لسانی گروہ بیان کیا گیا ہے۔ آصف خان نے ایک سو پچپن (155) شلوک اور ان کے مشکل الفاظ کے معنی دینے کے بعد ''کجھ ہور شلوک'' (گورو گرنتھ صاحب توں باہرے) میں تراسی (83) مزید شلوک بھی درج کیے ہیں۔ 'ایم مسعود' صدر، پاکستان پنجابی ادبی بورڈ نے ''پہلی گل'' میں لکھا ہے؛

''آکھیا بابا فرید نے'' وچ شامل سرلیکھاں دی کھوج تے پن چھان کر دیاں خان صاحب نے چار سال گھالنا کیتی ہے۔ اوہناں نے شلوکاں دا متن ای نہیں شامل کیتا سگوں ورتے گئے لفظاں دے معنی دین دے نال نال دوجے کلاسیکی شاعراں دے کلام وچوں ونگیاں دے کے ایس کتاب نوں ہور وی لاہے وندا بنادتا ہے''۔ (6)

مولوی غلام رسول عالمپوری

مولوی غلام رسول عالمپوری 1849 میں ہوشیار پور کے گاؤں عالمپور میں پیدا ہوئے۔ والدہ کی وفات کے بعد ان کے والد نے ان کو ماں کا پیار بھی دیا۔ ابتدائی تعلیم اپنے گاؤں میں حاصل کی اور مزید علم حاصل کرنے کے لیے دلی گئے اور سجادہ نشین حضرت نظام الدین اولیا کے شاگرد سے روحانی اور باطنی علوم حاصل کیے۔ گاؤں واپس آ کر ایک سکول میں مدرس ہو گئے لیکن پھر ملازمت ترک کر کے مسجد کی امامت اور حکمت شروع کر دی۔ میدان خطابت میں ان کا کوئی مقابل نہیں تھا لیکن انھوں نے حکمت میں بھی خوب نام کمایا۔ ان کی طبیعت شاعری کی طرف اس قدر مائل تھی کہ ایک ہی نشست میں سیکڑوں شعر لکھ جاتے تھے۔ ان کی تصنیفات میں احسن القصص، داستان امیر حمزہ وغیرہ شامل ہیں۔ آپ نے 1892 میں عالمپور میں وفات پائی اور وہیں دفن ہوئے۔

2۔ احسن القصص (مولوی غلام رسول عالمپوری)

کتاب کے نام سے ہی اس کی عظمت ظاہر ہوتی ہے لیکن اگر اس کو لکھنے والا مولوی غلام رسول عالمپوری جیسا عالم ہو تو اس کی اہمیت اور حیثیت مزید بڑھ جاتی ہے۔ سب سے بڑھ کر یہ قصہ قرآن مجید میں بیان کیے گئے یوسفؑ کے تذکرے پر مبنی ہے اور اس کو احسن القصص کا نام دیا گیا ہے۔ یہ کتاب ''پنجابی ادبی اکیڈمی'' نے 1961 میں چھاپی تھی اور پاکستان پنجابی ادبی بورڈ نے اس کو 1987 میں دوبارہ چھاپا ہے۔ ''قصہ یوسف زلیخا'' بہت سے شاعروں نے بیان کیا ہے لیکن مولوی غلام رسول عالمپوری کا انداز سب سے الگ ہے۔ پنجابی کلاسیکی ادب میں اس کا اپنا مقام ہے اور پاکستان پنجابی ادبی بورڈ نے اس کتاب کو دوبارہ چھاپ کر یقیناً پنجابی زبان کی خدمت کی ہے۔ اس کے دیباچے میں مولوی غلام رسول عالمپوری کی

زندگی اور شاعری کے بارے میں محمد عالم کپور تھلوی کا تذکرہ بھی شامل ہے۔اس کتاب کو مولوی غلام رسول عالمپوری کے اپنے قلمی نسخے کے مطابق چھاپا گیا ہے۔ محمد آصف خاں نے لکھا ہے؛

''ایس کتاب وچ ڈاکٹر باقر تے مرحوم محمد عالم کپور تھلوی ہوراں دے دیباچے وی اِن بِن اُنج دے اُنج رہن دتے گئے ہن۔''(7)

3۔ ہیر چراغ اعوان (عین الحق فرید کوٹی)

پنجابی زبان کی اس پیار کہانی کو پنجابی شاعری میں پہلی بار دمودر نے قصے کی شکل میں لکھا۔اس کے تقریباً ڈیڑھ سو سال بعد احمد گجر نے بیتوں کی شکل میں ہیر لکھی۔ تیرہ برسوں بعد پنجابی شاعر چراغ اعوان نے ہیر کا قصہ نظمایا جس کے بعد حافظ شاہجہان مقبل نے ہیر لکھی۔ اسی طرح سکھ دور میں حامد شاہ عباسی، ہاشم شاہ، ویر سنگھ اور احمد یار مرالوی نے بھی یہ قصہ نظمایا۔

میاں چراغ اعوان کے بارے میں حمید اللہ ہاشمی نے لکھا ہے؛

''میاں صاحب بڑے عظیم شاعر ہیں۔ ہو سکتا ہے کہ انھوں نے کچھ اور بھی تحریر کیا ہو جو زمانے کے بے رحم ہاتھوں سے بچ نہ سکا ہو۔ ہیر چراغ اعوان اپنے دور کی لہندے لہجے کی پنجابی ہے۔اس بولی کو مقامی طور پر ڈیرہ والی اور جٹکی کے نام سے یاد کیا جاتا ہے''۔(8)

پہلی گل میں ہیر کے بارے میں تحریر کیا گیا ہے؛

''ہیر ادب وچ چراغ اعوان تیجے شاعر ہن، جینہاں دمودر توں پچھوں ایس ادب وچ وادھا کیتا تے ایس

دے مگروں مُقبل شاہجہان، وارث شاہ تے حیدر علی اگڑ پچھڑ ہیر اں لکھن دا ہڑھ لے آوندے ہن''۔

(9)

عین الحق فرید کوٹی نے ہیر چراغ اعوان کو صرف شائع ہی نہیں کروایا بلکہ انھوں نے میاں چراغ اعوان کے حالات زندگی بھی بیان کیے ہیں اور جس دور میں انھوں نے یہ ہیر تحریر کی اس کا بھی ذکر کیا ہے۔اس طرح انھوں نے اس وقت کی تاریخ بھی بیان کر دی ہے۔انھوں نے میرن شاہ اور علی حیدر کی سی حرفیوں کے بارے میں واضح کیا ہے کہ ان کو بھی ہیر کا درجہ دینا درست نہیں ہے کیونکہ ان میں مکمل قصہ موجود نہیں ہے۔اس کے بعد انھوں نے دمودر اور میاں چراغ اعوان کی ہیر کا تقابل بھی کیا ہے اور مثال کے طور پر دونوں شاعروں کے کچھ بند بھی دیے ہیں۔اس کتاب میں پنجابی زبان کے مختلف لہجوں مثلاً ملتانی اور سرائیکی کے بارے میں بیان کیا گیا ہے۔لہجہ، بولی اور زبان کا فرق واضح کیا ہے اور مختلف ماہرین لسانیات کے خیالات بھی پیش کیے ہیں۔ گویا یہ کتاب پنجابی زبان کے لسانی ماہرین کے لیے نہایت کارآمد کتاب ہے۔ میاں چراغ اعوان کے قصہ ہیر رانجھا میں 324 اشعار ہیں جن میں سے اصل قصہ صرف چالیس یا پچاس شعروں میں بیان ہوا ہے۔

''جے کر گوہ کر کے ویکھیے تاں ایہدے وچ خالص قصے دے شعر ودھ توں ودھ چالیہ پنجاہ ای ہوسن۔

باقر شعراں وچ ودھیرے کر کے پنجاب دی اوسے دی رہتل دا اک بھرواں نقشہ الیکیا گیا ہے''۔(10)

عین الحق فرید کوٹی نے پنجابی ادب کے گمشدہ خزانے میں سے ایک گوہر کو آنے والی نسلوں کے لیے نہایت محنت سے محفوظ کیا ہے۔ جس سے آنے والی نسلوں کو اپنے ماضی کے نامور شعرا سے شناسائی ہو گی اور یوں وہ ان کے کلام اور اس دور کے بارے میں آگاہی حاصل کر سکیں گے۔ یہ کتاب 1978 میں چھپی تھی۔

4۔ گلزارِ سسی (غلام حیدر مستانہ)

غلام حیدر مستانہ نے سسی پنوں کے قصے کو پنجابی شاعری کی معروف صنف دوہڑے کی شکل میں تحریر کیا ہے کیونکہ وہ اپنی شاعری کے آغاز سے ہی دوہڑے کے شاعر ہیں۔ان کا انداز نہایت عمدہ ہے اور انھوں نے پنجابی زبان میں ایک عشقیہ قصے کو بہت اچھی طرز میں پیش کیا ہے جو کہ پنجابی ادب میں ایک نیا اضافہ کہا جا سکتا ہے اور جس کی مٹھاس پڑھنے والے یقیناً محسوس کرتے ہیں۔ یہ کتاب 1978 میں چھپی تھی جس میں پہلی گل کے عنوان کے تحت ایم مسعود نے ان کی شاعری کو ان الفاظ میں سراہا ہے؛

"ایہناں دی عمر بھر دی دولت کجھ دوہڑے اتے گلزار سسی ہے۔ جیہڑا قصہ شاعری وچ ڈھیر قیمتی وادھا ہے۔لفظالی پاروں وی تے نویاں نویاں اُچ کوٹی دیاں سوچاں تے خیالاں پاروں وی"۔(11)

5۔ کہنداسائیں (افضل پرویز)

احمد علی سائیں پشاوری ہفت زبان شاعر تھے،انھوں نے ہندکو، پشتو،اردو، فارسی، پنجابی، پوٹھوہاری اور کشمیری زبانوں میں شاعری کی اور وہ ان زبانوں پر عبور رکھتے تھے۔ انھوں نے اپنی شاعری میں حسن و عشق، تصوف و معرفت، جمالیاتی لطافتوں اور عالمگیر حقیقتوں کا اظہار خوبصورتی سے کیا ہے۔ غزل، حرفی، چاربیتہ، نظم، رباعی، قطعہ، حمد و نعت، منقبت و سلام، مرثیہ و نوحہ کے ساتھ ساتھ انہوں نے آٹھ کلیوں اور بارہ کلیوں والے بیت زنجیرے بھی لکھے وہ موضوعات کے حوالے سے قادرالکلام تھے۔ تصوف،اخلاقیات، فلسفہ،رموزِ عشق، حسن و خیال،ہجر و فراق اور معاملہ بندی ان کی شاعری کا احاطہ کرتے ہیں۔ حرفی کی صنف کو استاد سائیں احمد علی پشاوری نے بامِ عروج پر پہنچادیا۔ علامہ اقبال نے ان کی سی حرفیاں سن کر انہیں ہندکو، پنجابی کا غالب کہا تھا۔ سائیں احمد علی پشاوری ہندکو زبان کے صوفی شاعر کی حیثیت سے ابھرے۔ صوفیانہ شاعری میں وہ شاہ لطیف بھٹائی، سچل سرمست، رحمان بابا، میاں محمد بخش، وارث شاہ، بلھے

شاہ اور مست توکلی کی صف میں نظر آتے ہیں۔ سائیں پشاوری نے اپنی شاعری میں تصوف اور عشق کی حقیقی منازل کے حوالے سے سی حرفیاں تخلیق کیں۔ان کی شاعری میں بے شمار ہند کو محاوروں کا استعمال شاعری کو خوش کن بناتا ہے۔

اتھے ماردے ٹکراں خیال سائیاں   جھتے پونچ نہ بادِ صبا دی اے

ہر بڑے شاعر کی طرح سائیں پشاوری کو بھی اپنے بڑے شاعر ہونے کا احساس تھا۔ سائیں احمد علی کی 400 حرفیوں کو سب سے پہلے افضل پرویز نے ''کہندا سائیں'' کے عنوان سے کتابی صورت دی بعد میں رضا ہمدانی نے سائیں احمد علی پشاروی کے عنوان سے ان کی تمام شاعری کو یکجا کر دیا۔

حمید اللہ ہاشمی نے ان کے بارے میں تحریر کیا ہے؛

''یہ قزلباش خاندان سے تھے والد کی مادری زبان فارسی اور والدہ کی پشتو تھی۔ان کے گھر میں یہ دونوں زبانیں بولی اور سمجھی جاتی تھیں۔انھوں نے مشہور شاعر رمضو پشاوری کے آگے زانوے تلمذ تہہ کیا۔ پہلے فارسی اور پھر پنجابی میں شعر کہنے لگے''۔ (12)

''انھوں نے بیت کے ایک نئے انگ زنجیرہ یا سولاں کلیا کا بھی آغاز کیا۔اس کا ہر مصرعہ چوہرا ہوتا ہے اور یہ زنجیر سولہ مصروں کی بن جاتی ہے''۔(13)

اس کتاب کے مرتب افضل پرویز نے سی حرفی کے بارے میں معلومات دی ہیں اور اس کے بعد سائیں تے سائیں دا فن کے عنوان سے پشاور کے چند شعرا کی شاعری کا ذکر کیا ہے اور اس کے ساتھ ہی ان کے شاگردوں کا تذکرہ بھی کیا گیا ہے۔یہ کتاب 1978 میں چھپی تھی اور اب تک اس کتاب کے سات ایڈیشن شائع ہو چکے ہیں۔

6۔ جنگ نامہ امام حسین (قریشی احمد حسین قلعداری)

ڈاکٹر قریشی احمد حسین قلعداری نے اس کتاب کو مرتب کیا ہے اور انھوں نے بتایا ہے کہ پنجابی ادب میں "حافظ برخوردار" کے نام کے ایک سے زیادہ شعرا کی مختلف قسم کی بہت سی شاعری موجود ہے۔ حمید اللہ ہاشمی نے اپنی کتاب مختصر تاریخ زبان وادب پنجابی میں لکھا ہے:

"حافظ برخوردار کی شخصیت متنازعہ سی بن چکی ہے۔ بیشتر رجحان یہی ہے کہ ایک حافظ برخوردار پنڈ مسلمانی والا اور دوسرا تخت ہزارے والا ہے۔ پنجابی ادب کے ابتدائی نقادوں نے بھی اس رائے کا اظہار کیا ہے کہ حافظ برخوردار ایک نہیں بلکہ دو تھے۔ ان میں احمد یار مرالوی (احسن القصص) میں، میاں محمد بخش (سیف الملوک) میں اور مولوی دلپذیر (قصص الحسنین) میں دونوں کا ذکر کرتے ہیں"۔(14)

مرتب نے کتاب میں مرثیہ کا مطلب، اس کا آغاز اور ابتدائی مرثیوں کے بارے میں معلومات فراہم کی ہیں۔ اس کے بعد واقعہ کربلا بیان کیا ہے۔ حافظ برخوردار کے نام کے شعرا کے بارے میں خاصی تحقیق کی ہے اور ان کی تصانیف کے حوالے دے کر ان کو الگ الگ شاعر بیان کیا ہے۔ انھوں نے اس جنگ نامے کے بارے میں تحریر کیا ہے:

"ایہہ جنگ نامے پنجاب دے پنڈ پنڈ وچ گھر گھر محرم دے دناں وچ پڑھے جاندے نیں۔ لوک کسے دوکان یا کسے دارے وچ کٹھے ہو بیہندے نیں۔ اک آدمی جنگ نامہ سُر نال پڑھدا اے تے سنن والے اوہدے توں بڑا اثر لیندے نیں"۔(15)

کتاب کے آغاز میں عنوانات کی فہرست مہیا کی گئی ہے۔ جنگ نامے کا آغاز حمد و نعت سے ہو کر خاتمہ کتاب جیسے مختلف عنوانات کے تحت ترتیب دیا گیا ہے۔ اس طرح ایک ترتیب کے ساتھ واقعہ کربلا کو تفصیل سے تحریر کر دیا گیا ہے۔اس کتاب کو1979 میں چھاپا گیا تھا۔

7۔ کلیات لالی(پروفیسر ریاض احمد شاد)

صدیق لالی پنجابی زبان کے ان شعراءمیں شامل ہیں جن کی شاعری اور زندگی کے بارے میں زیادہ معلومات موجود نہیں تھیں لیکن میاں محمد بخش جیسے شاعر نے اپنے کلام میں صدیق لالی کا ذکر کیا ہے۔

ہک صدیق کہاوے لالی مرد بھلا کوئی ہویا

مہتر یوسف دا اس سہرا چُن چُن پھُل پرویا (16)

صدیق لالی کی شاعری اور زندگی کے بارے میں ریاض احمد شاد نے اپنی مرتب کردہ کتاب کے بارہ ابواب میں کافی معلومات دی ہیں۔اس کتاب میں لالی قوم کے بارے میں بھی کچھ معلومات کے ساتھ ساتھ صدیق لالی کے حالات زندگی اور ان کے بارے میں دوسرے شاعروں کے خیالات بھی شامل کیے گئے ہیں۔اس طرح سے انھوں نے صدیق لالی کی سینہ بہ سینہ اور قلمی نسخوں میں موجود شاعری کو پنجابی ادب میں محفوظ کر دیا ہے۔اس کتاب صدیق لالی کی شاعری کو کھوج کر اور ان کی زندگی کے بارے میں نہایت کارآمد معلومات فراہم کی ہیں۔ یہ کتاب1982 میں شائع کی گئی تھی۔

آصف خان نے ریاض احمد شاد کے کام کی تعریف کی ہے اور لکھا ہے؛

''پروفیسر ریاض احمد شاد ہوراں جس محنت تے لگن نال ایہہ کلام اکٹھا کیتا ہے پھیر ایس بارے تے

لکھیار بارے جو بھرواں ویروا دتا ہے،اوس نوں جناوی سلاہیا جاوے،اوہ گھٹ ہے''۔ (17)

8۔پنج تارے (مہر کاچیلوی)

محمد حنیف مہر کاچیلوی نے اس کتاب میں شاہ عبدالطیف بھٹائی، خوشحال خان خٹک، للہ عارفہ، مست توکلی اور سید وارث شاہ پانچ شعرا کا تذکرہ کرتے ہوئے ان کو ستاروں سے تشبیہ دی ہے۔ یہ تمام صوفی شعرا برصغیر کے مختلف علاقوں میں بولی جانے والی مختلف زبانوں کے نمائندہ شعرا قرار دیے جا سکتے ہیں۔ پہلی گل کے تحت محمد آصف خاں نے اس کتاب کے بارے میں تحریر کیا ہے؛

''پاکستان وچ پنج وڈیاں بولیاں ور تیندیاں ہن۔ایہناں دے بُلیلاں وچالے سانجھ نوں ہور پکیرا کرن لئی ضروری ہے کہ ایہناں بولیاں دے سوجھواناں جو کجھ لکھیا ہے اوہ اک توں دوجی بولی وچ پرتایا ونجے۔انج اک دوجے وچ نیڑ آسے اک دوجے دی سنجان ودھے''۔(18)

سندھی زبان کے چوٹی کے شاعر شاہ عبدالطیف بھٹائی کا ذکر پہلے کیا گیا ہے اور چالیس سے زائد صفحات پر ان کی زندگی اور شاعری کے بارے میں بیان کیا گیا ہے۔اس کے بعد پشتو زبان کے خٹک قبیلے کے سردار شاعر کے حالات زندگی اور شاعری کو پینیتیس صفحات پر بیان کیا گیا ہے اور اس کے آغاز میں رحمان بابا کا ذکر بھی کیا گیا ہے۔للہ عارفہ وادی کشمیر سے تعلق رکھنے والی شاعرہ کے بارے میں تیس سے زائد صفحات پر ان کے حالات زندگی اور شاعری کا پنجابی ترجمہ اس کتاب میں موجود ہے۔مست توکلی بلوچستان سے تعلق رکھنے والا ایک شاعر جو عشق کی راہ پر چل پڑا تھا حالانکہ بلوچ روایات اس کی ہر گز اجازت نہیں دیتی تھیں۔اس کی شاعری کو بلوچ ادب میں وہی مقام حاصل ہے جو دوسری مقامی بولیوں میں کسی بھی بڑے شاعر کے کلام کا ہے۔مست توکلی اور ان کی شاعری کے بارے میں تیس کے قریب صفحات موجود ہیں۔پنجابی زبان میں ہیر جیسی لافانی تخلیق پیش کرنے والے وارث شاہ کو پانچویں نمبر پر بیان کیا گیا ہے۔گو چھبیس صفحات وارث شاہ جیسے شاعر کا تذکرہ کرنے کے لیے ناکافی ہیں لیکن پھر بھی کافی معلومات فراہم کی گئی ہیں۔اس کتاب کو پنجابی ادب میں اضافہ تو نہیں کہا جا سکتا مگر اس کی اہمیت اور ضرورت مسلمہ ہے کیونکہ یہ کتاب دیگر علاقائی زبانوں اور ان زبانوں کے نمائندہ افراد

کے بارے میں رہنمائی مہیا کرتی ہے۔اس کے ذریعے پنجابی ادب کے قارئین کو دوسری زبانوں کے ادب اوران کے صوفی شعرا کے بارے میں خاطر خواہ معلومات حاصل ہوں گی۔

9۔ ہیر دمودر (محمد آصف خاں)

دمودر داس ہیر ادب کا ایک اور شاعر ہے جس نے سب سے پہلے پنجابی میں یہ قصہ منظوم کیااور بہت سی جگہوں پر یہ بھی لکھا کہ اس نے یہ واقعہ خود دیکھا ہے۔وہ اپنے بارے میں کہتا ہے کہ اس کا نام دمودر،ذات گلاٹی(ہندو) ہے۔اس نے ہیر کے باپ چوچک کے دلاسا دینے پر سیالوں کے گاوں میں دکان کھولی تھی۔دمودر نے اس کہانی کے اختتام پر ہیر اور رانجھے کا ملاپ کرایا ہے۔اس تخلیق کے بارے میں حمیداللہ ہاشمی نے لکھا ہے؛

> ''دمودر کی یادگار یہی ہیر رانجھا ہے جو اس نے جھنگ کی بولی میں لکھی ہے۔ تمام استعارات و تشبیہات مقامی زندگی سے مستعار ہیں۔ایک مربوط اور مکمل معاشرے کی عکاسی کی گئی ہے۔زبان سادہ ہے اور انداز بیان راست اور بے تکلف ہے۔زیادہ موشگافیاں نہیں کیں۔الفاظ کا بہت عمدہ انتخاب ہے، بھرمار نہیں۔اس سے اس کی قادرالکلامی ظاہر ہوتی ہے جو داستان بیان کی ہے وہ حقائق پر مبنی نظر آتی ہے''۔(19)

> ''دیومالا، کہانی سے مختلف ہوتی ہے، کیوں کہ یہ مظاہر کے بارے میں عقائد پر مشتمل ہوتی ہے اور اس کے کرداروں اور واقعات کو حقیقی سمجھا جاتا ہے۔ دیومالا کو بیان کرنے کے تقاضے بھی دیومالائی ہوتے ہیں، جو ''ہیر دمودر'' میں دکھائی دیتے ہیں، مگر ہمارے یہاں دمودر کو ہدفِ تنقید بنایا جاتا

ہے کہ وہ جھنگ ''تخت ہزارے'' کھیڑوں کے دیس، کوٹ قبولے اور دیگر مقامات پر کیوں کر

موجود تھااور ''اکھیں ڈٹھا'' کے دعوے کیسے درست ہیں؟'' (20)

محمد آصف خاں نے اس کو مرتب کر کے سات حصوں میں تقسیم کیا ہے۔ ہیر دمودر کے 960 بند اور کتاب کے آخر میں لفظوں کے معنی بھی دیے ہیں۔ اس طرح سے پنجابی پڑھنے والوں کو ایک عمدہ کتاب مہیا کی ہے۔ اس کتاب کا پہلا ایڈیشن 1986 میں چھپا تھا۔

10۔ ملتانی مرثیہ (خلش پیر اصحابی)

ملتان کے شعرا کو مرثیہ گوئی میں جدا اور نمایاں حیثیت حاصل ہے۔ مرثیہ شاعری کی ایک ایسی صنف ہے جس کو شہدا کربلا کے واقعات کے لیے مختص کر دیا گیا ہے۔ 320 صفحات پر مشتمل یہ کتاب جو 1986 میں چھپی تھی۔ اس کتاب میں ملتانی مرثیے کے بارے میں کافی تفصیل سے بیان کیا گیا ہے۔ اس کتاب میں تقریباً 110 شعرا کی زندگی اور شاعری وغیرہ کے بارے میں معلومات مہیا کی گئی ہیں۔ ان شعرا کے تذکرے کو تین ابواب میں تقسیم کیا گیا ہے۔ محمد آصف خاں کے مطابق؛

''بورڈ دے ممبراں دی ایہہ چر وکنی ریجھ ہائی کہ کوئی اجیہا سودھن ہار لبھے، جو مرثیاں دی چون دے

نال نال اوہناں دے لکھیاراں بارے بھرپور جانکاری وی دے سکے۔ ایس بھال وچ کئی ورھے لنگھ

گئے۔ اوڑک خلش پیر اصحابی ہوراں دی دس پئی جدوں اونہاں نوں ایس کم لئی ونگاریا گیا تاں اوہناں

بورڈ دی ریجھ مطابق ہتھ والی کتاب ''ملتانی مرثیہ'' جوڑن وچ ڈھل نہ لائی۔'' (21)

شاہ حسینؒ

شاہ حسینؒ پنجابی شاعری کے سلسلے کی ایسی کڑی ہیں جن کے ذکر کے بغیر پنجابی کلاسیکی شاعری کی تاریخ مکمل نہیں ہو سکتی۔ بلاشبہ شاہ حُسینؒ پنجاب کی شعری روایت کا اہم ترین تخلیقی نمائندہ ہے۔ تصوف میں اس کی پیش رفت نے انسانی رشتوں کی سچائی کے ساتھ جوڑ کر اس کے لہجے میں نرمی، مناسبت اور زندگی کا تحرک پیدا کیا۔ بابا فریدؒ کے بعد شاہ حسینؒ ہی وہ قادر الکلام شاعر ہے جس نے پنجاب کے تناظر میں شعری اور وجودی اظہار سے ترکیبی ثقافت کی تشکیل کے لیے بھرپور معاونت کی۔ پنجابی شعریات کو شاہ حسینؒ نے نئے مضامین نئے استعاروں نئی تراکیب سے متعارف کروایا۔ شاہ حسینؒ کے کلام کے بارے میں عام تاثر ہے کہ ان کا کلام صرف کافیوں کی صورت میں ہے لیکن انھوں نے بہت سی نظمیں بھی کہیں ہیں۔ شاہ حسینؒ (1599-1538) کے کلام کی تدوین کے لیے مربوط شعوری اور انفرادی کوششوں کی ابتدا بیسویں صدی کے آغاز سے ہو گئی تھی اور مختلف قلمی بیاضیں، قلمی نسخے اور قلمی مسودے اس باقاعدہ تدوین کی بنیاد بنے۔ مشہور قلمی بیاضوں میں دو کا ذکر ضروری ہے، پہلی بیاض سید شرافت نوشاہی بحروف اردو تھی جو ایک محتاط اندازے کے مطابق 1770 کی حدود میں لکھی گئی۔ دوسری بیاض، مملوکہ پروفیسر دیوندر سنگھ ودیارتھی ہے۔ یہ بیاض اندازاً 1800 کے زمانے میں تحریر ہوئی۔ قلمی نسخوں اور مسودوں کی ایک لمبی فہرست ہے جو پنجاب یونیورسٹی لاہور پنجاب یونیورسٹی چندی گڑھ، خالصہ کالج امرتسر، کتب خانہ بھاشاوبھاگ پٹیالہ اور کئی صاحبان علوم فنون کے ذاتی کتب خانوں کی زینت ہیں۔

کلام شاہ حسینؒ پہلی دفعہ 1901 میں کتابی صورت میں سامنے آیا جب ''شبد شلوک بھگتاں دے'' مطبوعہ مطبع مفید عام لاہور بحروف گرمکھی چھپی ''شبد شلوک بھگتاں دے'' شمالی ہندوستان کے مختلف سادھوں، ناتھیوں، بھگتوں اور صوفیوں کی شاعری کا انتخاب ہے جس میں شاہ حسینؒ کی 130 سے زائد کافیاں شامل کی گئیں۔ شاہ حسینؒ کی کافیوں کا ایک انتخاب میسرز جے ایس سنت سنگھ نے ''کافیاں شاہ حسین کیاں'' 1915ء میں چھاپا اس کتابی صورت میں چھپنے والے انتخاب میں شاہ حسینؒ کی پچیس کافیاں شامل ہیں۔ ان کافیوں میں متن ترتیب اور وزن تینوں سطح پر سقم پایا جاتا ہے۔ 1934ء میں باوا بدھ سنگھ نے مشہور کلاسیکی پنجابی شعرا کا منتخب کلام ''ہنس چوگ'' چھاپا جس میں شاہ حسینؒ کی انیس کافیاں دی گئیں۔ ان میں ایک کافی ''شک پٹیاں بے شک ہوئی'' کسی اور انتخاب کا حصہ نہیں ہے۔

ڈاکٹر موہن سنگھ دیوانہ نے 1942ء میں ''مکمل کلام شاہ حسین لاہوری'' چھاپ کر کلام شاہ حسینؒ کی تدوین کے سلسلے میں ایک کامیاب علمی کوشش کی۔ ڈاکٹر دیوانہ کی یہ تالیف بحروف اردو ہے جو اپنی اشاعت سے لے کر آج تک شاہ حسینؒ کے کلام کے تناظر میں بنیادی حوالہ مانی جاتی ہے۔ شاہ حسینؒ کے حوالے سے بعد میں چھپنے والی تمام کتابیں کسی نہ کسی سطح پر اس کتاب کی طرف ضرور رجوع کرتی ہیں۔ ''حسین رچناولی'' پروفیسر پیارا سنگھ پدم کی تحقیقی کاوش ہے جو 1967ء میں بحروف گورمکھی چھپی۔ اس کتاب بھی شاہ حسینؒ کی کافیوں کا انتخاب ہے جس میں 151 کافیاں ڈاکٹر موہن سنگھ دیوانہ کی تالیف سے ہی لی گئیں مگر گیارہ کافیاں ایسی ہیں جنہیں مؤلف نے دیگر ذرائع سے اکٹھا کیا۔ کچھ شلوک اور کافیاں ایسی بھی ہیں جو ڈاکٹر دیوانہ کے انتخاب میں تو شامل ہیں مگر پروفیسر پدم نے انہیں اپنی کتاب میں شامل نہیں کیا۔ شاہ حسینؒ کی کافیوں کے اس انتخاب میں ''حسین رچناولی'' اس لیے بھی اہم ہے کہ اس میں متن کی اصلاح کی اولین کوششوں کا سراغ ملتا ہے، اوزان کے مسائل کم ہیں، مصرعے رواں اور ترتیب بہتر ہے۔ کافیوں کی ترتیب مضامین کے اعتبار سے رکھی گئی جس کی بنیاد مؤلف کا ذاتی مشاہدہ ہے۔

ڈاکٹر موہن سنگھ دیوانہ کی تالیف ''مکمل کلام شاہ حُسین لاہوری'' کو بنیاد بنا کر 1966 میں ''مجلس شاہ حسینؒ''، نے ''کافیاں شاہ حسین'' کے نام سے شاہ حسینؒ کا کلام چھاپا، اس انتخاب میں کچھ کلام ڈاکٹر دیوانہ کی تالیف کے علاوہ بھی تھا۔ پاکستان پنجابی ادبی بورڈ نے ان کا کلام مندرجہ ذیل عنوان سے شائع کیا ہے۔

11۔ کافیاں شاہ حسینؒ (محمد آصف خاں)

محمد آصف خاں نے 1987ء میں مجلس شاہ حسینؒ کے شائع کردہ انتخاب ''کافیاں شاہ حسینؒ''، کو پنجابی ادبی بورڈ کی طرف سے چھاپا۔ محمد آصف خاں پنجابی زبان وادب کے ساتھ جذباتی علمی اور فکری تینوں سطحوں پر جڑے ہوئے تھے۔ اس کتاب میں ڈاکٹر موہن سنگھ دیوانہ نے ''شاہ حسین دے اصلی تے صحیح شبد تے شلوک'' کے عنوان کے تحت اپنے خیالات کا اظہار کیا ہے۔ شفقت تنویر مرزا نے ''شاہ حسین دی حیاتی'' کے عنوان سے خاصی تفصیلی معلومات فراہم کی ہیں۔ محمد آصف خاں نے کافی کی صنف کو واضح کیا ہے اور اس کے بارے میں بنیادی اور اہم معلومات دی ہیں۔ اس میں شاہ حسین کی 165 کافیوں کو گانے کے لیے مخصوص راگ بھی بتائے گئے ہیں۔

1998 والے اس انتخاب میں محمد آصف خاں نے کچھ ترامیم واضافے کیے، حسب ضرورت ہر کافی کی لغت بنائی اور استھائی کو ہر انترے کے بعد دہرانے پر زور دیا۔ استھائی کو دہرانے کی رمز ہر انترے کے مضمون کو کلیت (Totality) میں استھائی کے بنیادی مضمون کے ساتھ منسلک کرتی ہے۔

شاہ حسینؒ کے متن کے حوالے سے آخری معلوم کوشش "کلام حضرت مادھو لال" کی صورت میں مقصود ثاقب نے کی ہے۔ جس نے محتاط رویہ اپنا کر کئی کافیوں میں بر محل، متن کی غلطیاں اور کمیاں دور کی ہیں۔ مقصود ثاقب نے کافیوں کی لغت میں اضافہ کیا جس سے قاری کو 'کافی' اور 'شاہ حسینؒ' دونوں کو سمجھنے میں کو آسانی ہوئی۔ انھوں نے کافی کے بارے میں کافی وضاحت سے بیان کیا ہے اور اس کتاب میں شاہ حسینؒ کی 165 کافیاں شامل کی ہیں۔ آخر میں مشکل الفاظ کے معنی بھی دیے گئے ہیں۔ پہلا ایڈیشن 1987 میں شائع ہوا۔(22)

بلاشبہ شاہ حُسین پنجاب کی شعری روایت کا اہم ترین تخلیقی نمائندہ ہے۔ تصوف میں اس کی پیش رفت نے انسانی رشتوں کی سچائی کے ساتھ جڑ کر اس کے لہجے میں نرمی، مناسبت اور زندگی کا تحرک پیدا کیا۔ بابا فرید کے بعد شاہ حسین ہی وہ سنگ میل ہے جس نے پنجاب کے تناظر میں شعری اور وجودی اظہار سے ترکیبی ثقافت کی تشکیل کے لیے بھرپور معاونت کی۔ پنجابی شعریات کو شاہ حسین نے نئے مضامین نئے استعاروں نئی تراکیب سے متعارف کروایا۔

12۔ سُکارے (ہاشم شاہ)

ڈاکٹر فقیر محمد فقیر کے مرتب کردہ متن کو "پنجابی اکیڈمی" لاہور کی طرف سے 1963 میں چھاپا گیا اور پھر اس کتاب کو پاکستان پنجابی ادبی بورڈ نے ڈاکٹر محمد باقر، چیئر مین پنجابی اکیڈمی کی اجازت سے 1987 میں دوبارہ چھاپا ہے۔ اس طرح پنجابی کلاسیکی شاعر ہاشم شاہ کا کلام جس میں دوہڑے، ڈیوڑھے، قصہ سسی پنوں اور سوہنی مہینوال شامل ہیں، ان کو پنجابی ادب کے پڑھنے والوں تک پہنچانے کی کوشش کی ہے جس سے ایک عظیم شاعر کی شاعری لوگوں کو شناسائی ہو گی اور پنجابی زبان کی ترویج و ترقی میں مدد ملے گی۔ اس کتاب میں بابائے پنجابی ڈاکٹر فقیر محمد فقیر نے سید ہاشم شاہ کے بارے میں اپنے خیالات کا اظہار کیا ہے۔

وارث شاہؒ

پیر وارث شاہؒ پنجابی زبان کے لافانی شاعر نے جنڈیالہ شیر خان تحصیل و ضلع شیخوپورہ میں سن عیسوی 1722ء کو سید خاندان میں آنکھ کھولی آپ کے والد کا نام سید گلشیر شاہ تھا جو سادات خاندان سے تھے۔ پیر وارث شاہ نے قرآن پاک اور دیگر ابتدائی علوم کی تعلیم آبائی قصبہ جنڈیالہ شیر خان سے حاصل کی اور بعدازاں اپنے خیالات واحساسات کا اظہار کرنے کیلیے پنجابی زبان کا انتخاب کیا۔

وارث شاہ کی پوری شاعری کے آئینے میں پنجاب کی تہذیب وثقافت کا عکس واضح طور پر نظر آتا ہے۔ اس کے ساتھ ان کی شاعری میں اسلامی روایات کا پرچار بھی احسن طریقے سے کیا گیا ہے۔ ''قصہ ہیر رانجھا'' ایک عشق کی داستان ہے جو صدیاں گزر جانے کے باوجود بھی زبان زد عام ہے۔ ہر دور کے مشاہیر نے اس لازوال داستان عشق کو اپنے قلم سے نئی زندگی دی۔ برصغیر پاک ہند میں ''دمودر کھتری''، ''باقی کولابی''، ''شاہجان مقبل''اور دیگر مشاہیر نے اس قصہ کو اپنے اپنے انداز میں صفحہ قرطاس پر بکھیرا مگر اس لازوال داستان کو ''وارث شاہ'' کی شاعری نے ایسالافانی انداز دیا جس سے یہ ''ہیر وارث شاہ'' بن گئی۔

وارث شاہ پنجابی زبان کے سچے وارث ہیں اور آپ کی تصنیف پنجابی ادب کا ایک اجلا، انوکھا اور دل کی گہرائیوں میں اتر جانے والا شاہکار ہے جس میں افسانہ اور شاعری ہی نہیں بلکہ ڈرامہ بھی ہے۔ وارث شاہ کی تصنیف تقریباً تین سو سال قبل کے معاشرہ کے احساس و جذبات کی یوں عکاسی کرتی ہے کہ اس دور کی تہذیبی، ثقافتی، معاشرتی، زندگی کی تصویر نمایاں نظر آتی ہے۔ وارث شاہ کو عربی، فارسی، ہندی، سنسکرت، پنجابی اور دیگر زبانوں پر عبور ہونے کے ساتھ ساتھ حدیث، فقہ، رمل، نجوم، موسیقی، منطق اور فلکیات کے علاوہ اسلامی اور دنیاوی علوم پر بھی مکمل دسترس حاصل تھی۔ اسی وجہ سے وارث شاہ بیک وقت ایک مؤرخ، محقق، ادیب، صوفی اور عاشق تھے اور اسی بے پناہ عشق حقیقی نے آپ کو حضرت وارث شاہ بنادیا۔

کرم ہوئے جے رب شکُور دااے   وارث شاہ روشن ہوئے نام تیرا

عشق حقیقی کے بارے میں پیر وارث شاہ فرماتے ہیں کہ یہ وہ جذبہ ہے جو خالق اور مخلوق کو ایک کرتا ہے اسی سلسلہ میں وارث شاہ اپنی تصنیف میں اپنے حمد یہ کلام میں لکھتے ہیں۔

اول حمد خدائے داوِر دیجئے عشق کیتا سُوجَگ دامُول میاں

پہلے آپ ہی رب نے عشق کیتا تے معشوق ہے نبی رسُول میاں

ہیر وارث شاہ کی لے، عشق کا راگ اور اس کی تشریح لوگوں کے ذہنوں اور دلوں میں انقلاب پیدا کر دیتی ہے۔ پیر وارث شاہ کا شمار بھی ایسی ہی انقلابی ادبی اور کلاسیکی شخصیات میں ہوتا ہے۔

''ہیر وارث شاہ'' کا اب تک کئی زبانوں میں ترجمہ ہو چکا ہے۔ وارث شاہ نے ہیر رانجھا کے کردار اور اپنے نام کو ہمیشہ کیلیے امر کر دیا۔ وارث شاہ کی شاعری میں اتنی چاشنی ہے کہ پڑھنے اور سننے والے اس قدر محو ہو جاتے کہ ان کی زبان سے وارث شاہ کے لیے بے اختیار آفرین کا لفظ نکل آتا ہے۔ وارث شاہ جامع کمالات اور علم کا سمندر رتھے جنھوں نے بظاہر ایک عشقیہ داستان کو مجاز کے رنگ پیش کر کے روحانیت کا درس دیا۔ وارث شاہ نے اپنی تصنیف میں دنیا کے بڑے بڑے مذاہب، مسالک اور ان کے بانیوں کا بھی ذکر کیا وارث شاہ کی تصنیف پنجابی زبان کا انسائیکلوپیڈیا ہے۔ جس میں آپ نے ماں بولی میں دیس پنجاب کی تہذیب و ثقافت کو مختلف پیروں میں سمونے کے علاوہ مذہب، ماحول، رسم و رواج، بودو باش، صنعت و حرفت، حالات، طبّی ادویہ، اسمائے جانور اور ان کی خصیل بیان کر کے دریا کو کوزے میں بند کر دیا۔ وارث شاہ کے پاس الفاظ و تراکیب کا ایک لازوال ذخیرہ موجود تھا جس نے آپ کی تصنیف کو چار چاند لگا دیئے۔ یہی وجہ ہے کہ آپ کی تصنیف میں عربی، فارسی، سنسکرت اور ترکی کے علاوہ دیگر کئی مقامی اور بین الاقوامی زبانوں کے الفاظ نظر آتے ہیں۔

وارث شاہ فن موسیقی سے بھی مکمل طور پر آشنا تھے اور آپ نے اپنی تصنیف میں فن موسیقی کے چھ بڑے راگوں کا بھی تذکرہ کیا۔ وارث شاہ نے ''ہیر'' کے کردار میں عورتوں اور ''رانجھا'' کے کردار میں مردوں کے جذبات کی عکاسی کی۔ روح اور قلبوت کے ذکر کو وارث شاہ نے الفاظ کے زیورات سے آراستہ کر کے لوگوں کے سامنے پیش کیا۔ روح اور قلبوت کے اسی عظیم شہ پارہ کو مکمل کرنے کے بعد جب آپ قصور اپنے استاد کے پاس پہنچے اور استاد نے اس کا مطالعہ کیا تو بہت تعریف کی اور کہا؛

وارث! تم واقعی مونجھ کی رسی میں موتی پروئے ہیں۔

13۔ ہیر وارث شاہؒ (ڈاکٹر محمد باقر)

ہیر رانجھے کی پیار کی کہانی کو بہت سے شعرانے موضوع بناکر اپنے اپنے انداز میں پیش کیا ہے۔اس کہانی کو پنجابی کے علاوہ فارسی،ہندی،سندھی اور دیگر کئی زبانوں میں نظمایا گیاہے لیکن اس بات میں ہر گز کوئی شبہ نہیں ہے کہ اس قصے کو جو شہرت وارث شاہ کی شاعری نے دی ہے وہ آج تک کسی اور کے حصے میں نہیں آئی۔محمد آصف خاں لکھتے ہیں؛

''بھاویں ہیر رانجھے دے قصے نوں کئیاں لکھیاراں پنجابی،فارسی،ہندی،سندھی تے دوجی بولیاں وچ ٹل

لاکے جوڑیاہے پر جو مانتاہیر وارث شاہ نوں ملی ہے،اوہ کسے ہور دے بھاگاں وچ نہیں آئی''۔(23)

یہ قصہ 'باقی کلابی' نے فارسی میں تحریر کیااور 1572 کے بعد پنجاب میں ہیر رانجھاپر تقریباً30 قصے لکھے گئے۔ 1607''گروداس''، 1692سے 1700''احمد گوجر''، ''گرو گوبند سنگھ''، ''میاں چراغ اعوان''، 1710میں ''مقبل''، 1755میں ''وارث علی شاہ'' اور ''حامد شاہ''، 1805''ہاشم احمد یار خاں''، ''پیر محمد بخش''، ''فضل شاہ''، ''ملا شاہ''، ''مولا بخش''، ''بھگوان سنگھ''، ''کشن سنگھ''، ''عارف'' 1882''سنت مضرارہ سنگھ'' 1841اور ''گوکل چند شرما'' سب ہیر رانجھا کے قصہ کے مصنفین ہیں لیکن جو مقبولیت ''وارث شاہ'' کو ملی کسی اور کو نصیب نہ ہوئی کیونکہ اس میں ناٹک کی زبان، مرصع مثنوی،خیال کا نیاپن،ملک کے رسم ورواج،روایاتی ثقافت، سماج اور افراد کے باہمی روابط کا بیان ہے۔اس میں بہت سی ادبی خوبیوں کے ساتھ دیہاتی زندگی کی سچی تصویریں اور منظر نگاری عروج پر ہے۔

پنجاب میں مختلف مزاج، سوچ اور عقیدے کے لوگوں نے اس کتاب سے اپنی مرضی کے مطابق نتیجہ اخذ کیا ہے۔صوفیانہ خیالات رکھنے والوں نے اس میں وحدت الوجود کی تفسیر پائی،مذہبی سوچ والوں نے اس کو حدیث کی مناسبت سے سمجھااور عام لوگوں نے اس قصے کو مزہ لینے کاذریعہ سمجھاہے اور یہاں تک کہ کئی لوگ اس کو پنجابیوں کاقرآن تک کہنے سے نہیں ہچکچاتے۔یقیناًہیر وارث شاہ سمندر کی سی گہرائی کی حامل ہے جس کی تہہ میں بیش بہاموتی موجود ہیں۔یہ نہ صرف

پنجاب کی تہذیب و ثقافت اور تاریخ کی امین ہے بلکہ اس میں زندگی کے ہر طبقہ فکر سے متعلق مواد موجود ہے اور پنجاب میں سب سے زیادہ پڑھی جانے والی کتاب قرار دی جاتی ہے۔ محمد آصف خاں نے "پہلی گل کے عنوان کے تحت لکھا ہے؛

''ایہدے وچ ات گھتنی کوئی نیں کہ پنجاب وچ سبھ توں ودھ پڑھی جان والی کتاب ہیر وارث شاہ ای ہے۔ ایہدے ہن تائیں کئی سودھے ہوئے ایڈیشن وی چھپ چکے ہن''۔ (24)

ہیر کے متن کو صحیح شکل میں شائع کرنے کے سلسلے میں شیخ عبدالعزیز اور شریف صابر نے بھی کوششیں کی ہیں۔ پاکستان پنجابی ادبی بورڈ نے پہلا ایڈیشن جنوری 1988 میں چھاپا تھا۔ ڈاکٹر محمد باقر نے اس کتاب کو مرتب کیا ہے، ان کے مطابق ہیر وارث شاہ کی اس کتاب کو چھاپنے کے لیے 1865 میں Hope Press Lahore کے مالک منشی محمد منیر کے شائع کردہ ہیر وارث شاہ کے پہلے مطبوعہ نسخے سے استفادہ کیا گیا ہے۔ ڈاکٹر محمد باقر نے لکھا ہے؛

''اس کتاب کی اشاعت کے سلسلے میں ڈاکٹر فقیر محمد فقیر نے اصل نسخے کا سارا متن بڑی محنت سے نقل کیا ہے''۔(25)

ڈاکٹر محمد باقر تعارف میں لکھتے ہیں؛

''قیاس کہتا ہے کہ کتابت اور طباعت کی اغلاط کے سوا یہ سارے کا سارا وارث شاہ کا کلام ہے کیونکہ یہ وہ زمانہ ہے جب ابھی اور لوگوں نے ہیر میں تحریف شروع نہیں کی تھی اور منشی محمد منیر کو جو خطی نسخہ دستیاب ہوا وہ بعد کے الحاقی اشعار اور حشو و زوائد سے پاک تھا''۔(26)

بلاشبہ ہیر وارث شاہ پنجابی زبان کا ایسا بیش قیمت سرمایہ ہے جس کو دنیا بھر کی زبانوں میں تحریر ہونے والے ادب کے مقابل فخر سے پیش کیا جا سکتا ہے۔ اس کتاب کو مرتب کرتے وقت نہایت احتیاط سے ایک پرانے نسخے کو بنیاد بنایا گیا ہے

اور اس کے 749 بند ہیں جن کے عنوان فارسی میں ہیں۔ بے شک ہیر وارث شاہ پنجابی زبان کا ایک عظیم شاہکار ہے لیکن کیا وجہ ہے کہ پنجابی زبان پر عبور رکھنے والا شاعر یا اس کے مرتبین بند کا عنوان پنجابی زبان میں نہ لکھ سکے؟ اس کے علاوہ اگر ان عنوانات کی فہرست کتاب کے شروع میں ہو تو پڑھنے والوں کے لیے مزید آسانی پیدا ہو سکتی ہے۔

14۔ کلیات علی حیدر (علی حیدر)(ڈاکٹر فقیر محمد فقیر)

سید علی حیدر ملتانی 1690 میں پیدا ہوئے۔ آپ نے مذہبی اور تصوف کی تعلیم حاصل کرنے کے بعد لوگوں کو وعظ و نصیحت کرنے کے لیے صوفیانہ مسائل کو اپنی شاعری کا موضوع بنایا۔ ان کا زمانہ سیاسی افراتفری کا شکار تھا اور انھوں نے ایسے سیاسی حالات سے بیزاری کا اظہار کیا ہے۔ علی حیدر صوفی شاعر تھے جو پنجابی کلاسیکی ادب میں سی حرفیاں لکھنے والوں میں اونچا مقام رکھتے ہیں۔ اس کتاب میں ان کی چھ سی حرفیاں، ایک نظم، قصہ ہیر رانجھا اور متفرق اشعار شامل ہیں۔ اس کتاب کو بھی ڈاکٹر فقیر محمد فقیر نے مرتب کیا ہے اور انھوں نے بتایا ہے:

''علی حیدر دا کلام سب توں پہلاں اللہ والے کی قومی دکان، لہور دے مالک ملک فضل الدین نوں چھاپن دا خیال آیا سی۔ اوہناں علی حیدر دی اولاد وچوں غلام میراں توں 1956 وچ مسودہ لیا تے ایس نوں 1957 وچ چھاپے چاڑھیا''۔(27)

پاکستان پنجابی ادبی بورڈ نے 1988 میں یہ کتاب شائع کی تھی اور اس کے متن کے بارے میں تبصرہ یوں ہے؛

''اساں ویکھیا ہے کہ دوناں ایڈیشناں وچ ڈھیر ساریاں بھلاں ہن۔ پر ہن ویلا اینا لمیرا بیت چکیا ہے کہ ایہہ بھلاں نہیں مکائیاں جا سکدیاں۔ جتھے لوڑ پئی ہے املا وچ سودھی اساں اپنے ولوں ضرور کر دتی اے۔(28)

پنجابی شاعری کی ایک معروف صنف وار کا تعارف اور پس منظر

''وار'' کے لفظی معنی رزمیہ نظم کے ہیں۔ یہ ایک ایسی طویل نظم ہوتی ہے جس میں کسی بہادر شخص یا قبیلے کی بہادری کی تعریف کی گئی ہو اور اس کی جرات اور شجاعت پر واری صدقے ہونے کا اظہار کیا گیا ہو۔ ان کا یہ کام نیک اور اچھائی پر مبنی ہونا چاہیے اور اس کا مجموعی تاثر جوش کا ہونا چاہیے نہ کہ غم کا ورنہ مرثیہ کہلائے گا۔ وار یا جنگ نامہ دنیا کے تمام قبائلی اور زرعی معاشروں کا حصہ رہا ہے مثلاً فرانس کے بادشاہ شارلیمن کے بھانجے رولینڈو کے نام پر ''سانگ آف رولینڈو''، جو مسلمان اور باسک لشکر کے ہاتھوں سپین میں مارا گیا اور یورپ کے گویے اس کی بہادری کے قصے صدیوں تک گاتے رہے۔ عرب میں تقریباً اسی انداز میں لشکر کے عقب میں رجز پڑھے جاتے تھے۔

پرانے زمانے میں پنجاب میں قصے اور رومانوی داستانیں چوپال میں سنی جاتی تھیں، وار میدانِ جنگ میں سنائی جاتی۔ یہ روایت دنیا کی دیگر کئی زبانوں میں موجود ہے۔ جب سورما میدانِ جنگ میں لڑ رہے ہوتے تھے تو میراثی، راگی یا ڈھاڈی ان کے اجداد کے کارنامے انہیں بلند آواز میں سناتے تھے جنہیں وار کہتے تھے۔ پنجاب میں وار کی تاریخ بہت قدیم ہے اور یہ سلاطین کے عہد سے پہلے چلی آ رہی ہے۔ ان واروں میں قدیم پنجاب کی عام زندگی کی تمام تاریخ موجود ہے۔ مثلاً سماج کی کیا اخلاقی اقدار تھیں، بہادری کا میعار کیا تھا اور دھوکہ دہی کیا تھی۔ سچ کیا تھا اور سچ کے لیے مرنا کیا۔

بعد میں ان واروں میں جنگوں کے علاوہ عشق کی داستانیں بھی سنائی جانے لگیں۔ صوفی مزاج گانے والوں کے مطابق یہ بھی سماج کے جامد رویوں کے خلاف بغاوت کی ایک شکل تھیں۔ وار گانے والے کھڑے ہو کر گاتے ہیں اور اسے دو واضح حصوں میں تقسیم کیا جاتا ہے۔ نثری بیانیہ حصے میں کہانی کو واقعات کی اہم تبدیلیوں کے ذریعے آگے بڑھایا جاتا ہے اور شعر، بند یا بحر میں بندھے ہوئے حصے کو گا کر سنایا جاتا ہے۔ واریں گانے والے روایتی چمک دمک والے بھڑکیلے لباس پہن کر میدان میں اترتے ہیں اور موضوع کی مناسبت سے اداکارانہ انداز میں روایتیں بیان کرتے ہیں۔ داستان کے المیہ، طربیہ، پُرجوش اور جنگی حصوں کے ساتھ ساتھ بیان کرنے والے کی شخصیت اور انداز بدلتا رہتا ہے جو انہیں کرداروں اور اس لمحے کی حقیقت کے قریب تر لے جاتا ہے۔

واروں کواقسام کے لحاظ سے تین گروہوں میں تقسیم کیاجاسکتاہے

1۔رزمیہ 2۔رومانی 3۔مذہبی

کربلادی وار، مرزے دی وار، دلا بھٹی دی وار، ملتان شہر دی وار، سید دی وار، سکھاں دی وار، نادر شاہ دی وار وغیرہ چند مشہور پنجابی واریں ہیں۔

ایک دلچسپ امر یہ ہے کہ پاکستانی درسی کتب میں پڑھائی جانے والی تاریخ ان واروں کے بالکل برعکس ہے۔ان واروں کے ہیرو اس مذہبی شناخت سے بالکل بالاتر ہیں جو پاکستانی ریاست کا خاصہ ہے۔ یہ سکندرِاعظم سے لڑنے والے ہندوراجہ پورس کے گن گاتی ہیں، مغلوں کو ''چوغتے'' کے طور پر یاد کرتی ہیں اوران کے خلاف لڑنے والے 'دُلا بھٹی' اور 'جیمل پَھتہ' کی بہادری کے قصے سنا کر نوجوانوں کو ان جیسے سورما بننے کی ترغیب دیتی ہیں۔ جیمل پَھتہ ایک آزاد طبع ہندو تھا جس نے اکبر کے بہت سے مطالبے پورے کیے مگر جب اکبر نے اس کی بیٹی کی خوبصورتی کی تعریف سن کر اس کا رشتہ مانگا تو وہ اکبر کے خلاف اٹھ کھڑا ہوا۔

آج کے پنجاب میں ''وار'' کی صنف کا بھی تقریباًاختتام ہو چکا ہے۔زمانہ بدلنے کے ساتھ ساتھ دوسری روایتوں کے ساتھ یہ قدیم روایت بھی غائب ہو رہی ہے۔

15۔ نادر شاہ دی وار (نواب سیال)

نواب سیال نے 45 سال کی تحقیق کے بعد اس کو مکمل کر کے چھپوایا ہے،اس سے پہلے یہ وار نامکمل چھپتی رہی ہے۔ ''نادر شاہ دی وار'' پنجابی رزمیہ ادب کا شاہکار ہے جو پنجابی زبان کے قارئین کے لیے سرمایہ ہو گی۔انھوں نے اس کتاب میں ''نجابت'' کی سینہ بہ سینہ منتقل ہونے والی شاعری کو اکٹھا کر کے مرتب کیا ہے کیونکہ تاحال اس کا کوئی قلمی نسخہ نہیں ملا۔ 'وار' کے بارے میں آصف خان کا تفصیلی مضمون بھی اس کتاب میں شامل ہے۔اس کتاب کا ٹائٹل بھی دیدہ زیب ہے۔پاکستان پنجابی ادبی بورڈ نے یہ کتاب 1989 میں چھاپی تھی۔ پہلے یہ وار نامکمل ہی چھپتی رہی ہے کیونکہ کسی کے پاس بھی نجابت کی وار کا قلمی نسخہ موجود نہیں تھا بلکہ زیادہ تر لوگ سرایڈورڈ میکلیگن کے تحریر کردہ متن کو ہی پیش کرتے رہے ہیں۔ سرایڈورڈ میکلیگن نے یہ وار ایک مراثی سے سن کر نقل کی تھی۔نواب سیال نے شاعر کا آبائی گاؤں، جائے

وفات اور ان کی اولاد کے بارے میں صحیح معلومات فراہم کی ہیں۔ نواب سیال کی تحقیق کردہ وار کے متن کو اس وقت تک حتمی حیثیت حاصل رہے گی جب تک اس کا اصل قلمی نسخہ نہیں ملتا۔ نواب سیال نے الفاظ کے معنی بتا کر بہت سے پڑھنے والوں اور محققین کی مدد کی ہے۔

16۔ کُلیات شاہ عظیم (شاہ عظیم)(ڈاکٹر سعید بھٹہ)

وار پنجابی کی ایسی صنف ہے جس نے پنجاب کی ہزاروں سال پر محیط تاریخ کو اپنے اندر سمو رکھا ہے۔ اس کی ابتدا کے بارے میں یہی بتایا جاتا ہے کہ جب کبھی کوئی بہادر اپنے علاقے پر ہونے والی حملے کو روکنے کے لیے سینہ سپر ہو جاتا تھا تو اس وقت یہ واریں اس کے جوش اور ہمت کو بڑھانے کے لیے اونچی آواز میں گائی جاتی تھیں۔ ان واروں میں عموماً اس بہادر کے بزرگوں کے کارناموں کو بیان کیا جاتا تھا۔ وار پنجابی شاعری میں بہت مشہور صنف رہی ہے۔اس کے بارے میں آصف خان کا کہنا ہے؛

"ادب وچ اوس لمیری نظم نوں وار آکھیا جاندا اے جیہدے وچ کسے تاریخی واقعے نوں رچایا گیا ہوئے"۔(29)

"یہ ایک طویل رزمیہ نظم ہے جس میں کسی قوم خصوصاً اہل پنجاب کی بہادری کے واقعات اور جنگی کارناموں کو بڑے ولولہ انگیز، ڈرامائی اور مخصوص انداز میں پیش کیا جاتا ہے۔ ان کو فخریہ مجلسوں، میلوں، شادیوں اور تہواروں میں گا گا کر سنایا جاتا ہے"۔(30)

"یہ واریں زندگی کی لازوال قدروں کی نشاندہی کرتی ہیں۔ ان رزمیہ نظموں میں بزرگوں، بہادروں یہاں تک کہ نامی گرامی ڈاکوؤں کے گن بھی گائے جاتے ہیں۔ ان کے کارنامے اور بہادری کے قصے بیان کیے جاتے ہیں"۔(31)

''شاہ عظیم''انیسویں صدی کے نامور پنجابی شاعر تھے لیکن ان کا نام ادبی تاریخ میں موجود نہیں ہے۔پروفیسر سعید بھٹہ نے کافی محنت اور تحقیق سے شاہ عظیم کے بارے میں معلومات اکٹھی کی ہیں اور اس کتاب میں ان کے حالات زندگی پیش کیے ہیں۔ ان کی محنت کے طفیل ہی ''شاہ عظیم''کا کلام پنجابی زبان پڑھنے والوں کو دستیاب ہوا ہے۔ کافی عرصے سے ان کے کلام کو تلاش کیا جارہا تھا جو کہ نہیں مل پارہا تھا۔شاہ عظیم کی مظفر خان کی وار کے بارے میں اس کتاب کا پہلا ایڈیشن 1991 میں شائع ہوا تھا۔

بلھے شاہؒ

کی پچھنا ایں ذات صفات میری   اوہو آدم والی ذات میری

نَحنُ اَقرب دے وچ گھات میری

کہنے والے پنجابی زبان کے مشہور و معروف صوفی شاعر 1680 میں پیدا ہوئے۔ان کی جائے پیدائش کے بارے میں اختلاف پایا جاتا ہے۔کچھ لوگ ان کی جائے پیدائش اوچ گیلانیاں بتاتے ہیں اور دوسری روایات کے مطابق وہ قصور کے اک گاؤں پانڈو میں پیدا ہوئے۔ڈاکٹر فقیر محمد فقیر کلیات بلھے شاہ کے دیباچے میں نافع السالکین کے ایک قلمی نسخے کے حوالے سے لکھتے ہیں؛

''بلھے شاہ کے والد سخی محمد درویش علاقہ سندھ کے گاؤں اوچ گیلانیاں میں رہتے تھے۔ یہ گاؤں گیلانی سیدوں نے آباد کیا تھا۔ شاہ محمد ذات کے گیلانی سید تھے۔ بلھے شاہ نے اس گاؤں میں ان کے ہاں جنم لیا اور باپ نے ان کا نام عبداللہ شاہ رکھا''۔(32)

والد کا نام شاہ محمد درویش تھا ابتدائی تعلیم بھی اپنے باپ ہی سے حاصل کی۔اس کے بعد تعلیم قصور شہر میں حاصل کی جہاں ان کے اساتذہ کرام غلام مرتضیٰ اور محی الدین تھے۔ان کے مرشد کا نام شاہ عنایتؒ تھا۔آپ 1785 میں فوت ہوئے۔

بلھے شاہؒ کے کلام میں اس دور کے سیاسی رنگ کی گہری چھاپ ہے۔اورنگزیب کے مرنے اور مرکزی حکومت ختم ہونے کے بعد ملک میں امن وامان کی مخدوش صورتحال نے خانہ جنگی کی صورت اختیار کر لی۔اس صورت حال کی خبر جب نادر شاہ تک پہنچی تو اس نے ہند پر حملہ کر دیا۔1739 میں دلّی پر نادر شاہ کے حملے سے بہت خون خرابہ ہوا۔ابھی اس جنگ کے زخم تازہ تھے کہ 1761 میں نادر شاہ کے جانشین احمد شاہ ابدالی نے پھر ہند پر حملہ کر دیا اور دلّی میں ایک بار پھر خون کی ندیاں بہائی گئیں۔اس کے بعد ملک کے اندرونی حالات خلفشار کا شکار ہو گئے۔اس موقع پر بلھے شاہ نے کہا؛

در کھلا حشر عذاب دا　　　برا حال ہویا پنجاب دا

شاعر تو پیدا ہوتے ہی شاعر ہوتا ہے بنانے سے نہیں بنتا۔اسی مثال کے عین مطابق آپ میں شاعری کا وصف بچپن سے ہی تھا۔

بلھیا! کی جاناں میں کون؟　　　نہ میں مومن وچ مسیتاں

نہ میں وچ کفر دی ریت آں　　　نہ میں پاکاں وچ پلیت آں

نہ میں موسیٰ نہ فرعون

اول آخر آپ نوں جاناں　　　نہ کوئی دوجا ہور پچھانا

میتھوں ہور نہ کوئی سیانا　　　بلھیا اوہ کھڑا اے کون

اپنی شاعری میں وہ مذہبی ضابطوں پر ہی تنقید نہیں کرتے بلکہ ترکِ دنیا کی مذمت بھی کرتے ہیں اور محض علم کے جمع کرنے کو وبالِ جان قرار دیتے ہیں۔علم کی مخالفت اصل میں ''علم بغیر عمل'' کی مخالفت ہے۔بنظر غائر دیکھا

جائے تو احساس ہوتا ہے کہ بلھے شاہؒ کی شاعری عالمگیری عقیدہ پرستی کے خلاف ردعمل ہے۔ ان کی زندگی کا بیشتر حصہ چونکہ لاقانونیت، خانہ جنگی، انتشار اور افغان طالع آزماؤں کی وحشیانہ مہموں میں بسر ہوا تھا، اس لیے اس کا گہرا اثر ان کے افکار پر بھی پڑا۔ ان کی شاعری میں صلح کل، انسان دوستی، اور عالم گیر محبت کا جو درس ملتا ہے، وہ اسی معروضی صورت حال کے خلاف ردعمل ہے۔

حضرت بابا بلھے شاہؒ کی حیات کے بارے میں مصدقہ معلومات بہت کم دستیاب ہیں۔ ابھی تک جو باتیں منظر عام پر آئی ہیں ان میں سے بیشتر کا تعلق زبانی روایت سے ہے۔ ان زبانی معلومات کا تعلق بھی حضرت بابا بلھے شاہؒ کی صوفیانہ زندگی اور کرامات سے ہے شاعری سے بہت کم ہے۔ ان کی زندگی کے بہت سے ایسے واقعات ہیں جن کو مختلف طریقوں سے بیان کیا گیا ہے۔ یہ معلومات جیسی بھی ہیں ان سے حضرت بلھے شاہؒ کی شخصیت کا ایک نقش قائم کیا جاسکتا ہے۔

حضرت بابا بلھے شاہؒ کی جیون کہانی میں تسلسل نہیں ہے، اس کمی کو قیاسات اور کہیں ان کی شاعری کے حوالے سے پورا کیا جاسکتا ہے۔ پرانے تذکروں میں خزینہ الاصفیا، نافع السالکین میں حضرت بلھے شاہؒ کے بارے میں چند ایک معلومات ہیں لیکن ان میں بھی تضاد ہے۔ سب سے پہلے ایک انگریز افسر سی ایف آسبورن نے حضرت بلھے شاہؒ کی زندگی اور شاعری پر ایک کتابچہ تحریر کیا تھا جس میں ان کا سن پیدائش 1680 اور سن وفات 1753 بتایا ہے۔ کلیات بلھے شاہؒ کے مرتب ڈاکٹر فقیر محمد فقیر اس کے دیباچے میں لکھتے ہیں:

> ''بلھے شاہؒ تے پمفلٹ دے منصف مسٹر آسبورن نیں اوہدی تاریخ پیدائش 1680 تے تاریخ
>
> وفات 1785 لکھی اے۔ ایس حساب نال اوہدی عمر اک سو پنج ورہے بن دی اے پر آسبورن صاحب
>
> کول ایس دعوے دا کوئی ثبوت نہیں''۔(33)

پنجابی کے ایک معروف ادیب آصف خان نے ہندوؤں اور سکھوں کی بابا بلھے شاہ سے عقیدت کے حوالے سے اپنے ایک مضمون میں لکھا ہے کہ قصور کے نواح میں جہاں بلھے شاہ مقیم تھے مسلمانوں کے قتل کا بدلہ لینے کے لیے اپنے علاقے سے گزرنے والے ایک سکھ مسافر کو جب مسلمانوں نے قتل کر دیا تو بلھے شاہ اس پر سخت ناراض ہوئے اور بے

قصور سکھ کے قتل کی پُرزور انداز میں مذمت کی۔ آصف خاں کے بقول بلھے شاہؒ کٹڑ مذہبی رجحان کے مالک مسلمانوں، ہندووں اور سکھوں کو ان دشمنیوں کا سبب سمجھتے تھے یہی وجہ تھی کہ اُن کے خلاف مولویوں نے کفر کے فتوے دے رکھے تھے اور روایات کے مطابق جب بابا بلھے شاہؒ کا انتقال ہوا تو مولویوں نے اُن کا جنازہ پڑھانے سے انکار کر دیا تھا۔ آصف خان کہتے ہیں کہ مولویوں کی نفرت کے باوجود آج اڑھائی سو برس بعد بھی بابا بلھے شاہؒ کے مزار پر رونق اس شاعر کے سچے جذبوں کی غمازی کرتی ہے۔

قصور میں بلھے شاہؒ کے مزار پر جو کتابچہ تقسیم کیا جاتا ہے اُس کے مطابق وہ 1680ء میں بہاولپور کے قریب اوچ شریف میں پیدا ہوئے جو اس دور میں اوچ گیلانیاں کہلاتا تھا اور سندھ کا حصہ باور کیا جاتا تھا۔ چھوٹی عمر میں بلھے شاہؒ کے والد کا انتقال ہو گیا تو وہ قصور منتقل ہو گئے۔ ابتدائی تعلیم وہیں مکمل کی اور شاہ عنایت قادری کے مرید ہوئے۔

آصف خان نے ہی بلھے شاہ کا کلام پاکستان پنجابی ادبی بورڈ سے ''آکھیا بلھے شاہ نے'' کے عنوان سے شائع کیا ہے۔

17۔ آکھیا بلھے شاہؒ نے (محمد آصف خاں)

محمد آصف خاں نے اس کتاب میں بلھے شاہؒ کے مستند کلام سے الف بائی ترتیب میں کافیاں، اٹھوارہ، باراں ماہ، سی حرفیاں، گنڈھاں، دوہڑے اور کچھ دوسرا کلام شامل کیا ہے۔ ''پوکھو'' کے عنوان کے تحت محمد آصف خاں کا 32 صفحات پر مشتمل مضمون نہایت اہمیت کا حامل ہے جس میں بتایا ہے کہ بلھے شاہ نے ''فلسفہ وحدت الوجود'' کو کس لیے اپنایا۔

''جیہناں پڑاواں وچوں لنگھ کے صدیاں پہلے سوجھوان وحدت الوجود تائیں اپڑے سن، اوہ بلھے شاہ نوں وسرے ہوئے نہیں سن پر اوس نے ویدانتی تے یونانی فلسفیاں وانگوں دلیلاں توں وی کم لیا ہے اتے نال دے نال قرآن کریم دیاں آیتاں وی لے آندیاں ہن۔ انج اجیہا گھیرا گھتیا ہے کہ بلھے شاہ دی سروچ سرملائی پیندی ہے''۔(34)

محمد آصف خاں نے فلسفہ وحدت الوجود کے بارے میں بیان کرنے سے پہلے سولہ مختلف نظریات کے بارے میں بتایا ہے۔ انہوں نے وحدت الوجود کے قائل مختلف صوفیوں کا تذکرہ بھی کیا ہے۔ محمد آصف خان نے لکھا ہے کہ میں نے اس کلام کی تحقیق کی ابتدا ڈاکٹر فقیر محمد فقیر کی کتاب کو بنیاد بنا کر کی ہے اور اس سلسلے میں جتنے بھی نسخے ہاتھ لگے، ان سے استفادہ کیا لیکن کہیں کہیں اپنی تحقیق سے بھی کام لیا ہے۔(35)

''اس کتاب کا پہلا ایڈیشن 1992 میں شائع ہوا اور اس کتاب کا ایک نسخہ صدر پاکستان، جناب غلام اسحاق خان صاحب ترکی کے دورے پر لے کر گئے تھے جو کہ وہاں دے کر آئے''۔ (36)

محمد آصف خاں ہوری میری اچیچی ودھائی دے مستحق نیں۔ جیہناں نے نہایت عالمانہ انداز وچ ایس کتاب دا اپو کھو لکھیا تے بلھے شاہ دی فلسفیانہ تے صوفیانہ سوچ دے تانے بانے نوں اجاگر کیتا۔'' (37)

18۔ سر سانویں رتی پریت (سعید بھٹہ)

میاں مراد بھٹی مہاراجہ رنجیت سنگھ کے زمانے کا ایک پنجابی شاعر ہے۔ سعید بھٹہ نے نہایت محنت اور تحقیق کر کے اپنی کتاب میں ان کی زندگی اور بھٹی قوم کے بارے میں کافی تفصیل سے بتایا ہے۔ ''میاں مراد بھٹی دی شاعری دا ادبی پچھوکڑ'' میں انھوں نے پنجابی شاعری کی روایت وضاحت سے بیان کی ہے اور کسی بھی زبان کے لوک ادب کے بارے میں ان الفاظ سے اظہار خیال کیا ہے:

''کسے سیانے سچ آکھیا ہے جے کسے زبان دے کھلار دا تول کرنا ہووے تاں اوہدے لوک ادب نوں نیجھ نال پھرولنا چاہیدا اے۔ تدوں ای پتا لگدا اے کہ ایہدے ایرے کتنے ڈونگھے تے ایہدی پستی کیڈی پیڈی ہے''۔ (38)

محقق نے پنجابی زبان کے ایک مایہ ناز شاعر کی زندگی اور شاعری اس کتاب کے ذریعے محفوظ کی ہے اور ان کی یہ کوشش لائق ستائش ہے۔ اپنے خیالات کا اظہار کرنے کے ساتھ ساتھ انھوں نے کتاب کو نہایت اچھے انداز میں مرتب کیا ہے۔ کتاب کے آغاز میں فہرست اور آخر میں مشکل الفاظ کے معنی اور اشاریہ بھی دیا گیا ہے۔ یہ کتاب 1993 میں چھپی تھی۔ پروفیسر غلام شبیر نے پنجابی ادب میں اس کتاب کے بارے میں اپنی رائے دیتے ہوئے لکھا ہے؛

''سعید بھٹا نے بڑھے لوکاں دیاں یادداشتاں نوں اکٹھیاں کر کے ایہہ ہفت خوان طے کیتا اے تے انج پنجابی شاعری نوں ایک بھلیا وسریا شاعر مستقل حیثیت وچ نصیب ہویا۔ ایہہ کلام کتابی شکل وچ آون نال میاں مراد بھٹی گمنامی دے انھیریاں توں نکل کے علمی حلقیاں نال متعارف ہویا تے اوہناں دا کلام اسانوں پڑھن دا موقع ملیا''۔ (39)

خواجہ غلام فریدؒ

''واقف کل اسرار تھیو'' سے آپ نے کافی کی صنف میں ایسی باکمال شاعری کی ہے کہ بلاشبہ ان کی شاعری دنیا کے عظیم ترین کلاسیکی ادب کا اثاثہ ہے۔ خواجہ صاحب عربی، فاسی، سندھی، سرائیکی اور دوسری بھاشاز بانوں میں مہارت تامہ کے مالک تھے۔ سرائیکی شاعری کو جس اعلیٰ مقام پر آپ چھوڑ کے گئے تھے، آج بھی ان سے بہتر نہیں کہا جاسکا۔ لطیف احساسات، جذبات اور اس میں وجدانی کیفیات کو اس طرح ملادینا کہ شیر وشکر ہو جائیں، خواجہ کی شاعری کا ادنیٰ کمال ہے۔ نظریہ تصوف سلسلہ چشتیہ کے عام مسلک کے مطابق آپ کا نظریہ بھی ''ہمہ اوست'' تھا۔ یعنی آپ توحیدِ وجودی کے قائل تھے۔ آپ کا تمام کلام اسی رنگ میں رنگا ہوا ہے۔ انھیں ہر رنگ اور انگ میں اللہ کے حسن کے جلوے نظر آتے۔ بقول پروفیسر دل شاد کلانچوی:

''خواجہ صاحب عموماً حالت وجد میں اشعار کہتے تھے۔یعنی حال وارد ہوتاتوکچھ کہتے تھے ورنہ نہیں۔ہر وقت فکرِ سخن میں محو رہنا ان کا معمول نہ تھا۔لکھنے پر آتے تو الہام کی کیفیت ہوتی۔ بعض اوقات تو لمبی لمبی کافیاں دس پندرہ منٹوں میں کہہ ڈالتے تھے''۔(40)

اکثر کتب میں علما اور فصحا نے لکھا ہے کہ آپ علم موسیقی میں خاصا درک رکھتے تھے۔آپ کو 39 راگ، راگنیوں پر عبور تھا۔آپ نے ان تمام راگنیوں میں کافیاں کہی ہیں۔کافی ایک مشکل فن ہے جو عربی زبان میں تو ملتا ہے مگر دوسری زبانوں میں نہ ہونے کے برابر ہے۔خواجہ صاحب کو عربی، فارسی، ہندی، اردو، مارواڑی، سرائیکی اور پنجابی زبانوں پر عبور حاصل تھا۔ خواجہ صاحب ان ساتوں زبانوں کے علاوہ تاریخ، جغرافیہ، تصوف، فقہ، حدیث، منطق، تفسیر القرآن، علم الرمل، علم النجوم اور شریعت و طریقت کے علوم کے ماہر اور علمِ موسیقی سے بھی شغف رکھتے تھے۔ قوالی کی صنف کے فروغ میں انھوں نے خواجہ معین الدین چشتی اجمیری کی تقلید کی۔ مناظرِ فطرت کے پرستار ہونے کی وجہ سے اپنے خطے روہی سے اتنا پیار تھا کہ اس پر اپنی جان چھڑکتے تھے۔ باذوق سیاح بھی تھے انھوں نے برِصغیر کے سب علاقوں کی سیاحت کی۔1876ء میں حج کی سعادت حاصل کی اور ایک سو سے زائد غریب مریدین کو بھی حج کرایا۔خواجہ غلام فرید 1901ء میں دنیا سے پردہ فرما گئے۔خواجہ صاحب کے اپنے الفاظ میں ''وصل وصال داویلہ آیا''۔ نمونہ کلام

میڈی اج کل اکھ پھرکاندی ہے کئی خبر وصال آندی ہے

انکھیاں بلکن مکھ ڈیکھن کوں گل لاون کو پنجھکن باہیں

19۔ آکھیا خواجہ فریدؒ نے (محمد آصف خاں)

اِے حسن حقیقی نُور ازل۔۔۔ تینوں واجب تے امکان کہوں

تینوں خالق ذات قدیم کہوں تینوں حادث خلق جہان کہوں

تینوں مطلق محض وجود کہوں　　　تینوں علمیہ اعیان کہوں۔۔۔۔

تینوں ہر دل داد لدار کہوں　　　تینوں احمد عالی شان کہوں

تینوں شاہد ملک حجاز کہوں　　　تینوں باعث کون مکان کہوں

کر توبہ ترت فرید سدا　　　ہر شے نوں پر نقصان کہوں

اس کتاب کو شائع کرنے کا سہرا بھی معروف محقق محمد آصف خاں کے سر ہے۔انھوں نے بتایا ہے کہ عمومی طور پر یہ تصور ہے کہ خواجہ غلام فرید نے کافیاں کہی ہیں جبکہ ان کے کلام میں غزلیں اور نظمیں بھی موجود ہیں۔

''اصل وچ خواجہ فرید ہوراں دے کلام وچ کافیاں تو وکھ غزلاں تے نظماں وی ہن''۔(41)

آصف خان نے اس میں خواجہ غلام فرید کی 272 کافیوں کا متن شامل کیا ہے۔اس کے ساتھ ہی انھوں نے کافی کی صنف کے بارے میں کچھ وضاحت کی ہے۔ آصف خان نے دیباچے میں اس کتاب سے پہلے چھپنے والی کتابوں میں موجود کمیوں کی نشاندہی کی ہے۔یہ ایک ضخیم کتاب ہے جس کو 1994 میں چھوٹے اور بڑے دو مختلف سائزوں میں چھاپا گیا ہے۔ یہ کتاب بھی پاکستان پنجابی ادبی بورڈ کی شائع کی جانے والی کلاسیکی شعرا کی کتابوں میں ایک اچھا اضافہ ہے۔

20۔ کلیات خوش طبع (احمد بخش خوش طبع)(فدا حسین فدا)

پاکستان پنجابی ادبی بورڈ نے یہ کتاب 1994 میں چھاپی تھی۔ فدا حسین فدا کی مرتب کردہ اس کتاب میں حضرت خوش طبع کی شاعری میں سے سی حرفیاں، مسدس، معجزہ، باراں ماہ اور متفرق اشعار شامل کیے ہیں۔ مصنف نے حضرت خوش طبع کی زندگی کے بارے میں کچھ معلومات کے ساتھ ان کی شاعری کے بارے میں بھی اظہار خیال کیا ہے۔اس کتاب کی اہمیت کا اندازہ اس بات سے لگایا جاسکتا ہے کہ اس میں آصف خان، ڈاکٹر سید اختر جعفری، شفقت تنویر مرزا، ڈاکٹر محمد باقر

اور ڈاکٹر سراج الدین احمد رانا نے دیباچے میں اپنے خیالات کا اظہار کیا ہے۔ شفقت تنویر مرزا نے مصنف کے کام کو اس طرح سے سراہا ہے:

''پنجابی نال اپنے گوڑھے پیار پاروں اوہناں اک گواچالال احمد بخش خوش طبع لبھ لیا''۔(42)

''رب کرے پنجابی نوں فداور گے ''سیتانی'' وڈی گنتی وچ عنایت ہوون جوایڈی عاجزی، حلیمی تے ستھرے سبھا نال ایڈی وڈے کم کر کے آون والے پنجابیاں نوں پنجابی زبان تے ادب اتے پہلا تے آخری مان کرن جوگا بنا دیون۔'' (43)

21۔ خواجہ فرید دے تعلیمی نظریات (ظفر لاشاری)

خواجہ غلام فرید پنجابی کے ایسے صوفی، دانشور اور شاعر تھے جن کی کافیاں آج بھی لوگوں میں بہت مقبول ہیں۔ ظفر لاشاری نے خواجہ غلام فرید کے تعلیمی نظریات پر مبنی اپنی اس کتاب کو چار ابواب میں تقسیم کیا ہے اور پاکستان پنجابی ادبی بورڈ نے اس کو 1995 میں شائع کیا تھا۔ حضرت خواجہ غلام فرید کا صوفیانہ کلام کافیوں کی صورت میں برصغیر میں شہرتِ دوام رکھتا ہے۔ ان کی ہر کافی اپنے موضوع ہمہ اوست اور وحدت الوجود کے اعتبار سے پڑھنے سننے کی چیز ہے۔ خواجہ غلام فرید کی کافیوں کو بین الاقوامی شہرت حاصل ہے۔ ظفر لاشاری نے اس کتاب کے دوسرے باب میں خواجہ غلام فرید کی پیدائش سے لے کر وفات تک کے حالات بیان کیے ہیں۔ تیسرے باب میں خواجہ غلام فرید کے تعلیمی نظریات کے بارے میں وضاحت کی گئی ہے جبکہ چوتھے باب میں خلاصہ، نتائج، سفارشات اور کتابیات ہیں۔

22۔ آکھیا میاں جوگی نے (محمد آصف خاں)

پنجابی زبان اتنے وسیع علاقے کی زبان ہے کہ بہت سے نگینے ابھی لوگوں کی نظروں سے اوجھل ہیں۔ ان میں سے

ایسے ہی ایک قادر الکلام شاعر کے بارے میں آگاہی اور اس کی شاعری کو شائع کرنے کا سہرا پاکستان پنجابی ادبی بورڈ کے سر ہے۔ محمد آصف خاں نے ''پہلی گل'' میں لکھا ہے:

''بورڈ نے 25 جنوری 1978 دے اکٹھ وچ میاں عاقل محمد جوگی دیاں کافیاں چھاپن دا فیصلہ کیتا سی''۔(44)

اس سلسلے میں محمد آصف خاں نے آگرہ سے 1905 میں چھپنے والی کتاب مجموعہ کافیاں ہندی کا ذکر کیا ہے:

''میئیں ہوراں دی کتاب ''مجموعہ کافیاں ہندی'' 1905 دے ناں ہیٹھ آگرہ توں چھپی سی۔ ایس وچ

پرانی املا ورتی گئی سی۔ ایس پاروں لفظاں نوں ٹھیک سنجاننا ڈاڈھا او کھا جاپدا سی''۔ (45)

محمد آصف خاں نے آگرہ سے چھپنے والی کتاب کے بہت سے لفظوں کے بارے میں بتایا ہے کہ وہ پڑھے نہیں جا سکتے تھے۔ اس لیے میں نے میاں فضل فرید لا لیکا اور جاوید احسن خان کی مدد حاصل کی لیکن پھر بھی کچھ الفاظ ایسے تھے جن کے بارے میں تحقیق کی ضرورت ہے۔ 1996 میں ہاشم شیر خان نے دیوان عاقل جوگی کے نام سے کتاب شائع کی اور میں نے جب اس کو دیکھا تو ہر صفحہ اغلاط سے بھرا پڑا تھا۔

''کوئی صفحہ اجیہا نہیں جتھے پنج ست غلطیاں نہ ہون۔ پھیر میاں جوگی تصوف یا ویدانت دیاں جیہڑیاں

اصطلاحواں ورتیاں ہن، اوہ ساریاں دیاں ساریاں غلط لکھیاں گئیاں ہن''۔(46)

میاں عاقل محمد جوگی کے بارے میں جاوید احسن خان نے نہایت عمدہ انداز میں جانکاری دی ہے۔ اس مضمون میں ان کے خاندان، علاقے، تعلیم، شاعری، مرتبے اور زندگی کے حالات کے بارے میں کافی معلومات دی ہیں۔ انھوں نے تحریر کیا ہے:

''میاں عاقل سئیں اردو، فارسی اتے سرائیکی زبان دے باکمال شاعر ہن۔ اردو، فارسی وچ شائق اتے سرائیکی وچ جوگی تخلص کریندے ہن''۔ (47)

میاں عاقل کے شائع ہونے والے کلام کے بارے میں انھوں نے تحریر کیا ہے:

''ملتان دے معروف کتب فروش مولوی خیر الدین صابر ملتانی آپ دے اردو، فارسی اتے سرائیکی کلام دے ترائے مجموعے مطبع الٰہی آگرہ کنوں شائع کرائے ہن''۔(48)

جاوید احسن خان نے مزید بتایا ہے کہ میاں عاقل جوگی خواجہ غلام فرید کے ہمعصر تھے:

''خواجہ فرید سئیں اتے میاں صاحب دے درمیان اکثر خط کتابت رہندی ہئی۔ خواجہ سئیں دے خطوط توں معلوم تھیندا اے جو اوہ میاں عاقل دا کتنا احترام کریندے ہن اتے اوہنیں دے درمیان کتنے گھاٹے تعلقات ہن''۔(49)

اس کتاب میں میاں عاقل محمد جوگی کی 97 کافیاں دی گئی ہیں جب کہ ہاشم شیر خان کی کتاب میں 84 کافیاں شائع کی گئی تھیں۔ وثوق سے کہا جا سکتا ہے کہ یہ پاکستان پنجابی ادبی بورڈ کی ایسی پیش کش ہے جس کے ذریعے نہ صرف پنجابی زبان کی وسعت کا اندازہ ہوتا ہے بلکہ بہت سی گمشدہ کڑیاں سامنے آتی ہیں۔ محمد آصف خاں صاحب کی یہ کاوش قابل تعریف اور پنجابی ادب کا سرمایہ ہے۔

23۔ آکھیا سچل سرمست نے (شفقت تنویر مرزا)

سچل سرمست سندھی زبان کے مشہور شاعر ہیں جو عرف عام میں ہفت زبان شاعر کہلاتے ہیں کیوں کہ آپ کا

کلام سات زبانوں میں ملتا ہے۔ سچل سرمست کی پیدائش 1739ء میں سابق ریاست خیر پور کے چھوٹے گاؤں درازا میں ایک مذہبی خاندان میں ہوئی۔ان کا اصل نام تو عبدالوہاب تھا مگر ان کی صاف گوئی کو دیکھ کر لوگ انہیں سچل یعنی سچ بولنے والا کہنے لگے۔ بعد میں ان کی شاعری کے انداز کو دیکھ کر انہیں سرمست بھی کہا گیا۔ سچل سرمست کی پیدائش سندھ کے روایتی مذہبی گھرانے میں ہوئی مگر انھوں نے اپنی شاعری میں اپنی خاندانی اور اس وقت کی مذہبی روایات کو توڑ کر اپنی محفلوں میں ہندو مسلم کا فرق مٹادیا۔ان کے عقیدت مندوں میں کئی ہندو بھی شامل ہیں۔ سچل سرمست تصوف میں وحدت الوجود کے قائل تھے۔

سچل سرمست نے پنجابی زبان میں بھی شاعری کی ہے اور شفقت تنویر مرزا صاحب کی کوششوں سے ان کا کلام شائع ہوا ہے۔انھوں نے سچل سرمست کی زندگی اور شاعری کے بارے میں اپنے خیالات کا اظہار بھی کیا ہے۔ پاکستان پنجابی ادبی بورڈ نے سچل سرمست کے سب عمدہ اور معیاری کلام کو چھاپ کر پنجابی ادب میں بیش بہا اضافہ کیا ہے۔اس کتاب میں دعا، نعت کے بعد کافیاں، دوہڑے، سی حرفی اور راگوں میں کافیاں دی گئی ہیں۔ پنجابی ادب میں اضافے کے علاوہ اس کتاب کے ذریعے دوسری علاقائی زبانوں سے آشنائی اور قربت بھی بڑھے گی۔ یہ کتاب 1996 میں چھپی تھی۔

24۔ سسی لکھ شاہ (زاہد حسن)

منظوم عشقیہ داستانیں پنجابی ادب میں نہایت مقبول رہی ہیں اور آج تک ان کی مقبولیت اسی طرح قائم ہے۔ سسی پنوں کی داستان کو کئی شعرا نے منظوم کیا ہے اور یہ اس داستان کی خوبی ہے کہ اتنا عرصہ گزر جانے کے باوجود اس کی مقبولیت قائم ہے۔ اس داستان کو منظوم انداز میں پیش کرنے والوں میں میاں نظام دین، شاہ محمد، اسمعیل قلندر، دائم اقبال دائم قلندری، حکیم فضل الٰہی، مولا شاہ، خواجہ غلام فرید وغیرہ شامل ہیں۔اس کتاب میں معروف محقق زاہد حسن نے پنجاب کی مشہور لوک داستان کے بارے میں بھرپور معلومات مہیا کی ہیں۔اس کتاب کو پاکستان پنجابی ادبی بورڈ نے 1996 میں شائع کیا تھا۔

25۔ آکھیا مبارک شاہ نے (سید مبارک شاہ بخاری)(رحیم طلب)

رحیم بخش چوہان جن کا قلمی نام رحیم طلب ہے، انھوں نے ایک ایسے شاعر کی شاعری کو مرتب کیا ہے جس کے بارے میں پنجابی ادب سے اچھی خاصی شناسائی رکھنے والے بھی واقف نہیں ہیں۔ انھوں نے خود تحریر کیا ہے؛

''سید مبارک شاہ بخاری اساڈے وسیب دا اُر لیا شاعر ہے۔ ایں سوہنے شاعر بارے کجھ نہیں آکھ سکدے جو کڈاں پیدا تھیا، کڈاں فوت تھیا تے شاعری کتنی کیتی ہے''۔(50)

انھوں نے مبارک شاہ کے بارے میں خاصی معلومات اکٹھی کر کے اس کتاب میں پیش کی ہیں۔ اس کے ساتھ سید مبارک شاہ کے شاعری کے بارے میں بتایا ہے کہ ان کی شاعری کی پہلا نمونہ دوہڑے کی شکل میں 1906 کا ملا تھا۔ کتاب میں نعت، مولود شریف، سی حرفی، بارہ ماہ، کافی، رباعی اور قطعے کے علاوہ نواب محمد بہاول خان عباسی کی تعریف بھی شامل ہیں۔ یہ کتاب 1979 میں شائع کی گئی تھی۔

شاہ عبداللطیف بھٹائیؒ

پاکستانی زبانوں کی شاعری کو زیادہ معنی، اعتماد دینے اور قبول عام کے درجے پر لانے میں صوفیائے کرام کی خدمات کو نہیں بھلایا جا سکتا۔ وہ رحمٰن بابا کا حوالہ ہو، شاہ حسین کا ذکر ہو یا شاہ عبداللطیف بھٹائی کی انسان دوستی سے بھرپور شاعری ہو شعر و سخن کے یہ سارے سلسلے عام آدمی کے دل و دماغ کو صدیوں سے اپنی گرفت میں لیے ہوئے ہیں۔ جس طرح رحمٰن بابا کا کلام پشتونوں کا حافظ ہے، اسی طرح سندھ کے لوگ شاہ عبداللطیف اور سچل سرمست کی شاعری سے اپنے روز و شب سنوارتے ہیں۔ جس طرح رحمٰن بابا کے کلام کو موسیقی کے کسی بھی گانے کے آغاز میں بطور ''رباعی'' برتا جاتا ہے یہاں رباعی اپنے مخصوص معنوں میں نہیں بلکہ صوفیانہ کلام کے زمرے میں استعمال ہوتی ہے، اسی طرح شاہ لطیف نے سندھی

کلام کو موسیقی میں ڈھال کر روزانہ باقاعدگی سے ریاض کرنے کی جس روایت کی بنیاد رکھی وہ آج بھی پورے سندھ میں رائج ہے۔ شاہ لطیف کا زمانہ اٹھارھویں صدی عیسوی کا ہے۔

سندھی صوفیانہ شاعری میں شاہ عبداللطیف بھٹائی کا مقام بلامقابلہ بلند ترین ہے۔ شاہ لطیف 1689 میں ہالہ میں پیدا ہوئے۔ تعلیم کے حصول اور روحانی فیض حاصل کرنے کے لیے بہت سے صوفیا کے پاس حاضری دینے کے سلسلے میں بہت سے سفر کیے۔ شاہ لطیف جس دور میں سندھ میں شاعری کر رہے تھے، وہ کلہوڑہ حکمرانوں کا دور تھا اور سندھی ادب میں اس دور کو عہد زرین کہا جاتا ہے۔ شاہ صاحب کے کلام میں وحدت فکر، معنوی گہرائی، فکر کی بلندی، اثرانگیزی، سلاست و روانی اور نغمگی موجود ہے۔ اس کے علاوہ ان کے کلام میں حسن و عشق کا بیان بھی ہے اور فراق و وصال کا تذکرہ بھی۔ ان کے اشعار سندھ کی بود و باش کے ترجمان ہیں اور وہ نہایت موثر انداز میں توحید کا سبق سکھاتے ہیں۔ ان کے کلام میں موسیقیت نہایت نمایاں ہے اور شاہ جو رسالو میں ان کا کلام موسیقی کی کسی نہ کسی لے سے موسوم ہے۔ شاہ لطیف نے اپنی شاعری میں عربی، فارسی، سندھی، ہندی، بلوچی، براہوی، پنجابی اور اردو کے الفاظ بھی استعمال کیے ہیں۔ ان کے کلام کا ترجمہ دنیا کی بہت سی زبانوں میں ہو چکا ہے جو ان کے کلام کی عظمت کا ثبوت ہے۔ اسی وجہ سے پاکستان پنجابی ادبی بورڈ نے ان کے کلام کا پنجابی ترجمہ شائع کیا ہے جو شکیل احمد طاہری نے کیا ہے۔

26۔ شاہ جو رسالو (شاہ عبداللطیف بھٹائی) (شکیل احمد طاہری)

''شاہ جو رسالو'' سندھی زبان کے عظیم شاعر شاہ عبداللطیف بھٹائی کی صوفیانہ شاعری کا مجموعہ ہے۔ آپ نے یہ رسالہ بھٹ شاہ کے قریب کراڑ جھیل کے کنارے بیٹھ کر لکھا۔ آپ کے اس رسالے میں وہ شعر شامل ہیں جو آپ نے اللہ تعالیٰ کے عشق میں کہے۔ آپ کے رسالے میں تیس سُر ہیں۔ سندھ میں قرآن اور حدیث کے بعد شاہ کے رسالے کو سب سے زیادہ مانا جاتا ہے۔ شکیل احمد طاہری نے اس کا منظوم پنجابی ترجمہ کیا ہے اور انھوں نے ''مُڈھلی گل'' میں یہ بتایا ہے:

''ایہہ ترجمہ کلیان آڈوانی دے متن نوں ساہمنے رکھ کے کیتا گیااے۔ایہہ اوہناں دے پنجویں اڈیشن دا

نسخہ سی جیہڑا روشنی پبلیکیشنز کنڈیارو نے 1993 وچ چھاپیا سی''۔(51)

ڈاکٹر افتخار بخشی نے شکیل احمد طاہری کے پنجابی ترجمے کو سراہا ہے اور انھوں نے دیگر مترجمین کے تراجم کا اس سے

تقابلی جائزہ بھی دیا ہے۔انھوں نے اس ترجمے کے بارے میں اظہار خیال کرتے ہوئے تحریر کیا ہے:

''مینوں پک اے کہ شاہ جو رسالو دی ایہہ بھرویں چون جس نوں طاہر نے کمال انداز وچ پیش کیتااے،

اہل دل،اہل ذوق واسطے اک نعمت ثابت ہوئے گی''۔(52)

شاہ عبداللطیف کا کلام مختلف سُروں میں ہے،اس لیے مترجم نے مختلف سُروں کے بارے میں معلومات دیتے ہوئے 29 سُروں تذکرہ کیا ہے۔ شکیل احمد طاہری نے ترجمے جیسا مشکل کام بہت محنت سے کیا ہے لیکن اگر مختلف سُروں کے ساتھ شاہ لطیف کے کلام کے بارے میں بھی کچھ مواد شامل کر دیا جاتا تو یہ کتاب مزید بہتر اور کارآمد ہو سکتی تھی۔ یہ کتاب 1997 میں چھپی تھی۔

27۔ چندل پریتی (جاوید گھنجیرا)

اس کتاب میں جاوید گھنجیرا نے میاں غلام علی کھمان کی زندگی اور حالات تفصیل سے بیان کیے ہیں۔ادبی پچھوکڑ کے باب میں انھوں نے 1849 کا اس علاقے کا نقشہ بیان کیا ہے۔آگے چل کر انھوں نے 'چناب'،جس کو 'چندل' کا نام دیا گیا تھا،اس کی لوک اور رومانی داستانوں کے بارے میں لکھا ہے۔اسی باب میں انھوں اس علاقے سے تعلق رکھنے والی بڑی ہستیوں کے بارے میں بیان کرنے کے علاوہ یہاں کے بھولے بسرے شاعروں کا تذکرہ بھی کیا ہے۔ان ہستیوں میں حافظ معزالدین،صدیق لالی،پیلو،حافظ برخوردار رانجھا،نجابت اور بہت سے لوگ شامل ہیں۔

''ڈھولا'' پنجابی شاعری کی انتہائی پسندیدہ صنف ہے اور اس میں ہر طرح کے موضوع کو بیان کیا جا سکتا ہے۔ میاں غلام علی کھمان بنیادی طور پر ڈھولے کے شاعر ہیں۔ اس کتاب میں میاں غلام علی کھمان کے 19 قسم کے ڈھولے شامل کیے گئے ہیں۔ اس کتاب میں دیے گئے ڈھولوں میں سسی پنوں، مرزا صاحباں وغیرہ جیسی لوک داستانیں شامل ہیں۔ جاوید گھنجیرا نے کتاب کے آخر میں الف بائی ترتیب سے مشکل الفاظ کے معنی بھی دیے ہیں جس سے پڑھنے والوں کو سمجھنے میں آسانی ہوتی ہے۔ کتاب میں آنے والے 64 شخصیتوں اور جگہوں کے ناموں کے بارے میں کتاب کے آخر میں کچھ جانکاری دی ہے۔ یہ کتاب 1997 میں چھپی۔ کتاب کے نام کے بارے میں جاوید گھنجیرا نے لکھا ہے؛

''غلام علی کھمان دے ڈھولیاں نوں ہک تھاں اتے اکٹھے کر کے کتاب داناں ''چندل پریتی'' رکھیا۔ مرشد پاک اوہناں نوں چندل پریتی آکھدے ہاین کیوں جو اوہناں نوں چندل (چنہاں) نال انتاں دا پیار ہائی تے اوہ آکھدے ہاین ہئی ایہہ عاشقاں دی ندی اے''۔(53)

28۔ آکھیا بابا نانک نے (بابا نانک)

پاکستان میں بابا گورو نانک کی شاعری کے منتخب حصوں پر مشتمل چھوٹی سی کتاب پہلی مرتبہ 1988 میں شائع کی گئی۔ اس میں آصف خان نے ''پہلی گل'' کے عنوان تحت ایک صفحہ اور شفقت تنویر مرزا نے ''کفر توڑ شلوک نانک'' کے عنوان کے تحت نو صفحات تحریر کیے ہیں۔ آصف خان نے اس بارے میں تحریر کیا ہے:

''ہن بابے نانک دے چونویں شلوک چھاپ کے اسیں ایس بنے دولانگھ پٹی اے۔ شفقت تنویر مرزا ہوراں جنم ساکھیاں دی نثر ول دھیان دوایا اے۔ ہر کھ دی گل اے کہ ایہناں ول پنجابی لکھیاران دا کدے دھیان ای نہیں گیا''۔(54)

میاں محمد بخشؒ

میاں محمد بخشؒ المعروف عارفِ کھڑی شریف سلسلۂ قادریہ کے مشہور صوفی بزرگ تھے۔ آپ پنجابی، عربی، فارسی روایت کے معروف ترین صوفی شاعر بھی تھے۔ آپ کی ولادت 1824 میں بمقام کھڑی شریف، میرپور موجودہ آزاد کشمیر میں ہوئی۔ آپ نے علاقے کی مشہور دینی درسگاہ سمر شریف میں تعلیم حاصل کی۔ حافظ غلام حسینؒ سے علمِ حدیث کی تعلیم حاصل کی۔ اس کے علاوہ حافظ ناصرؒ سے دینی علوم کے ساتھ ساتھ شعر وادب کے رموز سے بھی آشنائی حاصل کی۔ آپ کو عربی اور فارسی زبانوں میں عبور حاصل تھا۔ آپ نے حصولِ علم کے لیے پنجاب بھر کا سفر کیا اور علما اور مشائخ سے فیض حاصل کیا۔ علمی دورے سے واپس آ کر ضلع میرپور ہی میں سائیں غلام محمدؒ کی مریدی میں آ گئے۔ آپ کی دانست میں مرشدِ کامل کا اہم وصف محض صاحبِ کرامات ہونا ہی نہیں، بلکہ حسن واخلاق کی بلندی کو چھونا بھی ہے۔ میاں محمد بخشؒ حاکمانِ وقت سے ہمیشہ دور دور رہتے تھے۔ اکابرین کی سیرت نے ان کی زندگی میں روحانی انقلاب برپا کر دیا تھا۔ وہ موسیقی کے دقیق رموز پر بھی ماہرانہ نظر رکھتے تھے۔ اسی لیے آپ کی شاعری میں موسیقیت بدرجہ اُتم پائی جاتی ہے۔ آپ نے اٹھارہ کتابیں تصنیف کیں، سوائے ایک کتاب ''تذکرۂ مقیمیہ'' جو فارسی زبان میں ہے باقی تمام کتب پنجابی زبان میں تصنیف کی گئی ہیں۔

آپ نے جس عہد میں آنکھ کھولی، وہ بڑا پُرآشوب دور تھا۔ 1857 کی جنگ آزادی، انگریزوں کا کشمیر کو سکھ مہاراجہ کے حوالے کرنا، سکھوں کے پنجاب بھر میں مظالم، یہ تمام واقعات اسی دور میں وقوع پذیر ہوئے۔ آپ کی شاعری، فکر اور مطالعے کے ڈانڈے قرآن وحدیث، فارسی شعراء عطار، رومی، جامی، منصور حلاج اور خواجہ حافظ سے لے کر پنجابی شعراء تک پھیلے ہوئے ہیں۔ آپ نے اپنی شاعری میں تصوّفِ ہندی اور ایرانی روایت کو جذب کر کے ذاتی اور اجتماعی سوز وگداز کے فیضان سے فکر انگیز اور دلکش پیرائے میں ڈھالا ہے۔ ابنِ عربی اور مولانا رومی کی صوفیانہ روایت، پنجابی شاعری کی روایت کے اثر سے دو آتشہ ہو گئی۔ آپ کی تخلیق کردہ مشہور داستان ''سفرالعشق'' جو کہ ''قصہ سیف الملوک'' کے نام سے معروف ہے انہی افکار وتخیّلات کا پرتو نظر آتی ہے۔ آپ کی شاعری کی تین خصوصیات ہیں، سوز وگداز، پند ونصائح کے شائبے کے بغیر لطیف پیرایۂ اظہار اور تمثیلی انداز۔ ابنِ عربی کے فلسفۂ وحدت الوجود کی وہ ایسی

تعبیر کے حامی ہیں، جو ذرّے ذرّے میں جمالِ حقیقی سے روشناس کرواتی ہے۔انسان کو تعصّبات اور فخر و غرور سے بچاتی ہے۔اسی رویے نے آپ کی شاعری میں مزید گہرائی پیدا کی ہے اور فکر کو وسیع اور ہمہ گیر بنایا ہے۔آپ نے خارجی احوال و کوائف کی ترجمانی کے علاوہ من کی دنیا کی سیاحت بھی کی ہے۔ خارجی اور داخلی زندگی ان کی شاعری میں الگ الگ نہیں بلکہ باہم مربوط نظر آتی ہیں۔ان کے مطابق جیتے جی مر جانا اور مر کر بھی جیتے رہنا ہی فقر ہے۔ آپ عمل پر بہت زیادہ زور دیتے تھے، کیونکہ عمل کے بغیر کوئی بھی کام پایۂ تکمیل تک نہیں پہنچتا۔ان کی تصنیف ''سفر العشق'' المعروف ''قصہ سیف الملوک '' کی ساری کی ساری فضا عمل پر ہی قائم کی گئی ہے۔میاں محمد بخشؒ 1907 میں اس جہانِ فانی سے رخصت ہوئے مگر آپ کا مزار آج بھی مرجع خاص و عام ہے جہاں سے ہدایت کے متلاشی فیض حاصل کر رہے ہیں۔

(1)سوہنی مہینوال (2)قصّہ شیخ صَنعان (3)تُحفہ میراں (4)تذکرہ مقیمی (5)نیرنگ عشق

(6)قصّہ شاہ منصور (7)شیریں فرہاد (8)سفر العشق قصّہ سیف الملوک وبدیع الجمال

(9)تحفہ رسولیہ (10)قصّہ سخی خواص خاں (11)مرزا صاحباں (12)ہدایت المسلمین

(13)پنج گنج (14)سَسی پُنوں (15)ہیر رانجھا (16)گلزارِ فقیر۔

مذکورہ سولہ شاہکار میاں محمد بخش کے شعری رشحات ہیں جن کو پڑھنے سے قارئین مصنف علیہ الرحمہ کے شعری جواہر پاروں سے بخوبی مستفیض ہو سکتے ہیں۔مجھے یہ کہنے میں کوئی عار نہیں کہ پہاڑی زبان وادب میں میاں صاحب علیہ الرحمہ وہ واحد شاعر ہیں جن کا بدل پیش کرنا مشکل ہے۔

29۔ قصہ شاہ منصور (میاں محمد بخش) (ڈاکٹر سید اختر جعفری)

ڈاکٹر سید اختر جعفری صاحب نے میاں محمد بخش پر پی ایچ ڈی کا مقالہ تحریر کیا ہے۔مذکورہ کتاب کے سلسلے میں ان

کا کہنا ہے کہ اس کا نسخہ تلاش کرنے میں ان کو خاصی دقت کا سامنا کرنا پڑا۔ انھوں نے 'اپنی گل' کے عنوان کے تحت تحریر کیا ہے:

''میں اک بیلی راہیں سموال شریف دے اوس بزرگ نوں ملیا، جیہناں نے قصہ شاہ منصور نوں اسمانی صحیفے وانگوں لال رنگ دے ریشمی رومال تے جزدان وچ ولھیٹیا ہویا سی۔ پہلاں اوہناں نے قصہ وکھاون توں صاف انکار کر دتا۔ پھیر میرے منتاں ترلے پاون اتے لوکاں دے آکھن تے راضی ہو گئے پر شرط ایہہ رکھی پئی میں اوتھے بہہ کے ای قصہ پڑھاں یاں نقل کراں۔ نال لے جاون دی اجازت نہیں''۔(55)

ڈاکٹر سید اختر جعفری نے اس کتاب میں صرف میاں محمد بخش کا منظوم کردہ قصہ شاہ منصور ہی نہیں بلکہ منصور حلاج کی زندگی اور کتابوں کے بارے میں بھی ذکر کیا ہے۔ اس کے ساتھ منصور حلاج کی کتاب ''کتاب الطواسین'' کا پنجابی ترجمہ بھی شامل کر دیا ہے۔ سجاد حیدر نے 'پہلی گل' میں لکھا ہے:

''ڈاکٹر سید اختر جعفری ہوراں نرا ایس قصے نوں ای نہیں سودھیا سگوں حسین بن منصور حلاج دی حیاتی، اوس دیاں لکھتاں تے وچاراں بارے وی وڈی سواہری گل کتھ ٹوری ہے۔ ہور تاں ہور اوہناں حلاج دی کتاب ''کتاب الطواسین'' دا پنجابی ترجمہ وی نال ای دے دتا اے تاں جو پڑھن ہارے حلاج دے وچاراں نوں پڑھ کے آپ وی اوہناں بارے گوہ کر سکن''۔(56)

نویکلی گل کے عنوان سے سجاد حیدر نے اس کتاب کے بارے میں اپنے خیالات کا اظہار کرتے ہوئے لکھا ہے:

''ہتھلا کم ویکھیے تے بے اختیار مونہوں نکلدا اے شیشہ اک لشکارے دو۔ اک لشکارا میاں محمد بخش
صاحب دے عارفانہ کلام دا اے، جیہڑا دل دیاں انھیریاں گٹھاں وچ لو کردا اے تے دوجا لشکارا اوس
صاحب حال صوفی دی سواہ وچ دبی چِننگ دا اے، جیہڑا اج وی دل نوں نگھ پاندا اے۔ ایہہ قصہ اک
صوفی دی منقبت وی اے تے اک سورمے دی وار وی''۔(57)

میاں محمد بخش نے قصہ شاہ منصور کے نام سے منصور حلاج کے قصے کو 129 بندوں اور 15 شعروں میں بیان کیا
ہے۔ پاکستان پنجابی ادبی بورڈ نے ڈاکٹر سید اختر جعفری کی اس کاوش کو 1999 میں چھاپا۔

30۔ کلیات ہدایت (میاں ہدایت اللہ)(ڈاکٹر فقیر محمد فقیر)

میاں ہدایت اللہ کا کلام پنجابی زبان میں جانا پہچانا ہے۔ ان کے کلام میں سی حرفیاں اور باراں ماہ شامل ہیں۔ ان کا
کلام زیادہ تر دکھ درد بھرا ہے لیکن روانی ایسی ہے کہ آج بھی لوگوں کو یاد ہے۔ ڈاکٹر فقیر محمد فقیر نے کلیات ہدایت اللہ
مرتب کیے ہیں۔

31۔ فرید وچار (زاہد حسن)

زاہد حسن نے پنجابی کلاسیکی شاعری کے لافانی سلسلے کے آخری شاعر خواجہ غلام فرید کے بارے میں مکمل معلومات
فراہم کی ہیں۔ خواجہ غلام فرید کی زندگی اور شاعری وحدت الوجود اور وحدت شہود کی گہری رمزوں سے بھرپور ہے۔ زاہد
حسن نے ان کی پیدائش، آباؤاجداد، تعلیم، دستار بندی، شادی، حج، سفر، ان کے دیوان کی اشاعت اور وفات کے بارے میں
خاصی تفصیل سے بیان کیا ہے۔ اس کتاب کے مرتب نے باون موضوعات پر دس دانشوروں کے تبصروں کو اکٹھا کیا ہے۔
'موازنہ' کے عنوان کے تحت ڈاکٹر الیاس عشقی کا مضمون 'خواجہ غلام فرید تے سچل سرمست' دیا گیا ہے۔ محمد بشیر ظامی نے
'کلام فرید وچ مثنوی سیف الملوک دی جھلک' کے مضمون کو بیان کیا ہے۔ 'کجھ ہور رنگ' کے عنوان میں سات مصنفین

کے مضامین ہیں۔ 'شاعری دے وکھ وکھ پتھ' کے عنوان میں چھ لکھاریوں نے خواجہ غلام فرید کی شاعری کے مختلف انداز پر اپنی اپنی رائے دی ہے۔ یہ مضامین اس سے پہلے مختلف رسالوں میں چھپ چکے ہیں جن میں 'پنجابی ادب' لاہور، 'تماہی پنجابی ادب'، ماہنامہ 'پنجابی زبان'، بزم ثقافت ملتان، ماہنامہ 'حق اللہ' لاہور شامل ہیں۔ان مضامین کو زاہد حسن نے ایک کتاب کی صورت میں یکجا کر کے ''فرید وچار'' جیسی کتاب مرتب کی ہے۔

اس کتاب میں خواجہ غلام فرید کی زندگی اور شاعری کے بارے میں نہایت مفصل اور اہم معلومات موجود ہیں۔ اس کے علاوہ بہت سے دانشوروں کی طرف سے ان کے کلام اور زندگی پر رائے سے خواجہ غلام فرید کے کلام کو سمجھنے میں آسانی ہوتی ہے۔ یہ کتاب پنجابی کلاسیکی شاعری کو پنجابی ادب کے قارئین تک پہنچانے کے سلسلے میں اہم قدم ہے۔

تاریخ ادب

1۔ پنجابی ادب دی کہانی (عبدالغفور قریشی)

پاکستان پنجابی ادبی بورڈ نے یہ کتاب 1981 میں شائع کی تھی۔اس کتاب میں عبدالغفور قریشی نے ان عنوانات ''دیس پنجاب دی کہانی''، ''پنجابی زبان دی کتھا''، ''پنجاب دے لوک گیت''، '' پنجابی شاعری داویروا''، ''بھگتی لہر دی کتھا''، ''پنجابی ادب دی دوروںڈ''، ''پنجاب دیاں سیاسی تے سماجی تحریکاں''، ''پنجابی قصہ کاری''، ''پاکستانی دور دے ادب دا فکری جائزہ''، ''پنجابی ادب وچ پرکھ پڑچول تے کھوج''، ''لکھاریاں دا تذکرہ'' کے تحت مختلف اصناف کو وضاحت سے بیان کیا ہے۔ مصنف نے پنجاب کے لوک گیتوں اور دیگر اصناف کے بارے میں بیان کیا ہے۔انھوں نے اڑھائی ہزار سال قبل مسیح سے لے کر اور 1970 تک کے پنجابی ادب کی تاریخ بیان کی ہے جس میں 347 مصنفین کی زندگی اور شاعری کے بارے میں معلومات دی گئی ہیں۔

اقبال صلاح الدین نے پیش لفظ میں لکھا ہے؛

''جناب عبدالغفور قریشی ہوری ایس میدان دے پرانے تے منے پرمنے گھلاٹیے نیں۔ایسے موضوع تے اج توں کئی ورھے پہلاں اک کتاب لکھ چکے نیں۔قریشی ہوراں دی نویں کوشش سچی پچھو تے پہلی نالوں کدھرے اگے تے کارآمد اے۔ کیوں جے جتھے اوہناں کتاب وچ بہت سارے تحقیقی تے تنقیدی وادھے کیتے نیں، اوتھے اپنی لکھت، پرکھ تے پڑچول دے معیار نوں وی اچا سچا کر کے ایہہ کتاب لکھی اے''۔(58)

یہ کتاب پنجابی ادب کی تاریخ اور تحریر کے مختلف ادوار کو بیان تو کرتی ہے لیکن اس ذریعے سے ہمیں پنجابی ادب میں ہونے والی تبدیلیوں اور مختلف ادوار کی تاریخ بھی معلوم ہو جاتی ہے۔

2۔ گوجری ادب (ڈاکٹر صابر آفاقی)

گوجری ریاست جموں کشمیر میں بولی جانے والی زبانوں میں سے ایک اہم زبان ہے۔ ڈاکٹر صابر آفاقی جموں کشمیر یونیورسٹی، مظفر آباد میں پڑھاتے رہے ہیں اس لیے گوجری زبان کے بارے میں ان کی بات سند کا درجہ رکھتی ہے۔ ان کی یہ کتاب 1985 میں چھپی تھی جس میں گوجری زبان کے مسلمان اور ہندو تمام شاعروں کا تذکرہ کیا گیا ہے۔ اس میں 78 شاعروں کی زندگی اور حالات بیان کیے گئے ہیں اس کے علاوہ ان شعرا کی شاعری پر مختلف نقادوں کے تبصرے بھی شامل ہیں۔ محمد آصف خاں نے یوں اظہار خیال کیا ہے۔

''پروفیسر ڈاکٹر صابر آفاقی ہوری آزاد جموں کشمیر یونیورسٹی، مظفر آباد وچ پڑھاؤندے ہن۔ ایہہ ساڈے دیس دے جانے پچھانے لکھیار ہن۔ ہن تائیں ایہناں دیاں اردو، فارسی تے گوجری وچ ڈھیر ساریاں کتاباں چھپ چکیاں ہن۔ اجے کل ای ایہناں دی کتاب ''تاریخ کشمیر'' چھپ کے سامنے آئی اے۔'' (59)

3۔ پشتو ادب (رضا ہمدانی)

پشتو زبان میں ادب کا آغاز امیر کروڑ سے ہوتا ہے جس کا پتا 'پٹہ خزانہ' سے چلتا ہے۔ اس کو محمد ہوتک ابن داؤد نے تحریر کیا تھا۔ پاکستان پنجابی ادبی بورڈ کی 1986 میں چھاپی جانے والی 'پشتو ادب' پر اس کتاب کو رضا ہمدانی نے تحریر کیا ہے۔ اس کتاب میں 139ھ سے لے کر 1000ھ تک کے انیس شعرا کے نام، حالات اور شاعری کے نمونے دیے گئے ہیں۔ اس کے بعد 1100ھ سے 1300ھ تک کے پندرہ شعرا کا کلام اور حالات موجود ہیں۔ 1300ھ سے 1404ھ کے چھتیس شعرا کا ذکر آتا ہے۔ اس کے بعد پندرہ پشتو مرثیہ نگاروں کا تذکرہ موجود ہے۔

اس کتاب کے بارے میں محمد آصف خاں نے پہلی گل میں لکھا ہے؛

''اک منصوبہ ایہہ وی ہے کہ پاکستان دیاں ساریاں بولیاں تے اوہناں دے ادب توں پنجابی پیاریاں نوں جانو کروایا جائے۔ مہر کاچیلوی ہوراں دی پنج تارے 1984، ڈاکٹر صابر آفاقی ہوراں دی گوجری ادب 1985 تے رضا ہمدانی ہوراں دی پشتو ادب 1986 ایسے لڑی وچوں ہن۔'' (60)

یہ کتاب مقامی زبانوں کے ادب اور خصوصاً شاعری کو پنجابی بولنے اور پڑھنے والوں تک پہنچانے اور ان کو پشتو زبان کے ادب سے آگاہی کے سلسلے میں نہایت اہم کردار ادا کر رہی ہے۔

4۔ ادب راہیں پنجاب دی تاریخ (شفقت تنویر مرزا)

شفقت تنویر مرزا کی یہ کتاب 1989 میں چھپی تھی جس میں انھوں نے تاریخ کے مختلف ادوار کے بارے میں معلومات دیتے ہوئے لوک اور کلاسیکی ادب کے حوالے بھی دیے ہیں۔ اس کتاب سے یہ معلوم ہوتا ہے کہ پنجابی ادب کا تاریخ کے مختلف ادوار میں کیا مؤقف تھا اور یہ کتاب مستقبل کے لوگوں کو اس بارے میں رہنمائی فراہم کر سکتی ہے۔ اس کتاب میں بتیس مختلف عنوانات کے تحت بات کی گئی ہے۔ ان عنوانات میں 'قبل تاریخ توں اج تائیں'، 'غاراں اجڑاں دا دور'، 'جنگل تے جنگل دی مخلوق'، 'سواں تھاتی تہذیب'، 'ہڑپہ موئن جوڈرو'، 'زبان آریاواں توں پہلے'، 'ویدتے پنجاب'، 'ٹیکسلا'، 'سکندر دا حملہ'، 'مذہب تے اوہدے روپ'، 'پنجاب دیاں زباناں'، 'زراعت'، 'پنچن گاؤن'، 'رشتہ داریاں' اور دیگر عنوانات شامل ہیں۔

پہلی گل میں افضل پرویز نے لکھا ہے؛

''ایہناں غنائیاں دا سیچ بڑا چنگا تے بھروااں اے، کیوں جو شفقت تنویر مرزا ہوراں بڑی کھوج تے محنت نال، ایک تاں پنجاب دی تاریخ بیان کیتی اے تے دوجا گیت سنگیت نوں اپنے بیان دا، تھاں تھاں، گواہ بنایا اے۔ ایس طرح ایہہ غنائیے، گیتاں بھریاں کہانیاں بن گئے نیں، جنہاں دی ہر کہانی سچی تے سچی اے۔ اپنی تھاں ہر غنائیہ اک انوکھی تے نویکلی کڑی وِی اے تے پنجاب دی پوری تاریخ دا اِک حصہ وِی اے''۔(61)

پنجابی کے کلاسیکی شعرا کے کلام کے ذریعے انھوں نے پنجابی ادب کی تاریخ کو جس طرح سے بیان کیا ہے، اس بارے میں افضل پرویز نے لکھا ہے؛

''لکھیار نے اِک پاسے بابا فرید، شاہ حسین، بلھے شاہ، وارث شاہ، میاں محمد بخش، خواجہ فرید، پیلو، مولوی غلام رسول عالمپوری، علامہ یعقوب انور تے دوجے شاعراں دے کلام وچوں تے دوجے پاسے لوک گیتاں تے واراں وچوں چونویں حصے لے کے پنجابی تاریخ دا تانا پیٹا تنّیا اے''۔(62)

5۔ سندھی ادب (محمد آصف خاں)

یہ کتاب محمد آصف خاں نے لکھی ہے اور اس کے آغاز میں سندھ کا جغرافیہ، تاریخ، بولی، سندھی ادب کی مختلف اصناف کے ساتھ سندھی ادیبوں، دانشوروں کی تصنیفوں وغیرہ کا ذکر کیا ہے۔ تاریخ کا آغاز کول، بھیل اور سنتھال قوموں سے کیا ہے اور سومرہ، سمہ، ارغون، ترکھان، مغل، کلہوڑا، ٹالپر اور انگریزی ادوار کو بیان کیا ہے۔ اس کے بعد سندھی بولی کے آغاز اور مختلف لہجوں کو بولڑیاں کے ذریعے واضح کیا ہے۔ رسم الخط کا بیان کرتے ہوئے موہن جوداڑو کی مہروں کی تحریروں سے آغاز کر کے بابا فرید کے دور تک کا ذکر کیا ہے۔

اس کتاب کے بارے میں محمد آصف خاں نے پہلی گل میں لکھا ہے؛

''اک منصوبہ ایہہ وی ہے کہ پاکستان دیاں ساریاں بولیاں تے اوہناں دے ادب توں پنجابی پیاریاں نوں جانو کروایا جائے۔ مہر کاچیلوی ہوراں دی پنج تارے 1984، ڈاکٹر صابر آفاقی ہوراں دی گوجری ادب 1985 تے رضا ہمدانی ہوراں دی پشتو ادب 1986 ایسے لڑی وچوں ہن۔ سندھی ادب ایس لڑی دی چوتھی کتاب ہے''۔ (63)

کتاب کے مطالعے سے یہ بات سامنے آتی ہے کہ آصف خان نے سندھی ادب کا گہرا مطالعہ کرنے کے بعد اس کتاب کو تحریر کیا ہے کیونکہ انھوں نے یہاں کی لوک داستانیں، مقامی راجوں کی باہمی لڑائیاں، مذہبی تحریکیں، لوک ادب، کلاسیکی ادب، ادبی اصناف، قدیم شاعروں اور ادیبوں کے ساتھ جدید دور کے لوگوں کے بارے میں بھی معلومات اکٹھی کر دی ہیں۔ یہ کتاب 1991 میں چھپی تھی۔

6۔ پنجابی ادب (شفقت تنویر مرزا)

شفقت تنویر مرزا کی پنجابی ادب اور زبان کے لیے خدمات ناقابل فراموش ہیں۔ ان کی اس کتاب میں سات موضوعات ہیں جن میں پنجاب کی تاریخ و جغرافیہ، پنجابی زبان، لوک ادب اور دیگر شعری اصناف، جدید ادب وغیرہ شامل ہیں۔ شفقت تنویر مرزا جیسے نامور مصنف اور محقق نے ماں بولی کی خدمت کرتے ہوئے اس کتاب میں لوک ادب کی بہت سی صنفوں مثلاً گوری، تھال، بولی، چھلا، جگنی،، ڈھولا اور وار وغیرہ جیسی اصناف کی وضاحت کی ہے۔ اس کے بعد پنجابی ادب کو چار ادوار 'سوچ فکر تے پہلا دور'، 'دوجا دور'، 'تیجا دور' اور 'اجوکا ادب' میں تقسیم کرتے ہوئے اس کا جائزہ لیتے ہوئے اہم معلومات فراہم کی ہیں۔ اس کتاب میں پنجاب بھر کے مصنفین اور شعرا کے بارے میں کافی تفصیلی معلومات فراہم کی ہیں، جس سے پنجابی زبان پڑھنے والوں کی معلومات میں خاصا اضافہ ہوتا ہے۔ یہ کتاب 1995 میں چھپی تھی۔

7۔ بلوچی ادب (پروفیسر عبدالرزاق صابر)

بلوچی زبان برصغیر میں بولی جانے والی انتہائی پرانی زبانوں میں سے ایک زبان ہے۔ پاکستان میں تین فیصد لوگ بلوچی زبان بولتے ہیں۔ عبدالزاق صابر نے بلوچی ادب پر اردو میں کتاب تحریر کی جسے زاہد حسن نے پنجابی قالب میں ڈھالا ہے۔ اس کتاب کے پیش لفظ میں معروف بلوچی لکھاری عبداللہ جمال دینی نے عبدالرزاق صابر کے کام کو سراہتے ہوئے تحریر کیا ہے؛

''بلوچی زبان کی تاریخ ادب کے ضمن میں میرے نزدیک یہ ایک نہایت ہی احسن کام ہے جسے صابر صاحب ہی انجام دے سکتے تھے۔ یہ کتاب ہر لحاظ سے مکمل اور جامع کوشش ہے۔اس میں زبان کے علاوہ اجمالاً لوگوں اور سرزمین کی مختصر تاریخ اور جغرافیہ ہے۔ بلوچی لسانیات، گرامر اور لوک ادب کے بارے میں قاری کو وافر معلومات بہم پہنچانے کی کوشش کی گئی ہے۔ حتی الوسع پروفیسر صابر صاحب نے بلوچی زبان کے کسی پہلو کو نظر انداز نہیں کیا ہے۔ان کا بلوچی زبان کے بارے میں نہایت گہرا مطالعہ ہے اور انھوں نے بلوچی زبان کے مطالعہ کرنے والوں اور طلبہ کی ایک بہت بڑی ضرورت پوری کر دی ہے''۔ (64)

کتاب کا آغاز جغرافیے سے کیا گیا ہے اس کے بعد پہلے باب میں پانی، ہوا، آبادی، زبانیں، انتظامی تقسیم اور عرب حکوتوں سے لے کر تقسیم تک کے بارے میں بتایا ہے۔ دوسرا باب زبان کے حوالے سے تاریخ، جغرافیہ، صوتیات، لہجے، رسم الخط، حروف تہجی، معیاری زبان اور پرانی تحریروں پر مشتمل ہے۔ تیسرے اور چوتھے باب میں پرانا بلوچی ادب، کلاسیکی ادب، نیا بلوچی ادب شامل ہے۔ پانچواں باب صحافت سے متعلق ہے اور اس میں مختلف ماہناموں، ادبی اداروں، ریڈیو

پاکستان اور ٹیلی ویژن کے کردار کو واضح کیا گیا ہے۔ چھٹے اور آخری باب میں 19 بلوچی شعرا اور مصنفین کا تعارف دیا گیا ہے۔ کتاب کے آخر میں کتابیات دی گئی ہیں۔ یہ کتاب 1996 میں چھپی تھی۔ محمد آصف خاں نے لکھا ہے؛

''ڈاکٹر عبدالرزاق صابر ہوراں جس محنت، لگن تے اُدم نال ایہہ کھوج بھری کتاب لکھی ہے، تسیں اوہنوں ضرور رج کے سلاہوؤگے''۔(65)

8۔ پوٹھوہار دی پنجابی شاعری (ڈاکٹر یسٰین ظفر)

خطہ پوٹھوہار کے بارے میں ڈاکٹر یسٰین ظفر کی کتاب 1997 میں چھپی تھی جو اصل میں ان کا پی ایچ ڈی کا مقالہ ہے۔انھوں نے اس کتاب کو چھ ابواب میں تقسیم کیا ہے۔پہلے باب ''پوٹھوہار دا جغرافیائی،تاریخی، ثقافتی، سماجی تے اقتصادی تعارف'' میں پوٹھوہار کے نام،وادی سواں کی تہذیب، آب وہوا، زرعی پیداوار، معدنیات،تاریخی پس منظر اور پنجابی زبان کے ارتقا کو بیان کیا ہے۔ دوسرا باب بہ عنوان ''پنجابی شاعری دا مڈھ'' پنجابی زبان کی شعری صلاحیتوں، لہجوں کے فرق، تہواروں کے گیت اور لوک گیتوں پر مشتمل ہے۔ تیسرے باب میں کلاسیکی دور کو شامل کیا گیا ہے۔ جس میں تصوف اور بزرگوں کے مزار، عرس اور میلوں کے علاوہ ان بزرگوں کے بارے میں معلومات موجود ہیں۔ چوتھے باب میں پنجابی زبان پر اردو اور فارسی کے اثرات، سیاسی تحریکوں، سیاسی نظموں کے بارے میں بیان کرنے کے ساتھ ساتھ سید مہر علی شاہ گولڑوی، میاں بردا پشاوری، احمد علی سائیں پشاوری کے علاوہ دوسرے مسلمان اور ہندو شعرا میں کیدار ناتھ سوز، موہن سنگھ ماہر، موہن سنگھ دیوانہ، درشن سنگھ آوارہ، ملکھی رام وغیرہ کا ذکر ہے۔ پانچواں باب جدید دور کی شاعری کے بارے میں معلومات پر مشتمل ہے۔ چھٹے اور آخری باب میں آج کے شعرا اور ان کی شاعری اور اس کا ملکی حالات پر اثر، پاک بھارت جنگ کے دوران لکھے جانے والے جنگی ترانوں اور نئے شعرا کے تذکرہ پر مشتمل ہے۔

پیش لفظ کا آغاز ان الفاظ سے کیا گیا ہے؛

''ساڈا سوہنا آزاد ملک پاکستان اک تہذیبی تے ثقافتی وحدت اے۔ چنگی طرح چلان تے ہور سہولتاں لئی ایہہ کئیں انتظامی حصیاں وچ ونڈیا ہویا اے۔ گلیاں تے محلے، پنڈ تے گراں، شہر تے قصبے، تحصیلاں تے ضلعے، ڈویژن تے صوبے ایس وحدت دے نکے وڈے حصے نیں۔۔۔۔۔۔ پوٹھوہار دی ونڈ کدی وی کسی خاص انتظامی تے سماجی مقصد لئی نہیں کیتی گئی۔ ایہدی ونڈ لوکاں دے دلاں وچ اے''۔(66)

''ہندوستان میں مغلوں کی آمد سے پہلے بھی اس علاقے کو پٹوار کے نام سے یاد کیا جاتا تھا اور مغلوں کے عہد میں بھی اے پوٹھوہار ہی کے نام سے پکارا جاتا رہا''۔

''سب سے پہلے مغل بادشاہ نورالدین جہانگیر نے اپنی توزک میں پوٹھوہار کے علاقہ کو ہتھیہ سے مارگلا تک ہی قرار دیا ہے۔ لسانی اعتبار سے بھی یہی علاقہ پوٹھوہاری کا گہوارہ ہے۔ پوٹھوہار کی حدود کو دریائے جہلم سے دریائے اٹک تک اور کوہالہ پل سے سون سکیسر کی پہاڑیوں تک وسیع سمجھنا بالکل غلط اور خلاف حقیقت ہے''۔(67)

علمی و تحقیقی کتابیں

1۔ مڈھلی لفظالی (محمد آصف خاں، سبط الحسن ضیغم، شریف صابر)

پنجابی ادب کے بارے میں یہ بات وثوق سے کہی جاسکتی ہے کہ اس میں ہمیشہ سے ہر صنف کے اعلیٰ فن پارے تخلیق ہوتے رہے ہیں لیکن پنجابی زبان کو اس کا حق نہ ملنے کی وجہ سے اس طرف اتنی توجہ نہیں دی گئی جس کی یہ مستحق تھی۔ اسی وجہ سے پنجابی ادب کے بہت سے نگینے ناقدری کی وجہ سے نابود ہو گئے اور جو چند سامنے آئے ان میں سے بہت سوں کا کام نایاب ہے۔ پنجاب کے سیاسی و سماجی حالات بھی اس کے ذمہ دار ہیں جس وجہ سے بہت سے فن پارے سامنے آنے کے باوجود اب ناپید ہیں اور سینہ در سینہ منتقل ہونے کے بعد ضائع ہو جانے والے فن پاروں کا کوئی شمار ہی نہیں ہے۔ پنجابی زبان پر مناسب تحقیق نہ ہونے کی وجہ سے بھی یہ خلا اسی طرح ہے جو شاید کبھی نہیں بھر سکے گا۔

1976 میں پاکستان پنجابی ادبی بورڈ نے چوٹی کے تین مصنفوں (محمد آصف خاں، سبط الحسن ضیغم، شریف صابر) کی مشترکہ کوشش کو ''مڈھلی لفظالی'' کے عنوان سے چھاپا تھا۔ اس کتاب میں پنجابی کے شائع شدہ اور غیر شائع شدہ ادب کو اکٹھا کر کے بنیادی الفاظ تیار کیے گئے ہیں۔ یہ بات تسلیم شدہ ہے کہ ماں بولی کسی بھی زبان کی تعلیم کے فروغ کے لیے نہایت اہم کردار ادا کرتی ہے۔ اسی لیے یہ کتاب اس سلسلے میں ایک اہم قدم ہے۔

2۔ آزادی مگروں پنجابی نظم (زاہد حسن)

یہ کتاب پاکستان پنجابی ادبی بورڈ نے 2001 میں شائع کی تھی جس میں زاہد حسن نے کوزے میں دریا کو بند کر دیا ہے۔ یہ بات کہنے میں بہت آسان لگتی ہے مگر زاہد حسن نے واقعی ایسا کر دکھایا ہے۔ انھوں نے 1298 کے استاد عشق لہر سے آغاز کیا ہے اور 2011 تک جتنی بھی پنجابی نظم لکھی گئی ہے، اس کو اکھٹا کرنے کی بھرپور کوشش کی ہے۔ ان کی کتاب میں 231 شعرا کا کلام، ان کی مطبوعہ کتابیں اور کسی حد تک ان کے احوال زندگی بیان کیے ہیں۔ ان 231 شعرا کرام میں پنجابی نظم کہنے والے پیر فضل گجراتی، ڈاکٹر فقیر محمد فقیر، جوگی جہلمی، حکیم شیر محمد ناصر، استاد دامن، صوفی تبسم، شریف

کنجاہی، احمد راہی، فیض احمد فیض، منیر نیازی، باقی صدیقی، عبیر ابوذری، نجم حسین سید، احمد ندیم قاسمی، منو بھائی، شفقت تنویر مرزا، ظفر اقبال، حبیب جالب، افضل احسن رندھاوا، واصف علی واصف، بشیر منذر، اقبال صلاح الدین، انور مسعود، فخر زمان، مشتاق صوفی، اصغر ندیم سید، شاکر شجاع آبادی، ارشد محمود ناشاد، فرحت عباس شاہ اور زاہد حسن جیسے معروف شعرا شامل ہیں۔ اس کے علاوہ بے شمار ایسے شعرا کرام ہیں جو بوجوہ زیادہ معروف تو نہیں ہیں لیکن انھوں نے بہت اچھی نظمیں کہی ہیں۔ ان میں کچھ شعرا ایسے بھی ہیں جن کا کلام زیر طبع ہے یا شائع ہونے کے مراحل میں ہے۔ زاہد حسن نے مڈھلی گل میں تحریر کیا ہے؛

''پنجابی شعری ادب وچ سانوں لوک داستاناں دی اِک وَڈی روایت مِلدی ہے۔ پھیر ایہدے اندر دمودر داس، پیلو، برخوردار، وارث شاہ، لطف علی، میاں محمد بخش، غلام رسول عالمپوری تے ہور اجیہے شاعر آئے جنہاں ایس روایت نوں اَگے ودھان وِچ اہم کردار ادا کیتا۔
1947 توں پاکستانی نظم دی ٹُور اِک وَکھرے سبھاتے وَکھرے ڈَھب نال اَگے ودھدی دِسدی ہے۔ تے ایس ٹُور وِچ سارا چَجّھب ڈَھب سانوں پچھلی نظم دا نظریں آوندا اے جیہدا سِٹّا اوس ای پرانی روایت تے رِیت دی لگروں پھٹیا اے''۔(68)

زاہد حسن نے مڈھلی گل میں ایک پنجابی مصنف ریاض احمد شاد کے حوالے سے تحریر کیا ہے؛

''تحریک پاکستان وچ پنجابی شاعری دا بڑا بھرواں حصہ سی، جد کہ پاکستان بنن توں بعد پنجابی لئی سرکاری سرپرستی دوجیاں سبھ پاکستانی بولیاں دے مقابلے وچ نہ ہون دے برابر سی۔ پنجابی شاعراں نے اجیہی بے قدری نوں بڑا محسوس کیتا تے ایس سمے دے بہت سارے شاعراں دے کول سانوں عظیم پنجابی قصہ کاری، لوک گیتاں تے لوک شاعری دی روایت نظریں آوندی ہے تے جیہڑے

شاعراں نویں رویاں تے نویاں رجحاناں نوں اپنیاں نظماں دا حصہ بنایا، اوہناں وچ استاد عشق لہر، دائم اقبال دائم، محمد اسماعیل سفری، استاد کرم، فقیر محمد فقیر، عبدالمجید بھٹی، حکیم ناصر، جوگی جہلمی، تے استاد دامن جیہے شاعر ساڈی روایت دے ستون بن کے کھلوتے نیں"۔ (69)

اس کے بعد زاہد حسن نے پیر فضل حسین، صوفی تبسم اور عبیر ابوذری کی شاعری کے بارے میں ذکر کیا ہے۔ پھر احمد راہی اور شریف کنجاہی کی شاعری اور فکری حوالے سے چند باتیں کرنے کے بعد منیر نیازی کے انداز پر روشنی ڈالی ہے۔ اپنی بات ختم کرنے سے پہلے انھوں نے تحریر کیا ہے؛

"پنجابی نظم دا ایہہ سفر سی اک خوشبو، ایس خوشبو دی مہکار دا سفر ہے۔ اساں تے گل کیتی ہے۔ 1947 توں مگروں ساہمنے آن والی نظم دی تے سٹھ، ستر دھائیاں دا سفر اصل وچ سٹھ، ستر صدیاں دا سفر اے جو ساڈی سوچ، ساڈی فکر، ساڈی سوجھ، ساڈے ادراک راہیں اجو کے ویلے دے انسان تیک اپڑی ہے تے آون والیاں صدیاں دے انسان دی سوجھ اوہدی دانش دا حصہ بنیار ہوے گا۔

ایس ای آس تے اسیں پنجابی نظم دی ایس چون دی پڑھت کر رہے واں، تے ایہی سدھراں اوس نسل دے سینے وچ ہون گی آں جو آون والے زمانے وچ ایس نوں پڑھے گی"۔(70)

زاہد حسن کی یہ کتاب پنجابی نظم کے سفر، فکر، انداز، فن اور نئے پرانے خیالات کو پنجابی نظم پڑھنے والے قاری کو اس کے بارے میں آگاہی دینے میں نہایت مددگار اور وسیلہ ثابت ہو گی۔

3۔ بول تے تول (علامہ غلام یعقوب انور)

علامہ غلام یعقوب انور پیشہ کے لحاظ سے وکیل تھے۔ ان کا نام اُن کے تخلیقی کارناموں کے باعث زندہ ہے کیونکہ

وہ بہت اچھے شاعر اور نثر نگار تھے۔ یہ صلاحیتیں انہیں اپنے والد عبدالغنی وفا سے ورثے میں ملی تھیں، جو خود پنجابی کے صاحبِ اسلوب شاعر تھے۔ پہلی گل کا آغاز یوں ہوتا ہے؛

''قریشی غلام یعقوب انور پنجاب دے اَنبراں دا چمکدار تے روشن ستارا ہن۔ اپنی ماں بولی دی جھولی وَن سوّنے پھُلاں نال بھرن وِچ اوہ آخری دم تائیں جُٹے رہے۔ پنجابی نال ایہہ پیار اوہناں نُوں اپنے والد تے پنجابی دے استاد شاعر خان صاحب عبدالغنی وفا ہوراں توں وِرثے وِچ ملیا سی''۔ (71)

گوجرانوالہ کے چوک نیائیں کے نزدیک حافظ آباد روڈ پر واقع ''انور لاج'' مدت دراز تک ادبی اور علمی سرگرمیوں کا مرکز بنا رہا۔ علامہ صاحب 1974ء داعی اجل کو لبیک کہہ گئے۔ پاکستان پنجابی ادبی بورڈ نے ان کی ادبی اصطلاحات کے بارے میں کتاب 1981 میں شائع کی تھی۔ اصطلاحواں کے عنوان کے تحت پنجابی کی اصناف نظم، گنڈھاں، لوری، قصیدہ، قطعہ، کلی، کھدو، شلوک، ساقی نامہ، حمد، تھال، ترجیع بند اور ترکیب بند وغیرہ شامل ہیں۔ علم بیان کے مضمون میں عروض، بیان اور بدایع کے بارے میں بتایا ہے۔ اس کے ساتھ تشبہیہ، تشبیہہ کی اقسام، استعارہ، مجاز مرسل، کنایہ، صنعتیں اور اس کی اقسام وغیرہ کے بارے میں تفصیلی وضاحت دی ہے۔ اس کے بعد چھندابندی کے بارے میں مضمون بھی اس میں شامل ہے۔ سبط الحسن ضیغم کے مطابق؛

''پاکستان پنجابی ادبی بورڈ مرحوم دی کتاب بول تے تول وڈے مان نال پیش کر رہیا ہے۔ ایس دا موضوع ات نویکلا ہے۔ ایڈے وڈے پسار والے موضوع نوں اینے تھوڑے صفحیاں وچ سمیٹ لینا ایہہ کسے ہور لکھاری دے وس دی گل نہیں سی۔ اسیں دعوے نال آکھ سکدے ہاں کہ اجیہا فنی مواد دوجیاں پاکستانی بولیاں وچ وی اکو تھاں نہیں لبھ سکے گا''۔ (72)

یہ کتاب علم البیان کے اصولوں اور شاعری کی متفرق اقسام کے بارے میں بیش قیمت معلومات کا خزانہ ہے جس کو مصنف نے تحقیق سے مرتب کیا ہے۔ سمجھانے کا انداز نہایت سادہ ہے جس سے بات باآسانی سمجھ آجاتی ہے۔

''علم البیان اوہناں اصولاں، قاعدیاں تے ترکیباں دا اکٹھ ہوندا ہے جیہناں دا جانن والا، اک گل نوں ون سون طریقیاں نال ساڈے اگے رکھ سکدا ہے۔ اک طریقے نوں دوجے طریقے نالوں نکھیڑن دی گل ایس کر کے کیتی جاندی ہے کہ جے کجھ طریقے معنیاں اتے سدھی سانویں دلالت کر دے ہن تے کجھ طریقے اجیہے ہوندے ہن کہ گل دا مطلب جھٹ پٹ نہیں اگھڑ دا سگوں سوچن سمجھن نال گل پلے پیندی ہے''۔(73)

4۔ کن لیکھا (محمد آصف خاں، تنویر بخاری)

اس نہایت اہم کتاب کو محمد آصف خاں اور تنویر بخاری نے مل کر مرتب کیا ہے جس کو پاکستان پنجابی ادبی بورڈ نے 1984 میں چھاپا تھا۔ اس کتاب میں محمد آصف خاں نے چھ موضوعات پر گرائمر کے بارے میں اپنے نظریات بیان کیے ہیں۔ اس سے پہلے انھوں نے مختلف جانوروں کی آوازوں کو الگ الگ حالت میں استعمال کرنے کے لیے الفاظ بیان کیے ہیں جس کی طرف کسی بھی کتاب میں دھیان نہیں دیا جاتا۔ انھوں نے بہت سے لکھاریوں اور لوگوں کی اس غلط فہمی کا ازالہ کرنے کی کوشش کی ہے جو یہ کہتے ہیں کہ پنجابی زبان میں دو، تین ہی مصدر ہیں۔ انھوں نے اس کتاب میں تقریباً دو ہزار مصدر اکٹھے کیے ہیں۔ ان کے مطابق پنجابی زبان کو کسی دوسری زبان کے الفاظ لینے کی ضرورت نہیں ہے کیونکہ یہ زبان اپنے اندر خود اتنے الفاظ رکھتی ہے جن کو سامنے لانے اور استعمال کرنے کی ضرورت ہے۔

''میری جاچے اپنی بولی دیاں لوڑاں تھوڑاں پوریاں کرن لئی پنجابی نوں عربی، فارسی جاں ہندی سنسکرت اگے مانگت بن کے جھولی اڈّن دی لوڑ نہیں''۔(74)

انھوں نے نئے لکھنے والوں کی ہمت افزائی کرتے ہوئے یہ کہا ہے کہ وہ کوشش کریں اور اپنی زبان کے الفاظ ڈھونڈنے کے سلسلے میں تحقیق کر کے ان کو استعمال کریں۔

''سانوں ویلا ونگار دا پیا ہے کہ اسیں اہلکس تجیے تیا گیے، اوپرے، اوبھڑ، بناوٹی تے گلھے ہوئے لفظ ورتن دی تھاں اوہناں خزانیاں نوں اگو لن لئی لک بنھیے، جو ساڈے توں پرو کھے تان نہیں پر ہڈاں وچ رچیا سو کھ سانوں اوہناں تائیں اپڑن توں ورجدا تے ٹھاکدا ہے''۔ (75)

اس کتاب میں الف بائی ترتیب سے الفاظ، ان کے الگ الگ معنی اور استعمال بتایا گیا ہے۔ان کے اپنے الفاظ ہیں؛

''ڈکشنریاں اسانوں لفظاں دے ننگے بچے معنی دیندیاں ہن۔ جاں انج آکھ لوو کہ لوڑیندے لفظ دے اُتلے تے پتیلے مفہوم (sense) اپٹن لئی ساڈی رہنمائی کر دیاں ہن۔ایہہ وکھ گل ہے کہ ہر بولی دے تخلیقی لکھیار اپنی بولی دے لفظاں نوں کدے سدھ پدھرے معنیاں وچ ورتدے ہن تے کدے امیجری تے رمز راہیں گل کر دے ہن۔ کدے محاورے تے اکھاناں نال اپنی تخلیق نوں شنگار دے ہن تے کدے وسیبی سینتاں راہیں پڑھن ہاراں دے دلاں نوں ٹمبدے ہن۔انج اوہناں دے لفظاں دے مفہوم ڈکشنری دے معنیاں توں پرانہہ ہو جاندے ہن۔ اوتھے اوہناں دیاں دوجیاں پرتاں سگوں پہلیاں پرتاں بن کھلودیاں ہن۔ اُتے دتے سارے ویروے دا سار ایہہ ہے کہ ساڈے گرامر نویس مصدر دی جو تعریف دیندے ہن اوہ ڈھکویں نہیں۔ دوجے ایہہ کہ ہر لفظ دے معنی اودوں ای اگھڑ کے، نتر کے ساہمنے آؤندے ہن، جدوں اوہ کسے فقرے جاں شعر وچ ورتیا ہووے''۔ (76)

5۔ نکھیڑے (پروفیسر قاضی فضل حق)

یہ کتاب 1985 میں چھپی تھی جس میں پروفیسر قاضی فضل حق نے پنجاب کے غیر معروف بلکہ نامعلوم شعرا کے بارے میں اپنی تحقیق پیش کی ہے۔اس کتاب کو ان کے بیٹے نے ''نکھیڑے'' کے عنوان سے شائع کروایا ہے۔ ''یاد رفتگاں'' میں سیالکوٹ، گوجرانوالہ، گجرات، وزیر آباد اور ارد گرد کے قصبات کے مختلف فنون کے ماہر لوگوں کا تذکرہ کیا ہے۔ ''کجھ پنجابی شاعراں دا سلکھنا حال'' میں 43 شعرا کا تذکرہ کرنے کے بعد فرد فقیر، قادر بخش، سید حامد شاہ عباسی، مولوی غلام رسول، حافظ برخوردار اور مولانا عبداللہ عبدی کی شاعری اور حالات بیان کیے ہیں۔ انھوں نے گجرات کے شاعر حافظ شمس الدین کی پچپیں شعری اصناف کا ذکر کیا ہے اور دوہڑے کہنے والے تینتیس شعرا کا ذکر کیا ہے۔ جن کے نام مستانہ، غلام نبی، یارا، رانجھا، ساون، فاضل، بدھ سنگھ، محمد شاہ، سکندر، میاں صاحب، نگاہ، دلیل، مہدی شاہ، میاں باقی، شاہ امام، رمضانی، محمود سجن، عبداللہ، غلام، نور جمال، مراد علی، عظیم، سلیم، ظریف، مشتاق، جمال، لال دیال، میاں واصل، ہاشم، شرف، ولی، عاقل اور جان محمد ہیں۔

محمد آصف خاں نے اس کتاب کے بارے میں یوں تبصرہ کیا ہے؛

''ساڈے بزرگ ایس گل دے جانوُ ہاین کہ لوکاں نال لوکاں دی بولی وچ گل کیتی ونجے تاں نیڑ ودھدا ہے۔ 'میں' تے 'توں' دا نکھیڑ مکدا ہے۔ حضرت بابا شاہ حسین، سلطان باہو، وارث شاہ، بلھے شاہ، میاں محمد، مولوی غلام رسول، سچل سرمست، خواجہ غلام فرید تے ہزاراں اللہ لوک شاعراں اپنی بولی نوں ای اظہار دا ذریعہ بنایا۔ (77)

''لوڑ ایس گل دی ہے کہ قاضی مرحوم تے جو شوا ہوراں دے ساتھیاں نوں لبھیا جاوے نہیں تاں
جیویں حضرت بابا فرید تے شاہ حسین وچالے دیاں کڑیاں نہیں لبھدیاں پئیاں، انج ای بھلکے ایہہ کھپاوی
ساڈے توں پوریا نہیں جانا''۔ (78)

ایسے محققین کی اشد ضرورت ہے جو قاضی صاحب کے نقش قدم پر چلتے ہوئے پنجابی زبان کے ایسے شعرا کے بارے میں تحقیق کریں جن کے بارے میں پنجابی ادب کے قارئین کچھ نہیں جانتے۔ آصف خان کا یہ کہنا بجا ہے کہ اگر ایسا نہ کیا گیا تو جس طرح سے بابا فریدؒ سے لے کر شاہ حسین کے دور کے درمیان کے بارے میں معلومات ناپید ہیں، اسی طرح سے دیگر بہت سے شعرا کا کلام بھی سامنے نہیں آسکے گا جو پنجابی ادب کے لیے ناقابل تلافی نقصان ہو گا۔

6۔ ماہیا فن تے بُنتر (تنویر بخاری)

تنویر بخاری نے اس کتاب میں ماہیے کے بارے میں بھرپور معلومات کے ساتھ ماہیا کے لفظی معنی، اس کی قسمیں، تراکیب اور اوزان کے بارے میں وضاحت کی ہے۔ اس کے علاوہ ماہیا گانے میں استعمال ہونے والے سازوں اور اس کی مختلف دھنوں کا ذکر کیا ہے۔ ماہیے میں استعمال کیے گئے مختلف موضوعات مثلاً عشق، محبت، وعدے، طعنے، تہمتیں، گھریلو زندگی، میل، جدائی، گھر بار، ہنسی مذاق، دعائیں، رشتہ دار، پیشے اور جانور وغیرہ کے بارے میں بیان کیا ہے۔ اس کتاب کے بارے میں آصف خان نے لکھا ہے:

''ہتھ والی کتاب وچ تنویر بخاری ہوراں لوکاں دی ایس ونگی دا بھرپور فنی تے تنقیدی جائزہ لیا ہے۔
اوہناں ماہیے دا کوئی اجیہا پکھ نہیں چھڈیا جس اتے اوہناں تفصیلی چانن نہ پایا ہووے۔ انج ایہہ کتاب
ماہیے دی سانگے اک 'ریفرنس بک' تھی ونجی ہے۔'' (79)

تنویر بخاری ستائیس موضوعات زیر بحث لائے ہیں اور آخر میں 'انگریزی لفظاں دی ورتوں' کے عنوان کے تحت ماہیے میں استعمال ہونے والے انگریزی الفاظ اور ان کے معنی بتائے ہیں۔ اس کتاب کا پہلا ایڈیشن دسمبر 1988 میں چھپا تھا۔

7۔ بوطیقا (رحمان مذنب)

علم کے حوالے سے قدیم یونان کا دور ایک زرخیز دور کہلاتا ہے جس میں بہت سے ایسے فلسفی اور نکتہ دان پیدا ہوئے جنھوں نے مختلف علوم وفنون کا ایسا خزانہ دیا جس پر یونان والے بجا طور پر فخر کر سکتے ہیں۔ اس دور میں شاعری ادب اور ڈرامے پر عمدہ تنقید دیکھنے میں آئی ہے۔ اس دور کے نظریات میں سے بہت سے ایسے ہیں جو آج سے دو، اڑھائی ہزار برس گزرنے کے باوجود بھی قابل توجہ سمجھے جاتے ہیں۔ ارسطو یونان کا ممتاز فلسفی، مفکر اور ماہر منطق تھا، جس نے افلاطون جیسے استاد کی صحبت پائی اور دنیا کو سکندر اعظم جیسے شاگرد سے متعارف کروایا۔ ادبی تنقید میں ''بوطیقا'' کی حیثیت پہلی باقاعدہ تصنیف کی ہے جس میں ارسطو نے شاعروں کی وکالت کرتے ہوئے شاعری کو ایک مفید شے قرار دیا ہے اور انہیں افلاطون کے الزامات سے بچانے کی کوشش کی۔ ارسطو سے پہلے بھی تنقیدی نظریات ملتے ہیں لیکن وہ خال خال اور منتشر حالت پائے جاتے ہیں۔

''بوطیقا'' تنقید کی پہلی اور لافانی کتاب ہے اور ارسطو پہلا باضابطہ نقاد ہے۔ ارسطو کی مشہور زمانہ کتاب کا پنجابی زبان میں ترجمہ رحمان مذنب نے کیا ہے۔ اس تنقیدی کتاب میں انھوں نے بتایا ہے کہ ادب، شعر اور تنقید کیا ہے۔ اس کتاب میں ارسطو نے ڈرامے کے پلاٹ کی دو قسموں، سادہ پلاٹ اور پیچیدہ پلاٹ کے بارے میں بیان کیا ہے۔ بوطیقا کے بارے میں عمومی طور پر اظہار کیا جاتا ہے کہ یہ ارسطو کی کتاب نہیں ہے بلکہ اس کے شاگردوں کو دیے ہوئے لیکچروں کے نوٹس (Notes) ہیں جن کو وہ پڑھاتے وقت اپنے ساتھ رکھتا تھا۔ ایک خیال یہ بھی ہے کہ بوطیقا دو جلدوں پر مشتمل تھی پہلی جلد میں المیہ جنگ نامے اور دوسری جلد میں طربیہ اور رزمیہ کے بارے میں ذکر کیا گیا تھا۔ مترجم نے اس کتاب میں 'دوچار گلاں' کے زیر عنوان 37 صفحات میں اپنے خیالات بیان کرتے ہوئے ایک جگہ یوں لکھا ہے؛

''ادب دی تاریخ وچ ''بوطیقا'' نوں شاہکار دا درجہ حاصل اے۔ ہر حال وچ ایہداذکر لازمی اے۔ دنیا دی شاید ای کوئی زبان ہووے گی جیہدے وچ ایہدے اک یا اک توں ودھ ترجمے تے تشریحی کتاباں نہ ہون۔ میں پنجابی لئی بائی واٹر دا ترجمہ استعمال کیتا اے۔ میرے نیڑے ایہدے وچ ارسطو دے سارے لفظ آ گئے نیں۔ سٹائل وی اوہدا ای اے۔ بوطیقا دا ترجمہ انج ای ہونا چاہیدا اے۔ کھلا ڈلا ترجمہ ایہدے لئی مناسب نہیں کیوں جے ایہہ بڑی پیڈھی، نپی تلی تے وزنی کتاب اے''۔ (80)

بوطیقا میں ارسطو نے نقل، فطرت، شاعری کی اصل، شاعری کی اقسام، ٹریجڈی کے اصول وغیرہ پر بحث کی ہے اور شاعری کا ایک آفاقی نظریہ پیش کیا ہے۔ ''نقل'' فن جمالیات کی ایک بنیادی اصطلاح ہے۔ ارسطو اس لفظ کا اطلاق شاعری پر کرتا ہے۔ ارسطو کے نزدیک انسان حواس کے ذریعہ ہی کسی شے کا ادراک کرتا ہے۔ ہر شے کے اندر ایک مثالی ہیت موجود ہے لیکن خود اس شے سے اس ہیت کا ادھورا اور نامکمل اظہار ہوتا ہے۔ یہ ہیئت فنکار کے ذہن پر حسی شکل میں اثر انداز ہوتی ہے اور وہ اس کے بھرپور اظہار کی کوشش کرتے ہوئے اس مثال کو سامنے لاتا ہے جو دنیائے رنگ و بو میں نامکمل طور پر ظاہر ہوئی ہوتی ہے۔ حواس کے ذریعہ سے جس دنیا کو محسوس کیا جاتا ہے وہ ''اصل حقیقت'' کا نامکمل اور ادھورا مظہر ہے۔ طبعی دنیا کی مختلف شکلیں جدا اور مثالی شکلوں کی نقلیں تھیں جنہیں اس مادی دنیا میں ہونے والے حادثات نے مسخ کر دیا ہے۔ فلسفی کا کام ہے کہ وہ ان اتفاقی اور مسخ شدہ شکلوں کے اندر کی ''اصل حقیقت'' اور ان قوتوں کو تلاش کرے جو ساری ہستی کا سبب ہیں اور اسے حرکت میں لاتے ہیں۔ شاعر بھی یہی کام کرتا ہے۔ ارسطو کے ''شاعرانہ نقل'' کے نظریہ نے شاعر کو فلسفہ کے اعلیٰ منصب میں ایک اہم مقام عطا کر دیا۔ ارسطو کے نظریے کے مطابق نقل تخلیقی عمل ہے۔ تقریباً دو ہزار سال پہلے ارسطو کے اُٹھائے گئے سوالات آج بھی زندہ ہیں اور ادبی تنقید کے لامتناہی سلسلے کا آغاز اور رہنمائی کرتے ہیں۔ اس وجہ سے انسانی ذہنی ارتقاء کی تاریخ میں بوطیقا ایک دائمی حیثیت رکھتی ہے اور اس کے بغیر ہم مغرب کی قدیم وجدید تنقید کی ادبی روایت کو نہیں سمجھ سکتے۔ ارسطو صرف فلسفی ہی نہیں بلکہ علم طب، علم حیوانات، علمی ریاضی، علم ہیئت، سیاسیات، مابعد الطبیعات اور علم الاخلاقیات پر مستند اور صاحب الرائے عالم مانا جاتا تھا۔ اس کے تحقیقی رسائل اور کتب کی تعداد ہزار سے زائد ہے۔

رحمان مُذنب نے اس کتاب کو26ابواب میں تقسیم کیا ہے۔اس کتاب کا پہلا ایڈیشن نومبر 1988 میں چھپا تھا۔

8۔ نِک سُک (محمد آصف خاں)

آصف خان پنجابی زبان کے معروف مصنف اور محقق ہیں۔ یہ کتاب ان کے علمی،ادبی اور تحقیقی مضمونوں کا مجموعہ ہے جس کو پاکستان پنجابی ادبی بورڈ نے 1992 میں چھاپا تھا۔ محمد آصف خاں اپنی ماں بولی پنجابی زبان سے صرف پیار ہی نہیں کرتے تھے بلکہ انھوں نے اس کی ترقی اور ترویج کے سلسلے میں عملی طور پر کام بھی کیا ہے۔ان کی یہ کتاب اسی سلسلے کی ایک کڑی ہے جس کو تحریر کرنے میں ان کے مطابق ان کو چھتیس سال لگے۔ کتاب کے پہلے حصے تصوف میں چار مضامین شامل ہیں جن میں تصوف کی ان اصطلاحات کی وضاحت کی گئی ہے جن کو پنجابی کلاسیکی شعرا نے اپنی شاعری میں استعمال کیا ہے۔ دوسرے حصے میں پنجاب کے پرانے ناموں کے بارے میں بات کی گئی ہے اور اس کے دو پرانے نام سپت سندھو اور واہیک کی وضاحت کی گئی ہے۔ تیسرا حصہ شعر کی بناوٹ کے بارے میں ہے جس میں شلوک، کافی اور وار کے معنی بتانے کے علاوہ ان کا فرق واضح کیا ہے۔اس کے بعد پنجابی شاعری کا عروضی نظام بیان کیا گیا ہے اور اس کے ذریعے شعروں کو جانچا گیا ہے۔ اس کتاب میں متفرق مضامین بھی ہیں جن میں پنجابی املا، پنجابی ذریعہ تعلیم وغیرہ شامل ہیں۔ پنجابی کے ذریعے تعلیم کے سلسلے میں ان کا کہنا ہے ؛

> ''پرائمری پدھر ایہو جیہی اے جتھے جے ماں بولی راہیں تعلیم دتی جاوے تاں اوہدا فہم کھُلدا اے۔ اوہنوں رٹا لاون دی عادت نہیں پیندی۔ ایہو سیانے کہندے نیں، ایہو گل یونیسف نے آکھی پر اوکڑ ایہہ ہے کہ ایہو گل ساڈے تعلیمی ماہراں دی سمجھ وچ نہیں آوندی پئی'' (81)

شریف کنجاہی نے اس کتاب کے بارے میں اپنی رائے یوں دی ہے ؛

"آصف خان ہوراں دی کتاب نوں پڑھدا ہویا میں نال نال ایہہ وی سوچ رہیا ساں کہ کیہ کجھ ورھے بعد ساڈے نصیباں وچ جھوٹے حوالے ای رہ جان گے یعنی اسیں انگریزی دی راہیں جان سکاں گے کہ ساڈا سانجھا علمی تے لسانی پچھوکڑ کیہ سی تے رگ وید تے اپنشداں وچ کیہ کیہ لکھیا ہویا اے"۔(82)

9۔ پنجابی بولی دا پچھوکڑ (محمد آصف خاں)

محمد آصف خاں نے اپنی اس کتاب میں چار عنوانات کے ذریعے پنجابی زبان کے بارے میں بحث کی ہے۔اس کتاب میں ان کا روز نامہ "امروز" میں 1959 میں شائع ہونے والا ایک مضمون "پنجابی زبان کے اجزائے ترکیبی" شامل ہے۔ "پنجابی بولی دے پچھوکڑ" کے مضمون میں انھوں نے آریاؤں کے بارے میں معلومات فراہم کی ہیں اور ان کی پانچ بولیوں، ویدی، سنسکرت، پراکرت، اپ بھرنش اور پنجابی کا جائزہ پیش کیا ہے۔ان کے خیال کے مطابق؛

"تسیں ویکھو گے کہ پنجابی بولی دا پچھوکڑ والے مضمون وچ میں ایک ہور سیدھ ورتی اے۔رگ وید وچ دسے غیر آریائی قبیلیاں بارے تفصیلی لکھیا اے۔جیہناں ول عین الحق فرید کوٹی ہوراں دا کدے دھیان نہیں گیا سی۔ پھیر اوہناں ویدی، سنسکرت، پراکرت تے اپ بھرنش وی پنجابی دے حوالے نال کدے نہیں پھرولیا سی۔ اتے پنجابی تے سنسکرت دیاں گرامری بنتراں نوں کدے چھوہیا تک نہیں سی"۔(83)

محمد آصف خاں کی تحقیق کے مطابق ماہرین لسانیات پنجابی زبان کا تعلق جس خاندان سے جوڑتے ہیں، اس سے نہیں ہے۔ان کی یہ بات ماہرین لسانیات کو دعوت تحقیق دے رہی ہے تاکہ پنجابی زبان کے تعلق کے سلسلے میں کوئی حتمی بات سامنے آسکے۔ محمد آصف خاں کی یہ کتاب لسانیات کے موضوع پر پنجابی کی بہترین کتاب ہے۔

10۔ ہور نِک سُک (محمد آصف خاں)

یہ کتاب بھی محمد آصف خاں کے علمی، ادبی اور تحقیقی مضامین پر مشتمل ہے جس کو پاکستان پنجابی ادبی بورڈ نے 2000 میں چھاپا تھا۔اس کتاب میں شامل اکثر مضامین مختلف رسالوں اور کتابوں میں چھپ چکے تھے جن کو وہ اکھٹا کر کے چھاپنا چاہتے تھے لیکن یہ کتاب ان کی وفات کے بعد چھپی۔انھوں نے ''سپت سندھو''، ''واہیک'' اور ''پنجاب دے کجھ ہور ناں'' عنوان کے تحت مضامین میں تاریخی حوالوں کے ذریعے سے پنجاب کے پرانے ناموں کے بارے میں معلومات فراہم کی ہیں۔اس کتاب میں انھوں نے مختلف قدیم زمانے میں رائج رسم الخط ان کی تاریخ اور اقسام کے بارے میں وضاحت کی ہے جن میں ''ہیر و گلفی لپی''، ''خروشٹی لپی''، ''چینی لپی'' شامل ہیں۔ان کی اس تحقیق سے نئے تحقیق کاروں کے لیے بہت آسانی ہو گئی ہے۔انھوں نے اپنی تحقیق کے مطابق لکھا ہے؛

''لپیاں دیاں زیادہ مشہور قسماں تن نیں۔''ہیرو گلفی لپی''اج توں تن ہزار سال ق م یاں ایس توں وی پہلوں ہوند وچ آئی۔ ایہدیاں اگے دو قسماں نیں اک نوں ہیراتک تے دوجی نوں ڈیموتک آکھدے نیں۔"خروشٹی لپی" عربی، فارسی، پنجابی طرح سجیوں کھبے لکھی جاندی اے۔ خروشٹی لپی وچ کل 33 مصمتے ہن جد کہ آرامی وچ 22 ہن خروشٹی لپی وچ واول اکوای سی باقی چار وادھے کر کے بنائے گئے''۔(84)

آگے خروشی رسم الخط کے بارے میں رقم طراز ہیں؛

''خروشٹی لپی تے آرامی لپیاں دے گیارہ اکھر آپو وچ رلدے ملدے ہن ایسے پاروں ایہہ من لیا گیا اے کہ آرامی لپی وچ وادھے گھاٹے کر کے خروشٹی لپی نوں گھڑیا گیا ہائی''۔ (85)

ٹیکسلا یونیورسٹی اور نالندہ یونیورسٹی کے بارے میں ان کی تحقیق ہے؛

''ٹیکسلا تے نالندا یونیورسٹی'' دی تاریخ ول جھاتی پاوندے آں تاں سانوں پتہ لگدا اے پئی ایہدا ناں سنسکرت ''تک شلا'' البیرونی نے ''تاکشر'' تے المسعودی ''تک دیش'' دی راج گدی آکھدا اے۔ رہی گل نالندا یونیورسٹی دی تے جتھے اج اسلامیہ کالج پشاور تے پشاور یونیورسٹی اے اوتھے نالندا یونیورسٹی ہوندی سی۔ گپتا بادشاہ اک ہندو سن جیہناں دی سربراہی وچ ایہہ نظام چلدا سی۔ اک ہور شے جیہڑی گوہ گوچری اے او ایہہ وے کہ ایہہ یونیورسٹی بدھ دھرم دے ''مہایاں'' دے نال تعلق رکھدی سی''۔ (86)

اس یونیورسٹی کے بارے میں انھوں نے ایک تاریخی واقعہ یوں بیان کیا ہے؛

''بختیار خلجی تے ایس دیاں فوجاں نے ایس یونیورسٹی نوں قلعہ سمجھیا تے ڈھے ڈھیری کر دتا۔ پنجویں صدی وچ شروع ہون والی نالندا یونیورسٹی اک بھلیکھے پاروں بارھویں صدی وچ تھیہ وچ وٹ گئی''۔ (87)

''ملیر'' کے عنوان سے ایک مضمون کے بعد ''پرائمری پدھر تے ماں بولی'' میں پنجابی زبان سے روا سلوک کے بارے میں خیالات کا اظہار کیا ہے۔ ''شیکسپیئر تے پنجابی''، ''شاہ حسین بارے کتاباں'' کے بعد ''کشف المحجوب پنجابی'' شریف صابر کے کیے ہوئے پنجابی ترجمہ کے بارے میں ہے۔ انھوں نے شریف صابر کے اس کام کی بہت تعریف کی ہے کیونکہ تصوف جیسے مشکل موضوع کا پنجابی میں ترجمہ کرتے ہوئے فارسی اصطلاحوں کا بھی پنجابی زبان میں ترجمہ کیا ہے۔

11۔ لیکھے جو کھے (پروفیسر سمیع اللہ قریشی)

تیرہ مضامین پر مشتمل تنقیدی مضامین کی یہ کتاب پاکستان پنجابی ادبی بورڈ نے 2002 میں چھاپی تھی۔اس کتاب سے صوفی شعرا کی شاعری، لوک کہانیوں، واروں، لوک گیتوں اور ڈراموں سے آگاہی ہوتی ہے۔پروفیسر سمیع اللہ قریشی نے ساری زندگی اردو میں ہی کام کیا ہے لیکن پنجابی ادب سے تعلق بھی قائم رکھا ہے۔اس کتاب میں انھوں نے ''خطبات اقبال دا پنجابی روپ'' کا بھرپور تنقیدی جائزہ لیا ہے۔راجا رسالو نے اس کتاب کے بارے میں لکھا ہے؛

''ایہہ کتاب اوہناں دی ورھیاں دی کھوج دا سٹا اے۔ایس کتاب وچ اوہناں لوک واراں، لوک گیتاں دااج دیاں لوڑاں تھوڑاں نوں ساہمنے رکھدیاں ہویاں بھرواں ویرواکیتا اے۔جیہدے نال پڑھیاراں تے نویں کھوج کاراں نوں بھرویں جانکاری ملے گی''۔ (88)

12۔ پنجابی نعت (ڈاکٹر آفتاب احمد نقوی)

نعت ایک ایسی صنف ہے جس میں حضور اکرم نبی آخر محمد ﷺ کی شان اور تعریف بیان کی جاتی ہے۔اس کا ذکر حضور اکرم ﷺ کی آمد سے بھی پہلے کی مقدس کتابوں میں ملتا ہے۔برصغیر میں نعت کو صرف حضور ﷺ کی ذات سے منسوب کر دیا گیا ہے اور ہر نعت کہنے والا آپ کی شان اور صفات اپنی اپنی حیثیت میں بیان کرتا چلا جا رہا ہے۔پنجابی شعری ادب میں بھی نعت کی صنف بے حد مقبول اور نبی کریم ﷺ سے محبت کے اظہار کا وسیلہ رہی ہے۔ڈاکٹر آفتاب احمد نقوی نے بھی اپنی اس کتاب کے ذریعے نبی کریم ﷺ سے اپنی محبت کا اظہار کیا ہے لیکن ان کا انداز اس لیے سب سے جدا ہے کہ انھوں نے نعت کی مکمل تاریخ کو اس کتاب میں اکٹھا کر دیا ہے۔

ڈاکٹر آفتاب احمد نقوی نے نعت کے لفظ کی تاریخ بیان کرتے ہوئے اس لفظ کے اولین استعمال سے متعلق معلومات فراہم کی ہیں۔ انھوں نے نعت کے لفظ کے عربی، فارسی، اردو اور پنجابی زبانوں میں استعمال کو بیان کیا ہے۔

راجار سالونے ان کی کتاب کے بارے میں تحریر کیا ہے؛

''بے شمار ادیباں، عالماں تے سوجھواناں اپنے اپنے انداز نال کم کیتا۔ ایہناں وچ اک ناں ڈاکٹر آفتاب نقوی (مرحوم) داوی اے۔ ڈاکٹر آفتاب احمد نقوی ہوراں دی نعت اتے تحقیق سلاہن جوگ اے۔ اوہناں نے اپنی ساری حیاتی نعت رسول ﷺ دی تحقیق دے ناویں لا چھڈی سی''۔(89)

ڈاکٹر آفتاب احمد نقوی نے اس کتاب کو نو ابواب میں تقسیم کیا ہے۔ پہلا باب لفظ نعت کی تاریخ، اصطلاحی مفہوم، فن، مضمون، اظہار کے ڈھنگ، لوازمات، اقسام، انداز، قدیم اسلوب اور جدید اسلوب کو واضح کرتا ہے۔ دوسرے باب میں نعت کے محرکات، ذریعہ تبلیغ دین، مقبولیت کے اسباب اور جدید دور میں استعمال ہونے والے ذرائع مثلاً ریکارڈ، کیسٹ، ریڈیو اور ٹی وی کا تذکرہ موجود ہے۔ تیسرے باب میں نعت کے ماخذ اور تاریخ بیان کی گئی ہے جن میں الہامی صحیفے اور کتابیں، غیر الہامی کتابیں، قرآن حکیم، احادیث رسول ﷺ، سیرت اور نعت کے ماخذ، عربی میں سب سے پہلی نعت، حضرت ابو طالب کی نعت سے لے کر امام بوصیری اور دیگر نعت گو شعرا کا تذکرہ اور برصغیر میں نعت گوئی کے مضامین بیان کیے گئے ہیں۔ چوتھا باب نعت کی دیگر اصناف سے متعلقہ ہے جن میں شلوک، غزل، کافی، مرثیہ، قصیدہ، گلزار، ستوارہ، باراں ماہ، ڈیوڑھ، مثنوی، نظم، سلام، جنگ نامے، حلیہ شریف، وفات نامے، نور نامے، شجرہ، معراج نامے، سفر نامے، دوہڑہ، مہندی، جگنی، ماہیا، لوری، چٹھی، سہرا، جندڑی، سوہلے، چرخہ نامہ، ڈھولا، چوڑھیٹری نامہ وغیرہ شامل ہیں۔

پانچویں باب میں سیاسی، سماجی اور ادبی پس منظر بیان کرتے ہوئے بابا فرید، حاجی بابا رتن، گورونانک، عبدی کودھن، شاہ حسین، نوشہ گنج بخش، حافظ برخوردار، سلطان باہو، پیر محمد کاسبی اور شاہ مراد کے نعتیہ کلام کو موضوع بنایا گیا ہے اور ان کے کلام سے منتخب شعر دیے گئے ہیں۔ چھٹے باب میں محمد صدیق لالی، چراغ اعوان، علی حیدر، بلھے شاہ، غلام قادر بٹالوی، حافظ برخوردار رانجھا، لطف علی بہاولپوری، وارث شاہ، سچل سرمست، حامد شاہ عباسی، احمد یار مرالوی، غلام محی الدین قصوری اور قادر یار کے نعتیہ کلام کا تذکرہ اور تبصرہ کرتے ہوئے منتخب نعتیہ اشعار دیے گئے ہیں۔ ساتواں باب مولوی غلام رسول، سید فضل شاہ نواں کوٹی، مولوی غلام رسول عالمپوری، خواجہ غلام فرید، میاں محمد بخش، میاں ہدایت اللہ، محمد بوٹا گجراتی، نور بیگم، سائیں احمد علی، پیر مہر علی شاہ، استاد عشق لہر، سر شہاب الدین، مولا بخش کشتہ، میلا رام، استاد کرم امرتسری

اور اس وقت کے دیگر شعرا کا تذکرہ اور ان کے نعتیہ کلام کا احاطہ کرتا ہے۔ باب نمبر آٹھ میں پاکستان کے دور کے نعت گو شعرا کا تذکرہ اور کلام دیا گیا ہے۔ان شعرا میں حکیم صمصام، پیر فضل گجراتی، فقیر محمد فقیر، دائم اقبال دائم، عارف عبدالمتین، حفیظ تائب، اعظم چشتی، محمد علی ظہوری، عبدالستار نیازی، تنویر بخاری اور دیگر شعرا شامل ہیں۔ آخری اور نویں باب میں نعت کے تاریخی پس منظر میں جدید نعت گوئی اور اس وقت کے اسلوب کو بیان کیا گیا ہے۔اس باب میں پاکستان کے قیام، مشرقی پاکستان کے المیے اور جدید ادبی انداز میں نظم جس میں معریٰ اور آزاد نظم وغیرہ شامل ہیں ان کے ذریعے نعت گوئی کو بیان کیا گیا ہے۔

ڈاکٹر آفتاب احمد نقوی نے کتاب کے آغاز میں لکھا ہے؛

''نعت گو شاعر بھاویں کو جھاتے گندہ مندہ کیوں نہ ہووے پر اوہ جس عظیم ذات دی مدح کر رہیا اے، اوہ ذات پردے رکھن، گناہ بخشن تے معافیاں دین وچ اپنا کوئی ثانی نہیں رکھدی۔ اوہ تے عام طور تے اپنے چاہن والیاں نوں کدی اوسے ویلے تے کدی خواب دی حالت اندر بردہ شریف توں نواز دیندی اے''۔ (90)

13۔ پاکستانی زباناں (پروین ملک)

پروین ملک صاحبہ پاکستان پنجابی ادبی بورڈ کی سیکریٹری ہونے کے علاوہ نہایت اعلیٰ پائے کی مصنف بھی ہیں۔ان کی یہ کتاب مختلف مصنفین، محققین، مترجمین، مؤرخین، شعرا اور ماہرین لسانیات کے پنجابی سہ ماہی رسالے پنجابی ادب میں چھپنے والے مضامین پر مشتمل ہے۔اس کتاب میں مختلف موضوعات پر لکھے گئے مضامین کو اکٹھا کیا گیا ہے جس سے پنجابی ادب کے قارئین کے علاوہ نئے محققین کو بھی کافی مدد مل سکتی ہے۔پروین ملک نے پہلی گل میں لکھا ہے؛

''رسالہ پنجابی ادب دی ٹُڈھ توں کوشش رہی اے بئی پاکستانی زباناں دِی گھڑِتَل، بُنت، لفظالی تے اُساری بارے کھوج پَرکھ دے سارے پکھ چھاپے جان، ایس لڑی وِچ بڑے کاری وَندے مضمون چھاپے گئے۔ پروپلے دے نال نال ایہو جیہیاں لِکھتاں کجھ اوہلے ہو جاندیاں نیں تے نویں کھوجکار لئی اوہناں نوں لبھنا، ڈھونڈنا بڑی اوکھت دا کارن بنداا ے''۔(91)

اس کتاب میں رسالہ ''پنجابی ادب'' کے شمارہ نمبر 1 سے لے کر شمارہ نمبر 99 میں چھپنے والے مختلف محققین کے تحقیقی مضامین میں سے منتخب کردہ 24 مضامین شامل کیے گئے ہیں۔ قاضی جاوید کے مضمون ''پنجاب وچ فلسفہ وحدت الوجود'' میں بتایا گیا ہے کہ پنجاب میں مسلمانوں کی آمد سے پہلے ہندو فلسفے کے مختلف مکتب اور بدھ مت والے وحدت الوجود کا پرچار کر رہے تھے۔ یہاں پر مسلمانوں کی آمد کے بعد تصوف کے اس اسلامی مکتب کے فلسفے کو یہاں پر رائج کیا گیا۔ اس مضمون میں سید علی ہجویری سے لے کر پیر مہر علی شاہ کے دور تک کے مختلف اہل تصوف اور صوفیوں کے نظریات کے بارے میں معلومات فراہم کی ہیں۔ ڈاکٹر سیف الرحمٰن ڈار کے مضمون کا عنوان ''مسلماناں دے آون توں پہلوں پنجاب وچ ورتیاں گئیاں لپیاں دا ایک جائزہ تے اوہدی تاریخی تے ثقافتی اہمیت'' ہی اس کی نوعیت کو واضح کر دیتا ہے۔ اس مضمون میں یہاں پر موجود تہذیب اور ثقافت کے مختلف ادوار میں موجود اور رائج رسم الخط کے بارے میں بہت سی معلومات فراہم کی گئی ہیں۔ فضل فرید لا لیکا نے خواجہ غلام فرید کی شاعری میں استعمال کردہ تصوف کی اصطلاحات کے الگ الگ شارحین کے مطالب کو زیر بحث لا کر اپنے خیالات پیش کیے ہیں۔ محمد آصف خاں کا پنجاب کے نام پر تحقیقی مضمون ''پنجاب ناں کدوں توں'' شامل ہے جس میں انھوں نے بہت سے تاریخی حوالوں سے پنجاب کے نام کے بارے میں معلومات فراہم کی ہیں۔ اگلے مضمون میں محمد آصف خاں نے پنجاب کے کچھ اور نام اور ان کی تاریخی حیثیت پر تاریخی کتابوں کے حوالوں سے معلومات دی ہیں۔ ''پنجابی املا'' کے موضوع پر محمد آصف خاں کا ایک بھرپور تحقیقی مضمون ہے جس میں تحریر کے فن اور علم کو تاریخ کے پس منظر میں آغاز سے لے کر اب تک کے دور میں مستعمل تحریری انداز کو بیان کیا گیا ہے۔ اس مضمون کے ذریعے فن تحریر میں ہونے والی ترقی کو مرحلہ وار سمجھا جا سکتا ہے۔

محمد آصف خاں نے پنجابی کے علاوہ دیگر زبانوں کے تحریر کیے جانے کے انداز وغیرہ پر بھی روشنی ڈالی ہے۔ پروفیسر ریاض احمد شاد کا ایک مختصر مضمون بھی ''پنجابی املا'' سے متعلق ہے جس میں پنجابی املا کے چند مسائل کو زیر بحث لایا گیا ہے۔'' پنجابی ادب دی لسانی روایت'' میں محمد آصف خاں نے پنجابی ادب کے آغاز کے بارے میں اپنی تحقیق پیش کی ہے۔اس کے بعد پنجابی زبان کو ذریعہ تعلیم بنانے اوراس کے جائز مقام کے بارے میں محمد آصف خاں، محمد صفدر میر اور ڈاکٹر اظہر محمود چودھری کے تین مضامین ہیں جو ان معاملات اور مسائل کو واضح کرتے ہیں۔ڈاکٹر غلام علی الانا معروف ماہر تعلیم اور لکھاری تھے۔ان کے سرائیکی پر دو مضامین نہایت کارآمد اور تحقیقی حیثیت کے حامل ہیں۔اس کے بعد پروفیسر شریف کنجاہی اور سردار محمد خان کے دو مضامین بھی سرائیکی کے حوالے سے ہیں۔ان چاروں مضامین میں سرائیکی بولی یا لہجے کے بارے میں بہت سی معلومات اور تاریخی حقائق فراہم کیے گئے ہیں جن کے ذریعے سرائیکی کی تاریخی، ثقافتی اور علمی حیثیت واضح ہوتی ہے۔

عین الحق فرید کوٹی نے خواجہ غلام فرید کی شخصیت کو بطور ماہر لسانیات بیان کیا ہے۔ان کے مطابق خواجہ غلام فرید پنجابی کے علاوہ عربی، فارسی، اردو، سندھی اور مارواڑی زبانوں کے عالم تھے اور انھوں نے پنجابی کے علاوہ عربی، فارسی اور اردو میں بھی شاعری کی ہے۔پروفیسر محسن عباسی نے خواجہ غلام فرید پر محمد آصف خاں کی کتاب ''آکھیا خواجہ غلام فرید نے'' میں دیے گئے سندھی الفاظ کے حوالے سے بات کی ہے۔پوٹھوہاری پر سوہندر سنگھ بیدی/ جمیل احمد پال کا نہایت بلیغ اور وضاحت سے بھرپور مضمون ہے۔اس مضمون میں پوٹھوہار میں رائج لہجے کے بارے میں الفاظ کی مثالوں کے ذریعے وضاحت کی گئی ہے۔عاشق رحیل کا ایک مضمون ''پشتو املا دا مسئلہ'' کے عنوان سے شامل ہے۔ جس میں پنجابی کی طرح سے پشتو زبان میں املا کے مسئلے پر روشنی ڈالی گئی ہے۔نادر جاجوی کا تحقیقی مضمون ''سانجھے لفظ'' کے نام سے ہے جس میں مختلف لہجوں اور شعرا کی شاعری میں مستعمل ایک جیسے الفاظ اور ان کا استعمال واضح کیا گیا ہے۔ سردار محمد خان لسانیات کے ماہر تھے،ان کا ''زبان تے بولی'' کے عنوان سے مضمون نہایت مفید اور معلوماتی ہے۔ محمد آصف خاں کا تاریخ پنجاب کے حوالے سے تنقیدی اور تحقیقی مضمون بھی شامل ہے۔ سجاد حیدر کا مضمون ''پاکستانی زباناں تے قومی سالمیت'' اس لحاظ سے اہمیت کا حامل ہے کہ اس میں زبانوں کے آغاز سے لے کر پاکستانی زبانوں اور ان کی ترویج پر بات کی گئی ہے۔ ''پاکستانی زباناں لئی سانجھی لپّی'' ڈاکٹر الیاس عشقی کا خاصا فصیح مضمون ہے جس میں مختلف پاکستانی زبانوں کے صوتی اور تحریری

نظام پر بات کی گئی ہے۔انھوں نے مختلف ماہرین لسانیات کے حوالے سے اپنی بات کو واضح کرنے کی کوشش کی ہے۔اس طرح سے پاکستانی زبانوں کے لیےایک سارسم الخط اختیار کرنے کے سلسلے میں ان کا مضمون نہایت کارآمد ہے۔

14۔ پنجابی رانی (ڈاکٹر دلشاد ٹوانہ)

اس کتاب کو ڈاکٹر دلشاد ٹوانہ نے مرتب کیا ہے۔اس سے پہلے وہ فیروز دین شرف حیاتی، فکر تے فن پر پی ایچ ڈی کا مقالہ تحریر کر چکی ہیں جس کو پاکستان پنجابی ادبی بورڈ نے 2011 میں چھاپا تھا۔اس کتاب میں فیروز دین شرف کی پنجابی شاعری کا انتخاب شامل کیا گیا ہے۔فیروز دین شرف جدید شاعری کرنے والوں میں شامل ہیں۔ان کی شاعری میں عوامی رنگ نمایاں ہے اور ان کے کئی مصرعے ضرب المثل بن چکے ہیں۔ان کی پنجابی زبان میں تینتیس کتابیں شائع ہو چکی ہیں جن میں سے دو کتابیں شاہ مکھی اور اکتیس گرمکھی میں ہیں۔ڈاکٹر دلشاد ٹوانہ نے لکھا ہے؛

''اس چون وچ میں اوہناں دی اوہ شاعری شامل کیتی اے۔ جیہڑی لوکاں دے دلاں دی دھڑکن رہی اے۔ ہر پڑھن والا ایہہ سمجھدا اے کہ ایہہ اوہناں دے دل دی پکار اے۔ کئی نظماں پڑھ کے انسان تڑپ اٹھدا تے کئی واری رون لگ جاندا اے۔ جیوں جلیانوالہ باغ، خونی وساکھی، ماں دا دل، ہواڑ تے گواہی وغیرہ''۔(92)

''اس چون وچ تہانوں پنجاب تے پنجابی زبان دے پیار دا مزا وی آوے گا۔ حسن عشق، پیار محبت تے ہجر وچھوڑے دا کرلاٹ وی محسوس کروگے۔ اخلاقی سماجی تے سیاسی شاعری نوں پڑھ کے اوس سمیں دے لوکاں دے حالات توں وی جانکاری ملے گی''۔ (93)

فیروز دین شرف کی یہ منتخب شاعری درشن سنگھ آوارہ کی مرتب کردہ ''شرف رچناولی بھاگ پہلا''، '' بھاگ دوجا'' اور ''دکھاں دے کیرنے'' سے لی گئی ہے جن کو ''بھاشا وبھاگ، پنجاب، پٹیالہ'' نے گورمکھی میں چھاپا تھا۔ اس کتاب میں پچھتر عنوانات پر مشتمل شاعری میں حمد، نعتیں، نوحہ، دوہڑے، ڈیوڑھ، چٹھی، رباعیاں، قصیدہ، گیت اور غزلیں شامل ہیں۔ یہ کتاب 198 صفحات پر مشتمل ہے جس میں ڈاکٹر دلشاد ٹوانہ نے ''میرے ولوں'' میں اس کتاب کو مرتب کرنے کے مقصد کے بارے میں بتایا ہے۔ اس کے بعد فیروز دین شرف کے بارے میں چند باتیں کی گئی ہیں۔ ڈاکٹر دلشاد ٹوانہ کے مطابق؛

''کوشش کیتی گئی اے کہ شرف دی شاعری دے ہر انگ دا پھل اکٹھا کر کے ایسا گلدستہ تیار کیتا جاوے جیہڑا تھاڈے دل و دماغ نوں معطر کرے''۔(94)

بولی اپنی نال پیار رکھاں ایہہ گل آکھیوں کدی نہیں سنگھداہاں

موتی کسے سہاگن دی نتھ داہاں ٹکڑا کسے پنجابن دی ونگ داہاں

ملے مان پنجابی نوں دیش اندر عاشق مڈھوں میں امنگ داہاں(95)

تصوف

1۔ وحدت الوجود تے پنجابی شاعری (علی عباس جلالپوری)

پروفیسر سیّد علی عباس جلالپوری روشن خیالی کی تحریک کے ایک نمائندہ دانشور تھے۔ سماجیات، عمرانیات، ادبیات اور تاریخ وسیاست کے وسیع مطالعہ نے انہیں صاحب الرائے بنادیا تھا۔ وہ جو کچھ سوچتے اور جن نتائج تک ان کا ذہن پہنچتا، اسے قلم کی نوک پر لے آتے۔ انہیں اپنے ماحول کے جمود کا شدید احساس تھا اور انہیں یہ بھی بخوبی علم تھا کہ یہاں روائتی اپروچ (approach) سے ہٹ کر رائے کے اظہار کے ضمن میں بعض اوقات کتنی بھاری قیمت ادا کرنی پڑتی ہے لیکن وہ نہایت بے باکی سے اپنے خیالات کا اظہار کرتے تھے۔ آج بھی ان کی کتابیں بڑے ذوق وشوق سے اس لیے پڑھی جاتی ہیں کہ انھوں نے کسی دوسرے کے نظریے کے زیر اثر نہیں بلکہ ذاتی تحقیق اور علم کے ذریعے سے اظہار خیال کیا ہے۔

علی عباس جلالپوری جیسے کہنہ مشق محقق اور لکھاری کی یہ کتاب اپنے اندر اسرار کا ایک جہاں لیے ہوئے ہے۔ انھوں نے کتاب کا آغاز ان الفاظ میں کیا ہے؛

"وحدت الوجود۔ ۔۔ حقیقی وجود اِکوّ اے۔ ۔۔ایس نوں فارسی وچ ہمہ اوست (سبھ کجھ خدا اے)۔۔۔تے ہندی وچ ہر میں ہر۔۔۔(ہر شے وچ خدا اے)" (96)

اس کتاب کا پہلا ایڈیشن 1977 میں چھپا تھا اور اب تک اس کے پانچ ایڈیشن شائع ہو چکے ہیں جو اس کتاب کی مقبولیت، اہمیت اور قدر بیان کرنے کے لیے کافی ہیں۔ تصوف کے دو دھڑے ہیں جن میں سے ایک اس کائنات کو اس کے خالق سے الگ نہیں مانتا یعنی در حقیقت ایک ہی وجود ہے۔ یونان میں 'پارمی نائیدس' اور 'زینوالیاطی' نے اس کی بنیاد رکھی۔ ہندوستان میں 'اپنشد' کے لکھنے والوں سے لے کر ویدانت کا مبلغ 'شنکر' اور سکھ گورو سب اسی کے قائل تھے۔ ان

کے مطابق 'پرش' اور 'پرکرتی' یعنی 'برہمن' اور 'مایا' میں کوئی دوری نہیں ہے۔ مسلمان ہونے کی پہلی شرط توحید ہے، قرآن پاک اور احادیث مبارکہ میں وحدانیت کا ذکر بار بار آیا ہے۔ 'وحدت الوجود' کا تصور اسلامی دنیا میں متعارف کرانے کا سہرا محی الدین ابن عربی کے سر ہے اور انھوں نے ساری عمر اس کا پرچار کیا۔ وہ کہتے ہیں کہ حقیقت میں یہ خدا کی صفات ہی ہیں جو انسان کے روپ میں ظاہر ہوئی ہیں یعنی کائنات اور خدا ایک ہیں۔ پنجابی زبان کے زیادہ تر شعرا جن میں بابا فرید، شاہ حسین، بلھے شاہ، سلطان باہو، خواجہ غلام فرید وغیرہ وحدت الوجود کے ماننے والے تھے۔ پنجابی شاعری کی بات کی جائے تو اگر یہ صرف کسی حسی تجربے کی بنیاد پر ہوتی تو آج کے ادب میں اس کا مقام علاقائی ادب کی شعری روایت سے بڑھ کر نہ ہوتا لیکن جس چیز نے پنجابی شاعری کو ختم نہ ہونے والی تخلیقی قوت عطا کی ہے وہ اس کا روحانی پہلو ہے۔ بالالفاظ دیگر یہ شاعری سے آگے بڑھ کر ایک روحانی واردات ہے جس وجہ سے پنجابی شاعری کی تہہ در تہہ کئی پرتیں ہیں۔

پنجابی شاعری شروع سے ہی ایسے روحانی تجربے کی حامل رہی ہے لیکن اس کی ادبی حقیقت بہت بعد میں تسلیم کی گئی جبکہ آج بھی یہ ایسا گہرا روحانی تجربہ ہے جس میں شعر کہنے والا اور سننے والا دونوں محو ہو جاتے ہیں کیونکہ پنجابی شاعری کا کمال یہ ہے کہ یہ باہر سے انسان کے دل کے تار کو چھیڑتی ہے۔ شاعری کا یہ کمال حاصل کرنا آسان نہیں ہے بلکہ یہاں تک پہنچنے کے لیے بہت تجربے اور علم کی ضرورت ہوتی ہے۔ عمومی طور پر صوفیانہ شاعری کو ترک دنیا کرنے والوں کی فلسفیانہ شاعری سمجھا جاتا ہے۔ یہ نکتہ نظر ایسے لوگوں کا ہے جو مشرق یا مغرب میں موجود تصوف کی تحریک کی سمجھنے سے قاصر تھے یا انھوں نے اس کی کوشش ہی نہیں کی اور ان صوفیوں کے کردار کو کسی قسم کی اہمیت ہی نہیں دی۔

پنجاب میں صوفی شعرا کا کردار یہ ہے کہ پہلی سطح پر وہ اپنی ذات کی نفی کرنے کے لیے ہر ایسی چیز کی نفی کرتے ہیں جو ان کو اپنی حیثیت اور ذات کی اہمیت کا احساس دلاتی ہو اور یوں وہ عام مخلوق کا حصہ بن جاتے ہیں۔ دوسری سطح پر صوفی اپنی ذات کی نفی اور تزکیہ نفس کے ذریعے جس مقام کو حاصل کرتا ہے، اس روحانی تجربے اور واردات قلبی کو اپنے الفاظ کی شکل میں بیان کرتا ہے۔ بابا فرید، شاہ حسین، بلھے شاہ، سلطان باہو اور دیگر صوفی شعرا ایسے ہی مقام پر پہنچ کر رمزوں، کنایوں اور اپنے تخلیق کردہ استعاروں کے ذریعے اظہار خیال کرتے ہیں۔ پنجابی شعرا کا یہ بھی کمال ہے کہ انھوں نے اپنی تہذیب و ثقافت سے وابستہ اشیا کے ناموں اور کرداروں کو استعاراتی انداز میں استعمال کیا اور اس کو ایسا انداز عطا کیا جس سے وہ عوام و خواص میں مقبولیت حاصل کر گئے۔

پنجابی کے صوفی شعرا صرف تصوف ہی بیان نہیں کرتے تھے بلکہ عام لوگوں میں بوُد باش اختیار کرتے ہوئے ان کے دکھ درد کے شریک ہوتے تھے۔ان کو اپنے ارد گرد کے سیاسی اور سماجی حالات کا پورا ادراک تھا اور اس کی اچھائیوں یا برائیوں کا شعور تھا۔ بابا فرید کا کہنا؛

فریدا کوٹھے منڈپ ماڑیاں ایت نہ لائیے چت

یا یہ کہنا؛

فرید کوٹھے منڈپ ماڑیاں اساریندے بھی گئے

نہ صرف کمزور لوگوں کی حوصلہ افزائی کرتا تھا بلکہ بادشاہوں کو بھی اس بات کا احساس دلاتا تھا کہ ان کی بادشاہی ہمیشہ رہنے والی نہیں ہے۔اسی طرح سے شاہ حسین کا یہ کہنا؛

تخت نہ ملدے منگے

اپنے اندر معنوں کا ایک جہاں رکھتا ہے۔ان شعرا کے ادوار ایسے تھے کہ جب حق بات کرنے والے کی زبان بند کر دی جاتی تھی اس لیے انھوں نے اپنی بات کرنے کے الگ الگ انداز اپنائے۔اس لیے ان کی شاعری کی کئی پرتیں ہیں اور ہر طبقے کے لوگ ان کی شاعری سے اپنی مرضی اور مطلب کے معنی اخذ کر لیتے ہیں۔ان شعرا کی شاعری میں زمان و مکان کی قید سے آزادی، موت ایک جسمانی عمل اور ابدی وصال کی باتیں ہیں۔انھوں نے مر جانے کا کبھی ذکر نہیں کیا کیونکہ اس جسمانی عمل کا روح سے کوئی تعلق نہیں ہے اور اس کے بعد ایسی وصل ہے جس میں جسمانی قید بھی نہیں ہے۔اسی لیے بلھے شاہ کہتے ہیں؛

بلھے شاہ اساں مرنا ناہیں، گور پیا کوئی ہور

علی عباس جلالپوری نے اپنی کتاب ''وحدت الوجود تے پنجابی شاعری'' میں حضرت علی ہجویری کی کتاب ''کشف المحجوب'' کے حوالے سے ملامتی فکر رکھنے والے تین فرقوں کا ذکر کرتے ہیں۔

1۔ایک جو نیک ہوتے ہیں اور دوسرے لوگ بلاوجہ ان کے خلاف ہو جاتے ہیں۔
2۔دوسرے وہ جو جان بوجھ کر خلاف شریعت کام کرتے ہیں تاکہ لوگوں کی لعن طعن سے اپنے نفس کو مار سکیں۔
3۔تیسرے وہ جو مکمل طور پر شرعی پابندیوں سے الگ ہو جاتے ہیں۔

اس کتاب کو پانچ ابواب میں تقسیم کیا گیا ہے۔پہلے باب میں پنجاب کی تہذیبی، ثقافتی اور سیاسی تاریخ بیان کی گئی ہے۔دوسرے باب میں ہندوستان کے فلسفیوں کا تذکرہ کیا ہے اور بدھ مت کی فلسفیانہ روح کو بیان کیا ہے۔ ویدانت، برہمن اور بھگتی لہر کا تفصیل سے بیان کرتے ہوئے شعری حوالے بھی دیے ہیں۔ تیسرا باب یونانی ریت کے بارے میں ہے جس میں عہد قدیم سے لے کر فلاطینوس تک کو بیان کیا ہے۔اس کے بعد اس ریت نے مشرق کو کس طرح اپنے حصار میں لیا اور بڑے بڑے دانشوروں کو کیسے اپنا گرویدہ بنایا، اس کا ذکر کیا ہے۔ چوتھے باب میں تصوف کی بنیاد بیان کرتے ہوئے سانحہ کربلا کے بعد عالم اسلام کے چودہ صوفیانہ سلسلوں کا تعارف دیا ہے۔ محی الدین ابن عربی اور منصور حلاج کے بارے میں کافی تفصیل سے بحث کی گئی ہے۔ پانچویں باب وحدت الوجود تے پنجابی شاعری میں پنجاب کے صوفی شعرا کے حوالے سے وحدت الوجود اور تصوف کے موضوعات کو بیان کیا ہے۔

سید علی عباس جلالپوری نے ''لکھاری ولوں'' کے عنوان کے نیچے لکھا ہے؛

''ایس پکھوں پنجابی دی صوفیانہ شاعری نوں نویکلا تے اچا مقام دتا جاسکدا اے کہ اوہناں دی شاعری وچ

مشرق تے مغرب دیاں تن ریتاں داسنگ ہو گیا۔

1۔یونانی سریت تے اشراق
2۔ہندی ویدانت تے بھگتی لہر
3۔مسلماناں دا تصوف تے عرفان

ایہو گل اسیں دنیادی کسے ہور قوم دی صوفیانہ شاعری دے بارے نہیں کہہ سکدے''۔(97)

علی عباس جلالپوری کی یہ کتاب پنجابی صوفی شعرا کے کلام کے پس منظر اور اس کے سطح در سطح اسرار کو سمجھنے کے سلسلے میں نہایت مدد گار ہے اور لکھاری کے مطابق؛

''پنجابی دیاں صوفی شاعراں دی ایس بہو ملی دین دا نکھیڑا کرن لئی میں تناں ریتاں دا ویروا کر کے ایہناں دے سانجھے اصولاں دی روشنی وچ پنجابی دی صوفیانہ شاعری نوں سمجھن تے سمجھاون دا ترلا ماریا اے''۔ (98)

2۔ پنجاب دی صوفیانہ روایت (قاضی جاوید)

پاکستان پنجابی ادبی بورڈ کی تصوف پر یہ دوسری کتاب ہے جس کو 1993 میں چھاپا گیا تھا۔ قاضی جاوید نے اس کتاب کو تین حصوں 'ابتدائی دور'، 'آزادی خیال دا زمانہ' اور 'عہد شکست' میں تقسیم کیا ہے۔ کتاب کے ابتدائی حصے میں سید علی ہجویریؒ، خواجہ معین الدین چشتی اجمیریؒ، بابا فریدؒ، شیخ بہاء الدین ذکریا ملتانیؒ اور اس دور کے دیگر بزرگوں کا بیان ہے۔ دوسرے میں بابا گرونانک، شاہ حسینؒ، سلطان باہوؒ، میاں میرؒ اور بلھے شاہؒ تک کے زمانے کے بزرگوں کا ذکر ہے۔ تیسرے باب میں خواجہ نور محمد مہاروی، خواجہ شاہ محمد سلیمان تونسوی، خواجہ شمس الدین سیالوی، خواجہ فرید، سید مہر علی شاہ کی زندگی اور شاعری کے بارے میں معلومات موجود ہیں۔ محمد آصف خاں نے قاضی جاوید کو ان الفاظ میں خراج پیش کیا ہے؛

''قاضی جاوید ہوری نرا تصوف نوں ای موضوع نہیں بناؤندے سگوں اوہ ایس راہے ٹرن والے ہر پاندھی دے آل دوالے، ویلے تے اودو کے سیاسی حالات نوں اکھوں پروکھے نہیں رکھدے۔ انج ہر پاندھی دی سوچ، کن تے کرنی نوں سمجھن وچ ودھیرے مدد ڈھیندی اے''۔ (99)

حوالے باب سوم

1۔ پاکستان میں ادبی رسائل کی تاریخ،اسلام آباد،اکادمی ادبیات،1992،ص3۔

2۔ حضرت بلھے شاہ جی دی شاعری دے دو پکھ (مضمون)، سالنامہ ساہت،ایڈیٹر الیاس گھمن،لاہور،1996، ص482۔

3۔ مضمون نگار،خالد مسعود خان (یہ مضمون برمنگھم میں منعقدہ سلطان باہو کانفرنس میں پڑھا گیا)

4۔آکھیا بابا فرید نے،لاہور، پاکستان پنجابی ادبی بورڈ، 1989،ص37۔

5۔ ایضاً،ص45۔

6۔ایضاً،ص6۔

7۔غلام رسول عالمپوری، مولوی،احسن القصص،لاہور، پاکستان پنجابی ادبی بورڈ، 1994،ص-الف۔

8۔ مختصر تاریخ زبان وادب، پنجابی،اسلام آباد، مقتدرہ قومی زبان،2009،ص167۔

9۔ عین الحق فرید کوٹی،ہیر چراغ اعوان، لاہور، پاکستان پنجابی ادبی بورڈ، ص3۔

10۔ ایضاً،ص23۔

11۔غلام حیدر مستانہ، گلزار سسی،لہور، پاکستان پنجابی ادبی بورڈ،1978،ص4۔

12۔ مختصر تاریخ زبان وادب، پنجابی،اسلام آباد، مقتدرہ قومی زبان،2009،ص262۔

13۔افضل پرویز، کہنداسائیں،لاہور، پاکستان پنجابی ادبی بورڈ،2011،ص18۔

14۔ مختصر تاریخ زبان وادب، پنجابی،ص157۔

15۔احمد حسین قریشی،قلعداری،ڈاکٹر،جنگ نامہ امام حسین،لاہور، پاکستان پنجابی ادبی بورڈ،1979،ص12۔

16۔میاں محمد بخش، سیف الملوک،ص484۔

17۔ کلیات لالی،لاہور، پاکستان پنجابی ادبی بورڈ،1982،ص6۔

18۔ محمد حنیف مہر کاچیلوی، پنج تارے،لاہور، پاکستان پنجابی ادبی بورڈ، 1984،ص5۔

19۔ مختصر تاریخ زبان وادب، پنجابی،ص144۔

20۔ بیدار بخت، ہیر دمودر، مجلہ ''مخزن'' لاہور، شمارہ: 21، صفحات 62۔63۔

21۔ خلش پیر اصحابی، ملتانی مرثیہ، لاہور، پاکستان پنجابی ادبی بورڈ، 1982، ص 9۔

22۔ محمد آصف خاں، کافیاں شاہ حسین، لاہور، پاکستان پنجابی ادبی بورڈ، 1987 ص 13۔

23۔ محمد باقر، ڈاکٹر، ہیر وارث شاہ، لاہور، پاکستان پنجابی ادبی بورڈ، 2003، ص 5۔

24۔ ہیر وارث شاہ، ص 5، 6۔

25۔ ہیر وارث شاہ، ص 8۔

26۔ ایضاً۔

27۔ علی حیدر، کلیات علی حیدر، لاہور، پاکستان پنجابی ادبی بورڈ، 1988، ص 4۔

28۔ ایضاً۔

29۔ محمد آصف خاں، واراں دے پاتر (مضمون)، مشمولہ، لعلاں دی پنڈ، مرتبہ اقبال صلاح الدین، لاہور،
عزیز بک ڈپو، 1997، ص 156۔

30۔ مختصر تاریخ زبان و ادب پنجابی، ص 108۔

31۔ ایضاً۔

32۔ قاضی جاوید، پنجاب کے صوفی دانشور، لاہور، فکشن ہاؤس، 2010، ص 186۔

33۔ بلھے شاہ کی جیون کہانی www.nawaiwaqt.com.pk۔

34۔ محمد آصف خاں، آکھیا بلھے شاہ نے، لاہور، پاکستان پنجابی ادبی بورڈ، 1999، ص 40۔

35۔ آکھیا بلھے شاہ نے، ص 49۔

36۔ آکھیا بلھے شاہ نے، ص 15۔

37۔ نعیم احمد، ڈاکٹر، آکھیا بلھے شاہ نے، پنجابی ادب تماہی، لاہور، 7 شمارہ نمبر 26، اپریل-جون 1993، ص 71۔

38۔ سعید بھٹہ، ڈاکٹر، سر سانوں رتی پریت، لاہور، پاکستان پنجابی ادبی بورڈ، 1993، ص 15۔

39۔ سر ساویں رتی پریت، پنجابی ادب، تماہی لہور، جلد نمبر 8، شمارہ نمبر 30، اپریل جون 1994، ص 113۔

40۔ مقدمہ دیوانِ خواجہ غلام فرید۔

41۔ آکھیا خواجہ غلام فرید نے، لاہور، پاکستان پنجابی ادبی بورڈ، 1994، ص 42۔

42۔ فدا حسین فدا، ابوالطاہر، کلیات خوش طبع، لاہور، پاکستان پنجابی ادبی بورڈ، 1994، ص 23۔

43۔ ایضاً۔

44۔ آکھیا میاں جوگی نے، لاہور، پاکستان پنجابی ادبی بورڈ، 1998، ص 11۔

45۔ ایضاً۔

46۔ آکھیا میاں جوگی نے، ص 12۔

47۔ آکھیا میاں جوگی نے، ص 16۔

48۔ ایضاً۔

49۔ آکھیا میاں جوگی نے، ص 15، 16۔

50۔ رحیم طلب، آکھیا مبارک شاہ نے، لاہور، پاکستان پنجابی ادبی بورڈ، 1997، ص، 6۔

51۔ شاہ جور سالو (چونویں کلام دا ترجمہ)، لاہور، پاکستان پنجابی ادبی بورڈ، 1997، ص 6۔

52۔ شاہ جور سالو (چونویں کلام دا ترجمہ)، ص 9۔

53۔ چندل پریتی، لاہور، پاکستان پنجابی ادبی بورڈ، 1997، ص 11۔

54۔ نانک بابا، آکھیا بابا نانک نے، لاہور، پاکستان پنجابی ادبی بورڈ، 1988، ص 3۔

55۔ سید اختر جعفری، ڈاکٹر، قصہ شاہ منصور، لاہور، پاکستان پنجابی ادبی بورڈ، 1999، ص 16۔

56۔ قصہ شاہ منصور، ص 7۔

57۔ قصہ شاہ منصور، ص 14۔

58۔ عبدالغفور قریشی، پنجابی ادب دی کہانی، لاہور، پاکستان پنجابی ادبی بورڈ، 1987، ص 13۔

59۔ صابر آفاقی، ڈاکٹر، گوجری ادب، لاہور، پاکستان پنجابی ادبی بورڈ، 1985، ص 11۔

60۔ محمد آصف خاں، سندھی ادب، لاہور، پاکستان پنجابی ادبی بورڈ، 1991، ص 5۔

61۔ شفقت تنویر مرزا، ادب راہیں پنجاب دی تاریخ، لاہور، پاکستان پنجابی ادبی بورڈ، 1989، ص 7۔

62۔ ایضاً۔

63۔ سندھی ادب، ص 5۔

64۔ عبدالرزاق صابر، ڈاکٹر، بلوچی ادب، لاہور، پاکستان پنجابی ادبی بورڈ، 1996، ص 10۔

65۔ بلوچی ادب، ص7۔

66۔ محمد یٰسین ظفر، ڈاکٹر، پوٹھوہار دی پنجابی شاعری، لاہور، پاکستان پنجابی ادبی بورڈ، 1997، ص8۔

67۔ پوٹھوہار دی پنجابی شاعری، ص14۔

68۔ آزادی مگروں پنجابی نظم، لاہور، پاکستان پنجابی ادبی بورڈ، 2011، ص17۔

69۔ آزادی مگروں پنجابی نظم، ص20۔

70۔ آزادی مگروں پنجابی نظم، ص31۔

71۔ غلام یعقوب انور، علامہ، بول تے تول، لاہور، پاکستان پنجابی ادبی بورڈ، 1981، ص5۔

72۔ ایضاً

73۔ بول تے تول، ص69۔

74۔ آصف خان، کن لیکھا، لاہور، پاکستان پنجابی ادبی بورڈ، 1984، ص21۔

75۔ کن لیکھا، ص22۔

76۔ کن لیکھا، ص60۔

77۔ قاضی فضل حق، نکھیڑے، لاہور، پاکستان پنجابی ادبی بورڈ، 1985، ص7۔

78۔ نکھیڑے، ص 8۔

79۔ تنویر بخاری، ماہیا فن تے بنتر، لاہور، پاکستان پنجابی ادبی بورڈ، 1988، ص7۔

80۔ بوطیقا، لاہور، پاکستان پنجابی ادبی بورڈ، 1988، ص42۔

81۔ ہور نک سک، لاہور، پاکستان پنجابی ادبی بورڈ، 2000، ص82۔

82۔ شریف کنجاہی، نک سک، پنجابی ادب تماہی، لاہور، شمارہ نمبر ص74۔

83۔ پنجابی بولی دا پچھوکڑ، لاہور، پاکستان پنجابی ادبی بورڈ، 1996، ص8۔

84۔ ہور نک سک، ص56۔

85۔ ایضاً۔

86۔ ہور نک سک، ص74۔

87۔ ایضاً۔

88۔ سمیع اللہ قریشی، پروفیسر، لیکھے جوکھے، لاہور، پاکستان پنجابی ادبی بورڈ، 2002، ص 5۔

89۔ آفتاب احمد نقوی، ڈاکٹر، پنجابی نعت، لاہور، پاکستان پنجابی ادبی بورڈ، ص، 7۔

90۔ پنجابی نعت، لاہور، ص 17۔

91۔ پاکستانی زباناں، لاہور، پاکستان پنجابی ادبی بورڈ، 2012، ص 5۔

92۔ دلشاد ٹوانہ، ڈاکٹر، پنجابی رانی، لاہور، پاکستان پنجابی ادبی بورڈ، 2011، ص 12۔

93۔ ایضاً۔

94۔ ایضاً۔

95۔ پنجابی رانی، ص 37۔

96۔ وحدت الوجود تے پنجابی شاعری، لاہور، پاکستان پنجابی ادبی بورڈ، طبع پنجم، 2010، ص 18۔

97۔ وحدت الوجود تے پنجابی شاعری، ص 19۔

98۔ ایضاً۔

99۔ قاضی جاوید، پنجابی دی صوفیانہ روایت، لاہور، پاکستان پنجابی ادبی بورڈ، 1993، ص 9۔

باب چہارم

جدید اور جدید تر ادب کی اشاعت میں پاکستان پنجابی ادبی بورڈ کا کردار

ڈاکٹر فقیر محمد فقیر

بابائے پنجابی ڈاکٹر فقیر محمد فقیر 5 جون 1900 کو پنجاب کے مردم خیز شہر گوجرانوالہ میں پیدا ہوئے اور 11 ستمبر 1974 کو یہیں وفات پائی اور مزار حضرت مبارک شاہؒ کے احاطے میں سپردِ خاک ہوئے۔ اپنے ایک مطبوعہ مضمون بعنوان ''میری آپ بیتی'' میں بابائے پنجابی رقمطراز ہیں؛

> ''1915ء کے ابتدائی ایام میں اپنے والد حکیم میاں لال دین مرحوم و مغفور کی وفات پر مَیں نے اچانک اپنی طبیعت کو شعر گوئی کی طرف مائل پایا''

اپنے والد گرامی سے محبت کی شدّت نے اُن کی قلم سے ایک مرثیہ تخلیق کروایا، جس کا مطلع ہے؛

دل دی وسدی بستی اُجاڑ میری — واسی آپ نیں کتے سدھار چلے
رونادے کے میریاں اکھیاں نوں — لے کے دل دا صبر قرار چلے

بیسویں صدی میں پنجابی زبان کے فروغ اور پنجابی ادب کے استحکام کی خاطر محنت کرنے والوں میں سب سے معتبر، اہم اور اوّلین نام بابائے پنجابی ڈاکٹر فقیر محمد فقیر ہی کا ہے۔ آپ ہمہ جہت ادبی شخصیت کے مالک تھے، قدرت نے اُنھیں بے شمار گنوں سے نوازا تھا۔ ڈاکٹر فقیر مرحوم نے شاعری کی تقریباً تمام اصناف میں طبع آزمائی کی۔ پنجابی زبان کی قدیم کلاسیکی روایات کو برقرار رکھتے ہوئے انھوں نے وارثی بحر میں ہیر لکھنے کا تجربہ کیا۔ بابائے پنجابی زندگی بھر پنجابی کے صوفیا کے کلام کو منظر عام پر لانے کے لیے تگ و دو کرتے رہے اور پنجابی زبان میں منظوم داستان گوئی کی روایت کو آگے بڑھاتے ہوئے 894 صفحات پر مشتمل ایک مثنوی '' سنگی'' تخلیق کی جو پنجابی کلاسیکل روایت کی معروف مولوی غلام

رسول عالم پوری اور میاں محمد بخش کی سیف الملوک کی بحر میں تخلیق کی گئی ہے۔اس مثنوی کا ہر دوسرا شعر ایک قولِ زریں کی حیثیت رکھتا ہے۔

علم میرے دی تیرے اگے بند زبان خدایا　　مردے دے وِچ فضلوں کرموں پائیں جان خدایا
علم تیرا جد سینیاں دے وچ معنیاں دے در کھولے　　کیکر فیر زباناں وچوں جبرائیل نہ بولے
اکھاں دے وچ ناچ کرے جس سوہنے دی وڈیائی　　دیاں فقیر میں ناں اوہدے دی بھلانہ کویں دُہائی
گل بندے نوں تخت بہاندی، گل چڑھاندی سولی　　گلوں واہدے وٹے لکھاں گلوں گھاٹ سمولی

قیامِ پاکستان سے پہلے کے دَور ہی میں ڈاکٹر فقیر کا تیسرا بڑا شعری کارنامہ جس نے علمی ادبی اور شعری مجلسوں میں اُنھیں شہرت اور عزت سے نوازا وہ ''دامن'' ہے۔''دامن'' پنجابی زبان کے ماضی قریب میں ایک معروف صنفِ سخن رہی ہے۔اس میں بالعموم کسی عشقیہ داستان کو بیان کیا جاتا ہے۔یہ مسدس نظم کی صورت میں ہوتی ہے۔اس کے پہلے بند کے تمام مصرعوں میں لفظ ''دامن'' کو ردیف رکھا جاتا ہے بعدازاں ہر بند کے آخری دو مصرعوں میں ''دامن'' ردیف کے طور پر باندھا جاتا ہے۔دامن لکھنے کی روایت بیسویں صدی کے پنجابی ادب ہی میں متعارف ہوئی۔اُستاد عِشق لہر نے زلیخا کے حضرت یوسفؑ سے عشق کو دامن کا موضوع بنایا، پیر فضل حسین فضل گجراتی نے سوہنی مہینوال کے عِشق اور ڈاکٹر فقیر محمد فقیر نے سسی پنوں کے عشق کو دامن کا موضوع بنایا اور تینوں اساتذہ نے شاہکار دامن تخلیق کیے۔

اُن کا پہلا شعری مجموعہ ''صدائے فقیر'' تحریک آزادیٔ ہند کے زمانے میں شائع ہوا تھا۔1924ء میں شائع ہونے والے اس شعری مجموعے '' صدائے فقیر'' میں چودہ طویل نظمیں، قطعات اور چو مصرعے شامل کیے گئے۔ان طویل نظموں کو بھی کلاسیکل طرزِ سخن کا شاہکار قرار دیا جا سکتا ہے۔ڈاکٹر علامہ محمد اقبالؒ کی رائے میں ''صدائے فقیر کی تمام نظمیں دِلکش ہیں اور وقت کے تقاضے کو پورا کرتی ہیں۔

پنجابی زبان کی ادبی تاریخ میں ڈاکٹر فقیر کو پنجابی رُباعی کا باوا آدم کہا جاتا ہے۔انھوں نے خود بھی اس بات کا دعٰوی کیا ہے۔ انھوں نے نہ صرف یہ کہ پنجابی ادب میں اِس صنفِ سخن کو رُوشناس کروایا بلکہ اسے بامِ عروج پر بھی پہنچایا۔اپنی ایک غزل کا مقطع اِس طرح لکھتے ہیں؛

فنِ شعر دے کول جواب جد کوئی اوہدی غزل تے میری رُباعی دا نہیں
کیوں نہیں غزل پنجابی دا فضل حافظ تے فقیر میں عمر خیام کیوں نہیں

انھوں نے قیامِ پاکستان کے فوراً بعد پنجابی نثر کی اوّلین کتاب ''پنج ہادی'' تصنیف کی۔اس کتاب میں حضرت محمد ﷺ اور اُن کے چار خُلفائے راشدین کی زندگیوں کے حالات اور کارہائے نمایاں کو تفصیلاً بیان کیا گیا ہے۔ بابائے پنجابی کا شعری سفر چوبیس سالوں پر محیط ہے۔پہلے وہ ''تحریکِ آزادئ ہند''اور'' تحریکِ قیامِ پاکستان'' کے تحریکی مجاہد کے طور پر کام کرتے رہے اور اس کے بعد انھوں نے ایک دانش ور، حکیمِ ملت، مصلحِ قوم اور لیڈر کا کردار ادا کیا اور '' تحریکِ تعمیرِ پاکستان'' کے ایک عظیم مجاہد کی حیثیت میں سامنے آئے۔ بابائے پنجابی کے تین شعری مجموعے 1956ء میں ''موآتے''1965ء میں ''ستاراں دِن'' اور 1968ء میں ''پاٹے گلمے'' شائع ہوئی۔

بابائے صحافت مولانا ظفر علی خان لکھتے ہیں کہ مولانا الطاف حسین حالیؔ نے جو کام اپنی تخلیق ''مسدسِ حالی'' سے لیا وہی کام ڈاکٹر فقیر محمد فقیر نے '' موآتے'' سے لیا۔اس کتاب کو پنجاب یونی ورسٹی نے انعام سے نوزا۔ قومی اور ملی جذبات کو تحریک دینے کی خاطر تخلیق ہونے والی شاعری بھی تاابد زندہ رہتی ہے۔یہ کتاب ایم اے پنجابی کے نصاب میں شامل ہے۔ بابائے پنجابی کی جنگی اور رزمیہ شاعری کا مجموعہ ''ستاراں دِن'' کے نام سے منصہ شہود پر آچکا ہے۔یہ کتاب عرصہ دراز تک پنجاب یونی ورسٹی اور دیگر یونی ورسٹیوں کے ایم اے پنجابی کے نصاب میں قومی شاعری کے طور پر پڑھائی جاتی رہی ہے۔

انھوں نے پنجابی زبان میں باقاعدہ فنی نثر نویسی کا آغاز کیا۔ قیامِ پاکستان کے بعد پاکستانی پنجاب میں پنجابی پرچہ کاری کی مضبوط بنیادیں استوار کیں۔پنجابی زبان کو معاصر ترقی یافتہ زبانوں کی مانند عصری تقاضوں سے ہم آہنگ کرنے کے لیے اور اسے علمی، ادبی، اخباری، صحافتی، تعلیمی اور معاشرتی سطح پر ایک معیاری اور ترقی یافتہ زبان کی حیثیت سے رائج کرنے کے لیے انتھک جدوجہد کی۔بلاشبہ وہ پنجابی زبان کے نہایت عظیم فلسفی، شاعر، مفکر اور سیوک تھے۔

شریف کنجاہی

پانی بھرن پنہاریاں تے وَنوَوَن گھڑے
بھریااوس داجانیے جس داتوڑ چڑھے

اوہوا ج چِر کلی، اوہوا کھوُہ دا گھیر
اک بَھنّے اک بَھرلئے، ایہہ لیکھاں دا پھیر

لیکھاں دی سب کھیڈ ہے، جدوں ایہہ دیندے ہار
لکھاں سگھڑ سیانیاں بُھلن آدھ وچکار

گُھنے گُھٹ گُھٹ بنھیاں تے نویں لیائیاں لج
جس دا بَھجنا لکھیا، اوس دا جاندا بَھج

اُس دی ڈھاک اج سکھنی، جس نے بھریا کل
اَج اوہ مور کھ بن گئی کل جس نوں سی وَل

پروفیسر محمد شریف جن کولوگ شریف کنجاہی کے نام سے جانتے ہیں 1915 میں ضلع گجرات کے قصبہ کنجاہ میں پیدا ہوئے۔ زمانہ طالب علمی سے ہی آپ کو شعر و سخن سے گہرا لگاؤ تھا۔ آپ نے اپنی شاعری کا آغاز انگریز تسلط کے خلاف انقلابی شاعری سے کیا۔ اِسی انقلابی شاعری کی وجہ سے انگریز دور میں آپ کو سرکاری نوکری کے لیے پولیس کلیرنس سرٹیفکیٹ جاری نہ کیا گیا۔ 1954 میں اردو اور 1956 میں فارسی میں ایم اے کرنے کے بعد 1959 میں گورنمنٹ کالج کیمبلپور میں پنجابی زبان کے لیکچرار تعنیات ہوئے۔ یہاں سے آپ کا تبادلہ گورنمنٹ کالج جہلم میں ہوا جہاں آپ ریٹائرمنٹ تک فرائض سرانجام دیتے رہے۔ 1970 میں آپ کو پنجاب یونیورسٹی میں نئے شروع کیے جانے والے شعبہ پنجابی کا ممبر بنایا گیا، 1973 سے 1980 تک آپ پنجاب یونیورسٹی میں بحیثیتِ استاد، مصنف، شاعر اور دانش وار خدمات سرانجام دیتے رہے۔

شریف کنجاہی صاحب کا شمار جدید پنجابی بانیوں میں ہوتا ہے۔ آپ نے اردو، فارسی اور پنجابی زبان میں شاعری کی، قرآن پاک کا پنجابی ترجمہ کرنے کا شرف بھی شریف کنجاہی صاحب کو حاصل ہے۔ آپ کی پہلی پنجابی شاعری کی کتاب ''جگراتے'' 1958 میں مشرقی پنجاب میں شائع ہوئی۔ یہ کتاب 37 نظموں کا مجموعہ ہے اس کے بعد ان کی دوسری کتاب ''ارک ہوندی لو'' 1995 میں شائع ہوئی۔ دنیا میں جہاں جہاں اہل ادب اور پنجابی زبان سے پیار کرنے والے لوگ ہیں وہ آپ کی خدمات ہمیشہ سراہتے رہیں گے اور آپ کا نام رہتی دنیا تک قائم ودائم رہے گا۔

میں ون دا سنگھنا بوٹا، ٹھنڈیاں میریاں چھانواں
مٹھیاں میریاں پیلوں، وے توں راہیا جاندیا

بُھکھن بھانیاں ماندیا، آجا جھٹ گھسالے میریاں پیلوں کھالے، میری چھانویں بہہ لے
میں وَن دا سنگھنا بوٹا، ٹھنڈیاں میریاں چھانواں

منیر نیازی

منیر نیازی کی غزل میں محبت کے دکھ، سماجی درد ہیں اور یہ محسوس ہوتا ہے کہ ان کے ہاں سماج کے بہت سے اندرونی دکھ، محبت کے دکھ میں مل گئے ہیں اور یہ سارے دکھ مل کر ایک نئی اکائی تشکیل دے رہے ہیں۔

اُس آخری نظر میں عجب درد تھا منیر جانے کا اس کے رنج مجھے عمر بھر رہا
جانتا ہوں ایک ایسے شخص کو میں بھی منیر غم سے پتھر ہو گیا لیکن کبھی رویا نہیں

منیر کے ہاں شہر اور سفر دو الفاظ بہت زیادہ ہیں۔ ایسا لگتا ہے کہ منیر کی غزل کا مسافر اندھیرے میں کھو گیا ہے اور شہر کے سارے مناظر اندھیرے میں کھو گئے ہیں۔ اس لیے اُن کے ہاں سایے اور دھند کی کیفیت ملتی ہے۔ اُن کے ہاں تنہائی اور خوف کی فضاء موجود ہے جو اُس دور کے نئے ماحول کو ظاہر کرتی ہے۔ وہ لفظوں کا جادوگر شاعری کی طلسماتی دنیا میں اپنے الفاظ کے ذریعے سب کو جکڑ لیتا، اندر چھپے خوف کو تسخیر کر لیتا ہے۔ اس کے الفاظ یوں منکشف ہوتے کہ جیسے اس کائنات کے پوشیدہ راز کھل جائیں۔ وہ ایک تجربہ کار جوہری کی طرح اپنے پاس آنے والے گاہک کو شیشے کی الماریوں میں جگمگ کرتے زیورات کو چھونے کا موقع فراہم کرتا ہے۔ پنجابی ہو یا اردو شاعری بات وہ کرتا جو بڑی آسانی سے سب کو اندر ہی اندر ہچکولے دے دیتی۔

کج اُنج وی راہواں اوکھیاں سن کج گل وچ غم دا طوق وی سی
کج شہر دے لوک وی ظالم سن کج مینوں مرن دا شوق وی سی

طلسماتی فضاؤں کے تصورات میں کھوئے ہوئے شاعر کو پڑھنے والے لوگ، سہمے ہوئے، گھبرائے ہوئے خواہشوں کی کھوج میں اس دھند کے پار والے جنگل میں داخل ہونے پر مجبور ہو جاتے ہیں جہاں انھیں رنگ برنگے لفظ، پراسرار مناظر کی تصویروں میں سموتے لفظ، اپنی مہک میں جذب کرنے والے لفظ، کھینچ کر لے جاتے ہیں اور پھر کبھی

نہیں چھوڑتے۔ اس کے لفظوں اور نظموں کا اپنا موسم تھا،اس کی اپنی بے انت کہانیاں تھیں،اس کا جادو سب کو ایسے شہر نامعلوم میں لے جاتا تھا جہاں سپنے باتیں کرتے، پیڑ، پودے، درخت، پھل، پھول اپنے قصے سناتے اور یوں لگتا کہ ان کا رنگ مہندی لگے ہاتھ سے اتر کر پورے بدن پر چڑھ گیا ہے۔ ہم جو اپنی آگہی حاصل کرنے کی کبھی کوشش نہیں کرتے، ہم اپنے وجود کی اس ضرورت کو نظر انداز کر دیتے ہیں۔ ہم کبھی اپنے آپ سے نہیں پوچھتے کہ کون ہیں؟ کہاں سے آئے ہیں؟ کہاں جا رہے ہیں؟ ہم جو اپنے شعور سے اپنے ہی تعلق کو نہیں جانتے، وہ تعلق جس کا ادراک منیر نیازی کو عام لوگوں سے ممیز کرتا تھا وہ جانتے تھے کہ ان کی تخلیق میں کیا ہے اور وہ کیا تخلیق کر سکتے ہیں۔ انھوں نے اوہام کی دنیا میں جا کر ان کو شکار کر لیا تھا۔ انھوں نے غیر انسانی چیزوں کے ساتھ ہمکلام ہو کر انہیں انسانی شعور تک پہنچایا۔ خیال و شعور کو مربوط کرنے میں منیر نیازی اپنے فن کی انتہا کرتے رہے۔ انھوں نے تخلیقی دنیا کے ریاکاروں کو قائل کرنے کی بجائے اپنے در تک صرف ایک راستہ بنا دیا کہ جس نے آنا ہے خود ہی چلا آئے۔ منیر نیازی کے دل نے جنہیں نہیں مانا وہ ان کے ہمسفر کیسے بن جاتے۔ اس کی شاعری پڑھتے ہوئے منیر نیازی کی آنکھوں سے دیکھنا پڑتا ہے۔ منیر نیازی کا عکس ایسا ہے کہ اس میں سیاہ شب کا سمندر، بیوفا کا شہر، تیز ہوا اور تنہا پھول، سفید دن کی ہوا، جنگل میں دھنک، چھ رنگین دروازے، دشمنوں کے درمیان شام، ماہِ منیر آغاز زمستاں، ساعتِ سیار بہت سے عکس مل جاتے ہیں۔ منیر نیازی کی خوبصورت جادو گرنیاں ہمارے ارد گرد پھیلی اچھائیاں برائیاں ہیں جن کی پرچھائیں تک وہ پہچان لیتے ہیں۔

منیر نیازی کی باتیں کبوتروں کی طرح ذہن کے گنبد میں گونجتی رہیں گی۔ ان کے زریں جملے رنگ برنگی پتیوں پر پڑنے والی کرنوں کو منعکس کرتے رہیں گے۔ جہانِ ادب میں منیر نیازی کی کوئی مثال نہیں مل سکتی، ان کے نظریات آگہی کی منزلوں تک لے جاتے ہیں۔ منیر نیازی نے پنجابی میں اپنی یاد تازہ رکھنے کے لیے پنجابی کے تین مجموعے چھوڑے ہیں۔ منیر نیازی کی ان کتابوں میں ماورائی ماحول ہے۔ اس ماحول کا مزاج غالباً جادو ٹونے کی رسوم میں ڈھلا تھا، قبروں کو پوجنا، جنتر منتر کرنا، تعویذ گنڈوں سے کسی کو رام کرنا یا دشمنوں کو موت کے گھاٹ اتار دینا ہماری قدیم ثقافت کا حصہ ہے۔ شاہ عبداللطیف بھٹائی ہوں یا سچل سرمست، بابا بلھے شاہ ہوں یا خوشحال خان خٹک، سرحد کے علاوہ سندھ و پنجاب کی تہذیب بھی انہی رسوم کی پیروی کرتی نظر آتی ہے۔ ہماری لوک داستانوں کے عمر ماروی، ہیر رانجھے، سوہنی مہیوال شکاریوں کے ہاتھوں میں رہے، اسی لیے کالی رات کی خاموشی میں پگڈنڈیوں پر پیڑوں کے سائے چڑیلوں جیسی سازشیں کرتے ہوئے دکھائی دیتے ہیں لیکن دن چڑھتے ہی یہ عناصر بانسری یا الغوزے بجاتے ہوئے باریش آدمی، کپاس چنتی ہوئی دوشیزائیں، بچے کو جھولا جھلاتی

لوریاں سناتی خوبصورت مینڈھیوں والی مائیں بن جاتے ہیں، ہوا چاہے کتنی ہی خاک اڑائے، سوچوں کی پت جھڑ بہاروں کی اطلاع لے کر آتی رہے گی۔

ذی شعور اور منصف مزاجوں کے وجود کو ہم کتابوں میں ڈھونڈیں گے، وہ ملیں گے نہ ان کی کتابوں میں اڑتے پرندے ہمارے ہاتھ آئیں گے لیکن اس جدائی کی مہک بارش سے بھیگنے والی سوندھی مٹی کی طرح آنسو پلائے گی، مگر کیا پتہ کسی حادثے کا محرک ایسا بھی ہو جب یہ ڈھلتی شامیں سنبھل جائیں، افہام و تفہیم ہمہ گیر محبت بن جائے، فکر و احساس کے جذبے جو مرجھا کر مرنے والے ہیں وہ پھر تر و تازہ ہو جائیں، اس کے لیے ہمیں وہ جنگ کرنی پڑے گی جو منیر نیازی کرتے رہے، لال پیلی آنکھوں والی بدصورتیوں سے ڈرنے کے بجائے چیخ کر انہیں ڈرانا پڑے گا، کچھ دیر ٹھہر کر بارش میں بھیگنا بھی پڑے گا تاکہ ہم سرسبز و شاداب ہو سکیں جہاں ایک دوسرے کے مقام پر قبضہ جمانے کی سوچ سے نکل کر ہم اجتماعی تسخیر کے خیال میں ڈھل جائیں گے۔ کتابیں جو مقدس ہوتی ہیں، جنھیں چوم کر آنکھوں اور سینے سے لگایا جاتا ہے، ان کتابوں کو لکھنے والے جو محنت اور دیانت کے ساتھ ان سچائیوں کو اجاگر کرتے ہیں، چاہے وہ اپنی علمی تخلیقات کے خزانے کا ڈھیر لگا دیں لیکن ہم فقط سانپ کی طرح کنڈلی مارے بخل کی انتہا کرنے میں مصروف رہتے ہیں۔

منیر کی شاعری میں انسانی زندگی کے جہنمی ریگزار بھی ہیں اور بندہ بشر کی کھوئی ہوئی جنت بھی ہے۔ اگر ایک طرف قتل و بربریت کی وارداتیں ہیں تو دوسری جانب خیر سے آشنائیاں ہیں۔ منیر نیازی نے جو بھی شاعری تخلیق کی اس سے پہلے اس طرح کی شاعری قارئین ادب کو پڑھنے اور سننے کو نہیں ملی۔ بالعموم شاعر نازک طبع واقع ہوتے ہیں ان پر ہجرتوں کے غم، اپنوں سے دوری کے رنج، فکر جاناں اور فکر دوراں کے مصائب، محبتوں میں جدائی کے غم ان کو چھلکتے ہوئے پیمانے اور حد درجہ حساس بنا دیتے ہیں، ایسے میں وہ بھیڑ میں بھی تنہا رہ جاتے ہیں اور یہ وہ کیفیت ہے جس کی وجہ سے قارئین ادب کو شاہکار نظمیں اور غزلیں ملیں۔ منیر نیازی جیسا ایک مضبوط و توانا شاعر بلاشبہ ایک legend تھا اور شاید ان جیسا بے باک شاعر اب نہ آ سکے۔

ہونی دے حیلے

جو ہویا اے، او ہونا ای سی — تے ہونی ہونیوں رُکدی نہیں
اِک واری جد چِھڑ جاوے — گل فیر اینویں مُکدی نہیں

اک موقعے تے

ایڈیاں دردی اکھاں دے وچ	ہنجو بھرن نہ دیواں
وس چلے تے ایس جہان وچ	کسے نوں مرن نہ دیواں

شہر دے مکان

اپنے ای ڈرتوں	جڑے ہوئے نیں
اک دوجے دے نال	شہر دے مکان

احمد راہی

پنجابی ادب میں ان کا سب سے بڑا کارنامہ ان کی نظموں کا مجموعہ 'ترنجن ' ہے جو سن انیس سو باون میں شائع ہوا۔ اس وقت تک پنجابی کے بارے میں عام تاثر یہ تھا کہ نازک احساسات اور جذبات کے اظہار کے لیے یہ زبان موزوں نہیں ہے لیکن احمد راہی ترنجن کے ذریعے اس تاثر کو زائل کرنے میں کامیاب رہے۔ ترنجن کی نظموں میں تقسیم ہند کے وقت ہونے والے ہندو مسلم فسادات میں عورتوں کے ساتھ جنسی زیادتی کو بڑے شاعرانہ طریقے سے پیش کیا گیا ہے:

ناں کوئی سہریاں والا آیا	تے ناں ویراں ڈولی ٹوری
جس دے ہتھ جدی بانہہ آئی	لے گیا زوروزوری

اس مجموعے کا فلیپ منٹو نے احمد راہی کی فرمائش پر پنجابی میں لکھا اور یہی منٹو کی اکلوتی پنجابی تحریر بھی ثابت ہوئی۔احمد راہی نے مسعود پرویز اور خواجہ خورشید انور کی مشہور پنجابی فلم 'ہیر رانجھا' کے لیے بھی نغمات لکھے جن میں 'سن ونجھلی دی مٹھڑی تان' اور ' ونجھلی والڑیا توں تے موہ لئی اے مٹیار' آج بھی اپنا جادو جگاتے ہیں۔انھوں نے فلمی حلقوں میں بھی اپنا ایک خاص مقام بنایا اور ان کے لکھے ہوئے گانوں میں بھی لوگوں کو لوک اور ادب کا رنگ دیکھنے کو ملا۔ احمد راہی کی نظموں میں لوک گیتوں جیسی مٹھاس اور رس ہے جس وجہ سے عام قاری انہیں لوک گیت ہی سمجھتا ہے۔

سنجے دل والے بوہے کدے میں نہیوں ڈھوئے
وے توں جم جم آویں چناں تاریاں دے لوئے

احمد راہی نے تقسیم ہند کے پس منظر میں ہی نظمیں نہیں لکھیں ان کے ہاں رومان بھی ملتا ہے جس میں کہیں وصل کی لذت بھری گھڑیاں ہیں اور کہیں پر ہجر و فراق کے صحراوں جیسے تپتے دکھ ہیں۔ انھوں نے جہاں بھی پیار جیسے جذبے کی بات کی ہے، وہاں عورت کے احساسات و جذبات کو نہایت خوش اسلوبی سے بیان کیا ہے اور یوں ان جذبات کی مکمل ترجمانی ہوتی ہے۔

استاد دامن

استاد دامن نے شاعری کا آغاز کیا تو ہمدم تخلص کرتے تھے۔ پنجابی شاعری میں استاد ہمدم کے شاگرد ہوئے اور ان کی شاگردی کو اپنے لیے باعث فخر تصور کرتے۔ دامن نے پنجابی شاعری کی فنی خوبیوں پر ملکہ رکھنے کی بدولت اہل علم و فن افراد سے استاد کا خطاب حاصل کیا۔ استاد دامن مزدوروں، کسانوں، غریبوں اور مظلوموں کے شاعر تھے۔ انھوں نے ان طبقوں کی حمایت اور حقوق کیلیے آواز اٹھائی اور ہمیشہ استحصالی طبقوں کی مذمت کرتے رہے۔ انھوں نے پنجابی زبان و ادب کے فروغ کیلیے گرانقدر خدمات سرانجام دیں اور ادبی تنظیم پنجابی ادبی سنگت کی بنیاد رکھی اور تنظیم کے سیکٹری رہے۔ استاد دامن نے نور جہاں کی زیر ہدایت بننے والی فلم چن وے کے لیے ایک گیت کا مکھڑا لکھا۔

چنگا بنایا ای سانوں کھڈونا — آپے بنائونا تے آپے مٹائونا

استاد دامن کی سب سے بڑی خوبی ان کی فی البدیہہ گوئی تھی۔ خدا نے انہیں ایسے ذہن اور فکر سے نوازا تھا کہ وہ موقع کی مناسبت سے چند لمحوں میں اشعار کی مالا پرو دیتے تھے اور حاضرین کیلیے تسکین کے ساتھ ساتھ حیرت کے اسباب بھی پیدا کر دیتے تھے۔ آزادی کے کچھ عرصہ بعد انھوں نے دلی میں منعقد مشاعرے میں یہ فی البدیہہ نظم پڑھی؛

جاگن والیاں رج کے لٹیا اے	سوئے تسی وی او، سوئے اسیں وی آں
لالی اکھیاں دی پئی دس دی اے	روئے تسی وی او، روئے اسیں وی آں

اس نظم کو سننے کے بعد نہرو رو پڑے اور انھوں نے استاد دامن کو ماہوار وظیفے کے ساتھ انڈیا رہنے کی دعوت دی اور انڈین نیشنیلٹی دینے کا وعدہ کیا مگر استاد جی کی وطن سے محبت ایسی تھی کہ تاریخی جواب دیا "کہ نہیں سرکار رہوں گا لاہور میں چاہے جیل میں رہوں"۔ استاد جی کو بہت سی زبانوں پہ مہارت حاصل تھی جن میں پنجابی، اردو، ہندی، سنسکرت، انگریزی، فارسی، بنگالی، اور روسی شامل ہیں آخری عمر میں پشتو سیکھ رہے تھے۔

استاد دامن نے پنجابی شاعری کے ذریعے پنجاب کی ثقافت کے تمام رنگوں کو اجاگر کیا۔ پنجاب کی ثقافت سے مزین ان کی لوک شاعری نے لوگوں کو خصوصی طور پر اپنی طرف متوجہ کیا۔ ان کے لہجے میں طنز اور مزاح تھا۔ انھوں نے مزاح کے انداز میں لوگوں کو معاشرتی برائیوں سے آگاہ کیا۔ انھوں نے اپنی شاعری کے ذریعے ہمیشہ سچ کی تائید اور جھوٹ کی تردید کی۔ استاد دامن کی شاعری میں لوک رنگ، تصوف، سیاسی موضوعات، روایتی موضوعات کے علاوہ روز مرہ زندگی کا ہر رنگ ملتا ہے۔ ان کی شاعری حقیقت نگاری اور فطرت نگاری کی خوبیوں سے مالا مال ہے اور انسانی زندگی کی خوبصوت عکاس ہے۔ استاد دامن کی شاعرانہ عظمت کا اعتراف اس عہد کے عظیم اور منفرد شاعر فیض احمد فیض نے ایک نجی محفل میں یہ کہہ کر کیا کہ میں پنجابی میں صرف اس لیے شاعری نہیں کرتا کہ پنجابی میں شاہ حسین، وارث شاہ اور بلھے شاہ کے بعد استاد دامن جیسے شاعر موجود ہیں۔ بلاشبہ استاد دامن پنجابی ادب کا انمول خزانہ ہے۔ ان کی یاد میں قائم ہونے والی استاد دامن اکیڈمی نے مختلف ذہنوں میں محفوظ اور ادھر ادھر بکھرے ہوئے کلام کو یکجا کر کے دامن دے موتی کے نام سے ایک کتاب ہمارے سامنے پیش کی۔ استاد دامن اکیڈمی کی اس کاوش سے جہاں پنجابی ادب کو بہت فائدہ ہوا اور اس کے شعری سرمائے میں اضافہ ہوا وہاں شعری ذوق رکھنے والے افراد کو بھی استاد دامن کی شاعری سے فیض یاب ہونے کا موقع ملا۔

استاد دامن، پنجابی کے علاوہ اردو سنسکرت، ہندی اور انگریزی زبانوں پر بھی دسترس رکھتے تھے لیکن انھوں نے وسیلہ اظہار اپنی ماں بولی زبان پنجابی ہی کو بنایا۔ استاد دامن بلھے شاہ اکیڈمی کے سرپرست، مجلس شاہ حسین کے سرپرست

اور ریڈیو پاکستان شعبہ پنجابی کے مشیر بھی تھے۔ان مختلف حیثیتوں میں انھوں نے پنجابی زبان وادب کی ناقابل فراموش خدمت سرانجام دیں۔آغاز شباب میں آزادی کے گیت گانے شروع کیے اور موچی دروازے کے ایک جلسے میں جس کی صدارت پنڈت جواہر لال نہرو کر رہے تھے استاد دامن کی ایک نظم نے لوگوں کے دلوں میں تہلکہ مچادیا۔

دنیا ہن پرانی دے نظام بدلے جان گے — اونٹ دی سواری دے مقام بدلے جان گے
امیری تے غریبی دے نام بدلے جان گے — آقا بدلے جان گے غلام بدلے جان گے

آزادی کے بعد کے ہنگاموں میں استاد جی کی ذاتی لائبریری جلاؤ گھیراؤ کی نذر ہو گئی جس میں ان کی قیمتی کتابوں کے مسودے بھی جل گئے اور انھوں نے مسودوں کو سنبھالنا چھوڑ دیا اور اس طرح انکا بہت سا کلام ضائع ہوا۔

پیر فضل حسین گجراتی

پنجابی زبان کے نامور شاعر اور جدید پنجابی غزل کے بانی گجرات میں پیدا ہوئے۔ ان کا شمار بہترین پنجابی غزل گو شعرا میں ہوتا ہے۔انھوں نے پنجابی غزل کو جدت بخشی اور اپنی غزلوں میں فارسی اور عربی الفاظ کو بخوبی کثرت سے استعمال کیا۔ یہ ان کی شعری خوبی تھی کہ وہ الفاظ کہیں پر بھی اجنبی محسوس نہیں ہوتے۔ ''ڈوہنگے پینڈے''، ''ٹکوراں'' ان کی پنجابی غزلوں کی کتابیں ہیں۔اس کے علاوہ نعتیں، نظمیں اور منقبت بھی کہی جو کتابی شکل میں چھپ چکی ہیں۔
ان کے کلام کا نمونہ یوں ہے؛

کیوں تِکھیاں شوخ نگاہواں نوں سُرمے دیاں چِساں دیناایں
تِیراں نے بوجھل ہو جانا، تیراں تے چاہڑنہ شاماں نوں

بابائے پنجابی ڈاکٹر فقیر محمد فقیر نے ان کی شاعری کی تعریف کرتے ہوئے یوں کہا تھا؛

فن شعر دے کول جواب جد کوئی اوہدی غزل تے میری رباعی دا نہیں
کیوں نہیں غزل پنجابی دا فضل حافظ تے فقیر میں عمر خیام کیوں نہیں

صوفی غلام مصطفیٰ تبسم

صوفی غلام مصطفیٰ تبسم کی شاعری نصف صدی پر محیط ہے آپ محض اردو کے ہی نہیں بلکہ پنجابی اور فارسی کے بھی بلند پایہ شاعر اور قادر الکلام شاعر تھے۔ آپ کے شعری ذوق کو فارسی سے خاص مناسبت تھی۔ صوفی تبسم کی شاعری میں محبت کے جذبات کی صحیح ترجمانی ملتی ہے۔ صوفی تبسم کو عشق و محبت کے جذبات و احساسات کا اتنا واضح شعور تھا کہ وہ اپنے کلام میں جگہ جگہ ان جذبات واحساسات کی صحیح اور سچی تصویر کھینچ کر رکھ دیتے تھے۔ اس کی ایک واضح مثال ان کے اشعار میں بھی ملتی ہے۔ صوفی تبسم نے غالب کی اردو غزلوں کا پنجابی میں ترجمہ کیا جن میں سے ایک غزل گائیک غلام علی نے " میرے شوق دا نئیں اعتبار تینوں" گا کر خوب شہرت حاصل کی۔

صوفی تبسم کی بہت سی ادبی خدمات کے ساتھ ساتھ ان کی حب الوطنی کو کبھی فراموش نہیں کیا جا سکتا اور اس کا اظہار انھوں نے 1965 کی جنگ میں متعدد جوشیلے اور پر اثر جنگی ترانے لکھ کر کیا۔ ان کے لکھے جنگی ترانے آج بھی 1965 والا جذبہ سموئے ہوئے ہیں خصوصاً ملکہ ترنم نور جہاں نے ان کے جنگی ترانے گا کر انھیں امر کر دیا اور جو آج بھی زبان زد عام ہیں "اے پتر ہٹاں تے نہیں وکدے"، "میریا ڈھول سپاہیا تینوں ربّ دیاں رکھاں"، " میرا ماہی چھیل چھبیلا کرنیل نی جرنیل نی"،' "میرا سوہنا شہر قصور نی"، "یہ ہواؤں کے مسافر، یہ سمندروں کے راہی" ان جنگی ترانوں کو نور جہاں نے اپنی جادو بھری آواز میں کچھ اس انداز میں گایا کہ آج بھی ان نغمات کی گونج سے اٹھتے قدم ٹھہر جاتے ہیں۔

صوفی غلام مصطفی تبسم کا علامہ اقبال کے ساتھ محبت اور عقیدت کا سلسلہ جو زمانہ طالب علمی سے قائم ہوا، زندگی بھر رہا۔ 1932 میں صوفی تبسم نے علامہ اقبال کی زندگی میں ان کی شاعری کے لیے بہت کام کیا۔ انھوں نے علامہ اقبال کی شاعری کے عنوان سے ایک طویل مقالہ تحریر کیا، جسے علامہ اقبال نے بہت سراہا۔ صوفی تبسم کی ادبی خدمات کو بھلایا نہیں جا سکتا، انھوں نے تین زبانوں میں لکھا اور بہترین لکھا، اردو، پنجابی اور فارسی پر انھیں عبور حاصل تھا۔

آپ اردو، فارسی اور پنجابی کے نامور شاعر، ادیب، مترجم، نقاد اور ماہر تعلیم تھے۔ پنجابی شاعری کی کتاب "نظراں کردیاں گلاں" اور پنجابی میں دو ڈراموں کا مجموعہ "دو ناٹک" تحریر کیا ہے۔ اس کے علاوہ "نقش اقبال" کے عنوان سے فارسی سے پنجابی میں منظوم ترجمہ کیا ہے۔ آپ "پنجابی ادب" کے بھی مدیر رہے۔

ساڈے عشق دے چمکدے لیکھاں تے ڈاہڈے غم دیاں سیاہیاں ڈہل گیاں
جیہڑے حسن تیرے چمکائیاں سن، اوہ چانیاں راتاں رل گیاں
ایس عشق نمانے دے دھاگے دیاں کجھ ایڈاولیاں گنجلاں سن
کجھ کھل دیاں کھل دیاں ہور پیئاں، کجھ پیندیاں پیندیاں کھل گیاں

فخر زمان

فخر زمان کا تعلق پنجاب کے مشہور شہر گجرات سے ہے۔ گجرات شہر میں روحی کنجاہی اور انور مسعود جیسے مہان لوگ پیدا ہوئے ہیں۔ فخر زمان نے نہ صرف پاکستان میں اعلیٰ تعلیم حاصل کی بلکہ انھوں نے ہالینڈ سے بھی قانون کی ڈگری حاصل کی۔ فخر زمان نے ادبی زندگی کا آغاز بہت پہلے کیا اور ان کا پہلا شعری مجموعہ اردو میں "زہراب" میں منظرِ عام پر آیا اور اس کے بعد کتابوں کا ایک سلسلہ شروع ہو گیا۔ ان کی کتاب ہر سال بازار میں آنے لگی۔ ان کی دوسری ادبی تحریر پنجابی زبان میں ایک ریڈیو کا ڈرامہ تھا "چڑیاں دا چنبہ" منظرِ عام پر آیا۔ اس کے بعد "ون دا بوٹا" بھی ریڈیو کا ڈرامہ 1981 میں منظرِ عام پر آیا۔ فخر زمان کی پانچ پنجابی کتابوں پر مارشل لاء دور میں پابندی لگائی گئی۔ اس پابندی کو لاہور ہائیکورٹ نے اٹھارہ سال بعد ختم کیا۔ فخر زمان کی کتابیں پنجابی ادب کے ایم اے کے نصاب میں بھی شامل ہیں۔ اس کے علاوہ ان کی ادبی خدمات پر کئی ایک لوگوں نے پی ایچ ڈی بھی کی ہے۔

فخر زمان نے پنجابی نظم کے میدان میں نئی سوچ، فکر اور اسلوب کو متعارف کرا کے پنجابی شاعری کو ہیت اور موضوع کے لحاظ سے جدید کرنے کی کوشش کی ہے۔ پنجابی ادب میں ان کی ڈراموں کی کتابوں میں "چڑیاں دا چنبہ"، "ون دا بوٹا"، ناولوں میں "ست گوچے لوک"، "اک مرے بندے دی کہانی"، "بندی وان"، "بے وطنا"، "کمذات" اور "توں کہ میں" شاعری میں "کنسو ویلے دی شاعری"، "ونگار"، "زوال دی گھڑی"، فخر زمان کی آپ بیتی اور پنجاب تے پنجابیت کے نام سے کتابیں شائع ہو چکی ہیں۔

باقی صدیقی

باقی صدیقی اردو اور پنجابی کے شاعر تھے اصل نام محمد افضل قریشی تھا۔ روالپنڈی کے نواحی گاؤں ہسام میں پیدا ہوئے۔ میٹرک پاس کرکے گاؤں کے مدرسہ میں مدرس ہوگئے لیکن کچھ عرصے بعد روالپنڈی آ گئے۔ سترہ برس ریڈیو پاکستان سے وابستہ رہے اور بے شمار پوٹھوہاری گیت لکھے۔ اردو کلام کے چار مجموعے ''جام جم''، ''دارورسن''، ''زخم بہار''اور''بارِ سفر''شائع ہوچکے ہیں۔''کچے گھڑے'' پوٹھوہاری گیتوں کا مجموعہ ہے۔

نہ اوہ پینگاں نہ اوہ جھوٹے نہ اوہ گھمرے گھمرے بوٹے
نہ اوہ گوہڑی چھاں ایہہ نہیں مینڈا گراں
کس اگے فریاد کراں میں کلی بہہ کے یاد کراں میں
اوکھے اوکھے ناں ایہہ نہیں مینڈا گراں

منو بھائی کے مطابق؛

''باقی صدیقی دی کتاب (کچے گھڑے) نہ چھپدی تے ساڈے ادب وچ ساڈی قومی زندگی دے اوس دور دا کوئی ریکارڈ نہ ہوندا جدوں پنڈاں وچ لسی دی تھاں کوکے کولے تے شہراں وچ رونق دی تھاں رولے نے لے لئی''۔

رشید نثار نے اپنے ایک اخباری انٹرویو میں کہا تھا؛

''انھوں (باقی صدیقی) نے شاعری کا ماخذ فلسفہ یا دقیق خیالات کو نہیں بلکہ ارضی رشتوں اور مٹی کی بو باس کو بنایا ہے ان کی زندگی اور شاعری کو ان حوالوں سے قطعاً الگ نہیں کیا جاسکتا''۔ (1)

وقت سمندر چھلاں مارے　　　کنڈھے اتے کھلی حیاتی
کچے گھڑے الارے

کھیڈاں سب وچالے رئیاں　　　نہ اوہ سجن نہ اوہ سیاں
ایویں پھیرے پاں　　　ایہہ نہیں مینڈا گراں

شفقت تنویر مرزا

شفقت تنویر مرزا پنجابی ادب کی ایسی شخصیت ہیں جن کی نظر میں کسی دوسری زبان سے کسی قسم کا تعصب روا رکھنا جائز نہیں تھا لیکن وہ اپنی زبان پر دوسری زبانوں کی فوقیت کے بھی روادار نہیں تھے۔انھوں نے ساری عمر اپنی ماں بولی کی ترقی اور ترویج کے لیے کام کرتے گزار دی۔ وہ اس بات کے قائل تھے کہ بچوں کو ابتدائی تعلیم مادری زبان میں دینی چاہیے۔انھوں نے پنجاب کی تاریخ ایک مختلف انداز میں تحریر کی ہے۔ان کی تحریر کردہ کتابوں میں ''ادب راہیں پنجاب دی تاریخ''، ''تحریک آزادی وچ پنجاب دا حصہ''، '' آزادی مگروں پنجابی ادب'' شامل ہیں۔ یہ کتابیں پنجاب کی ادبی تاریخ کے ساتھ ساتھ دیگر حوالوں سے بیش بہا معلومات کی حامل ہیں۔ دیگر کتابوں میں حافظ برخوردار کی ''مرزا صاحباں''، سچل سرمست کا منتخب کلام، ہاشم شاہ کا منتخب کلام، علی حیدر کی ''کُوک'' میں منتخب کلام اور شاہ حسین کے بارے میں کتابیں تحریر کی ہیں۔ انھوں نے صوفیا کے پنجابی کلام کو اردو نظم اور نثر میں ڈھال کر ہر پاکستانی تک پہنچانے کی کامیاب کوشش کی۔ان کے پنجابی تراجم میں ''لہو سہاگ'' (لورکا)،''بوہا کوئی نہ'' (سارتر) شامل ہیں اور کلیات خواجہ فرید کو ترتیب دیا۔

شفقت تنویر مرزا'' پنجابی ادبی سنگت، مجلس شاہ حسین اور پاکستان پنجابی ادبی بورڈ کے ممبر رہے۔ وہ 1977 میں پاکستان پنجابی ادبی بورڈ کے ممبر بنے تھے اور اس کے بعد صدر کے عہدے پر تادم مرگ تعینات رہے۔ وہ ایک محقق، مؤرخ، صحافی اور مضمون نگار ہی نہیں تھے بلکہ دیگر اصناف ادب پر بھی دسترس رکھتے تھے۔ شفقت تنویر مرزا پنجاب کی دھرتی کو من میں بسائے ہوئے تھے۔ وہ پنجاب کی زبان اور پہچان تھے۔ وہ اِس کی ثقافت اور بود و باش میں زندہ تھے۔ وہ یہاں کے رسم و رواج اور سماج کو اپنی شناخت جانتے تھے۔ وہ سمجھتے تھے کہ اپنی شناخت کو قائم رکھنے کے لیے پنجابی زبان کو ذریعہ تعلیم بنانا اور رائج کرنا ضروری ہے کیونکہ اسی میں ترقی کا راز مضمر ہے۔ وہ ساری عمر پنجابی زبان کے فروغ کے لیے

کوشاں رہے۔اُن کے مزاج میں سنجیدگی، متانت اور وارفتگی تھی۔اُن کی ساری زندگی جدوجہد سے عبارت ہے۔ وہ بیک وقت ادب اور صحافت سے منسلک رہے اور پنجابی زبان کی خدمت تو گویاان کے لیے عبادت کے مثل تھی۔ وہ کسی زبان کے خلاف نہیں تھے بلکہ چاہتے تھے کہ پنجابی لوگ اپنی ماں بولی کو وہی اہمیت دیں جو سندھ کے لوگ سندھی زبان اور بلوچستان والے بلوچی زبان کو دیتے ہیں۔ ان کے جانے سے پنجابی ادب کا اِک حسین باب ختم ہو گیا۔اس درویش صفت انسان کے اندر پنجابی صوفی شاعروں کی شاعری کا گداز اور پنجاب کی خوشبو جا گزیں تھی جو ہمیشہ بکھرتی رہے گی۔

ان کی نظم ''اسی آں اوہ اخبار دے ورقے'' بہت سی حقیقتوں کو آشکار کرتی ہے لیکن ان کو کسی طور بھی اخبار کے کاغذ سے تشبیہ دینا مناسب نہیں ہے کیونکہ ان کی تحریروں کو کاغذوں ہی نہیں دل کے گوشوں میں بھی محفوظ کیا جاتا ہے۔

راجار سالو

راجار سالو کا اصل نام محمد صادق تھا اور وہ صحیح معنوں میں ایسا انسان تھا جس نے کبھی اپنی خوبیوں پر ناز نہیں کیا تھا اور ہمیشہ ماں بولی کی خدمت کرنے لیے تیار رہا۔ پاکستان رائٹرز گلڈ اور پاکستان پنجابی ادبی بورڈ کے سیکریٹری کی حیثیت سے خدمات انجام دیں۔انھوں نے پنجابی ادب کی ترقی کے لیے اپنی زندگی کو وقف کر دیا تھا۔ان کی شعری اور نثری تصانیف ''پنجابی ادب''، ''لہراں'' اور امروز اخبار میں چھپتی رہی ہیں۔ ان کی کتابوں میں ''لا پریت اجیہی محمد، ''لوریاں''، ''پنجاب دے لوک گیت''، ''سفر نامہ بھارت''، ''کجھ آر دیاں کجھ پار دیاں''، ''میں تن درد اولے''، ''چھوپے'' اور ''آواجائی'' جیسی کتابیں شامل ہیں۔اس کے علاوہ انھوں نے ''ڈاکٹر نذیر احمد'' کی شخصیت پر بھی ایک کتاب تحریر کی ہے۔انھوں نے پنجابی کی ساتویں جماعت کے لیے درسی کتاب بھی لکھی ہے جس پر وہ بجا طور پر ناز کرتے تھے۔ پنجابی زبان میں کہا جاتا ہے کہ ''اک آہری تے سو کامے'' اسی کے مصداق راجار سالو کو آہری اور کامہ دونوں حیثیتوں سے یاد کیا جا سکتا ہے۔ وہ ''آہری'' کا کردار ادا کرتے تھے تو اپنے ساتھ بہت سے لوگوں کو ''کامے'' بننے پر مجبور کر دیا کرتے تھے اور جب خود ''کامے'' کا کردار ادا کرتے تھے تو پھر کسی دوسرے کی پرواہ نہیں کیا کرتے تھے۔

محمد آصف خاں

پنجابی ادب میں تحقیق اور خصوصی طور پر لسانی تحقیق کے حوالے سے محمد آصف خاں کا نام نمایاں ہے۔ان کی کتابوں ''آکھیا بابا فرید نے''، ''آکھیا بلھے شاہ''، ''آکھیا خواجہ فرید نے''، ''آکھیا میاں جو گی نے''، ''ہیر دمودر''، ''نِک سُک''، ''ہور نِک سُک''، ''پنجابی بولی دا پچھوکڑ''، ''سندھی ادب'' کو پاکستان پنجابی ادبی بورڈ نے شائع کیا ہے۔ان کا شمار پنجابی کے معروف محققین، کہانی کار، مضمون نگار اور ماہر لسانیات میں ہوتا ہے۔انھوں نے پنجابی ادب کے لیے کام کرنے والوں کی نہ صرف حوصلہ افزائی کی بلکہ خود بھی نہایت شوق اور محنت سے اس کام پر لگے رہے۔پاکستان پنجابی ادبی بورڈ کے سیکریٹری کے طور پر انھوں نے نمایاں طور پر کام کیا ہے اور ان کے دور میں بہت سی کتابیں چھپی ہیں۔

جدید ادب کی اشاعت میں پاکستان پنجابی ادبی بورڈ کا کردار

گو پنجابی زبان کے ادب میں جدیدیت ہندوستان میں انگریزوں کی آمد سے شروع ہو چکی تھی تاہم پنجابی نظم کا نیا مزاج خصوصی طور پر انگریزی دور کی مرہونِ منت ہے۔ان اثرات کے تحت اردو کی طرح سے پنجابی میں بھی آزاد نظم، نظم معریٰ، اور فری ورس جیسی اصناف سامنے آئیں۔ پنجابی شعری ادب عوامی رویے کا حامل رہا ہے لیکن قیام پاکستان کے بعد اس میں نئے مضامین اور خیالات نے جگہ بنائی۔اس سلسلے میں دوسرے ممالک کے علوم وفنون اور ان کے ادب سے شناسائی نے پنجابی شعری ادب میں طبقاتی سوچ، ظلم کے خلاف نفرت، جنگ اور رومان جیسے خیالات کو جگہ ملی۔

جدید پنجابی ادب کی اشاعت سے پہلے اس کے لیے کام کرنے والوں کا تذکرہ اور ان کے کام کے بارے میں کچھ معلومات بھی درج کی جارہی ہیں۔ گو کہ ان میں سے اکثر مصنفین اور شعرا کا پاکستان پنجابی ادبی بورڈ سے براہ راست تعلق نہیں رہا لیکن پنجابی زبان کی ترقی وترویج میں ان کے کردار کو بیان کیے بغیر بات ادھوری رہ جاتی ہے۔ان حضرات نے اپنے اپنے انداز سے پنجابی ادب کو نکھارنے اور اس میں نئے دور میں مقبول اصناف کو پنجابی میں اپنانے کی طرف توجہ دیتے ہوئے پنجابی ادب کو دیگر زبانوں کے ادب کے ہم پلہ بنانے کی کوشش کی۔

افسانہ / کہانی

لغت کے اعتبار سے افسانہ جھوٹی کہانی کو کہتے ہیں لیکن ادبی اصطلاح میں افسانہ زندگی کے کسی ایک واقعے یا پہلو کی ایسی فنی پیش کش ہے جو عموماً کہانی کی شکل میں پیش کی جاتی ہے۔ایسی تحریر جس میں اختصار اور ایجاز بنیادی حیثیت رکھتے ہیں۔ وحدتِ تاثر اس کی سب سے اہم خصوصیت ہے۔ ناول زندگی کا کل اور افسانہ زندگی کا ایک جُز پیش کرتا ہے جبکہ ناول اور افسانے میں طوالت کا فرق بھی ہے۔افسانہ دوسری طرح کی کہانیوں سے اسی لحاظ سے منفرد اور ممتاز ہے کہ اس میں واضح طور پر کسی ایک چیز کی ترجمانی اور مصوری ہوتی ہے۔ایک کردار، ایک واقعہ، ایک ذہنی کیفیت، ایک جذبہ، ایک مقصد، مختصر یہ کہ افسانے میں جو کچھ بھی ہو، ایک ہو۔افسانے کی خاصیت ہے کہ یہ اختتام پر قاری کے ذہن پر ایسا تاثر

قائم کرتا ہے جو وحدتِ تاثر کہلاتا ہے۔ پنجابی کے ابتدائی افسانہ نگاروں میں بھائی ویر سنگھ، موہن سنگھ وید، چرن سنگھ شہید، نانک سنگھ اور جوشوا فضل دین کے نام آتے ہیں۔

1۔ ڈُونگھیاں شاماں (نواز)

نواز کی کہانیوں کا پہلا ایڈیشن 1960 میں چھپا تھا اور ساتواں ایڈیشن 2009 میں چھپا تھا جس سے اس کتاب کی اہمیت واضح ہو جاتی ہے۔ کتاب کے ابتدائیہ کے طور پر احمد ندیم قاسمی جیسے بڑے لکھاری کا نواز دے افسانے کے عنوان کے تحت چھ سے زائد صفحات پر ان کے کام کو سراہنا نواز کی کہانیوں کی اہمیت واضح کرتا ہے۔ احمد ندیم قاسمی نے ایک جگہ پر تحریر کیا ہے؛

> ''پاکستان دے اوہناں علاقیاں وچ جتھے پنجابی بولی سمجھی جاندی اے، قصے، کہانیاں کہن والے تے بہت ملدے نیں پر ایہو جیہے کہانی کار گھٹ ودھ ای نظر آوندے نیں، جیہناں نے کہانیاں، افسانہ نویسی دے نویاں اصولاں دے تقاضیاں دے مطابق لکھیا ہے۔ نواز کہانی کار اے جنھے پنجابی زبان نوں معیاری افسانہ دتا اے''۔(2)

اس کتاب میں نواز کے تیرہ افسانے شام دا پہلا تارا، سدا سہاگن، پنڈ دا باؤ، پیار دی کھیڈ، دل دا پر چھانواں، چن دی چاننی، شیر یا وے شیر یا، جیون والے، اک سی تے اک سی بادشاہ، ڈونگھیاں شاماں، ایویں جیہی کہانی، بیری دی چھاں اور پرنے پانیاں دی بارش کے عنوان سے شامل ہیں۔ نواز کی یہ کتاب پنجاب یونیورسٹی کے ایم اے کے نصاب میں شامل ہے۔ جس سے اس کی اہمیت کا اندازہ ہوتا ہے۔

2۔ کالیاں اٹاں کالے روڑ (انور علی)

انور علی نے اس کتاب کو ننگے پاؤں والے اس بچے کے نام کیا ہے جو بڑی دیر تک کوئلوں پر بھنے جانے والے بھٹوں اور اس سے نکلنے والی چنگاریوں کو دیکھتا رہتا ہے مگر جب ان کو بیچنے والا دو، دو آنے کی آواز لگاتا ہے تو وہ چلا جاتا ہے۔ اس کتاب کا پہلا ایڈیشن 1972 میں چھپا تھا جو کہ انور علی کی پہلی کتاب ہے جو سی ایس ایس کے نصاب میں شامل ہے۔ انور علی پاکستان ٹائمز کے کارٹون بناتے اور لکیروں سے اپنی کہانی بیان کرتے کرتے واقعی کہانی کار بن گئے۔ شفقت تنویر مرزا نے ان کے بارے میں لکھا ہے؛

''ایہہ پاکستان دا قیامت والا دیہاڑا نہیں۔ اوس توں پہلاں چو وی ورہے دا ہر دیہاڑا اے گھپ ہنیرا تے بن بوہے والا گول کمرہ اوس دن خاص طور تے ہور وی ڈراؤنا ہو گیا جدوں خاکی وردیاں تے وڈے بوٹاں والیاں انور دے دفتر وچ ہتھکڑیاں نوں انج کھڑکایا جیویں ایہہ وکاؤ مال ہووے۔ پتا نہیں کس سرکار نوں مخبری کیتی سی جے ایس اخبار دے دفتر وچ اسلحہ تیار ہوندا اے''۔(3)

شفقت تنویر مرزا نے اپنی بات کو یوں ختم کیا ہے؛

''ہاں جو گی توں پچھیا سی جے پاکستان دا کیہہ حال اے ویکھ گل ایویں ای لمی ہو گئی اے تے میرے کول ہور ٹکٹاں لئی پیسے نہیں۔ اگلی چٹھی وچ ضرور تینوں پاکستان بارے لکھاں گا۔

انور دی ایہہ چٹھی۔۔۔ ایہہ کتاب۔۔۔ تہاڈے ناں اے، تسیں آپے ای ایہنوں کھولو، پڑھو تے ایہدا نیاں کرو''۔(4)

تقسیم کے بعد پاکستان بننے کے بعد کے واقعات پر مشتمل پندرہ کہانیوں میں انھوں نے کچھ تلخ حقیقتوں سے پردہ اٹھایاہے جن کوپڑھ کر بہت سے سوال اور جواب واضح ہو جاتے ہیں۔

3۔اکبر کہانیاں (اکبر لاہوری)

اس کتاب میں پینتالیس سبق آموز کہانیاں پیش کی گئی ہیں جن میں انسان کی فطرت کے حقیقی انداز کو موضوع بنایا گیاہے۔1976 میں چھپنے والی اس کتاب کے آغاز میں سبط الحسن ضیغم نے مڈھلی گل کے عنوان کے تحت یوں اظہار خیال کیاہے؛

"اکبر کہانیاں حقیقت نگاری دی چنگی مثال نیں۔اوہناں اپنیاں کہانیاں وچ اختصار، علامت نگاری توں کم لیااے تے کُڑتن بھری سچائی نوں سوہنے ڈھنگ نال پیش کیتااے"۔(5)

اکبر لہوری نے بھی سماجی برائیوں جن میں چوہدریوں کے اپنے ملازمین سے رویے اور ان کے دکھ، بہن بھائیوں کے پیار، توہم پرستی، لوگوں کے رویوں، بھوک، بے راہ روی، ملازمت کے مسائل، بڑوں کی بے ادبی، قتل، ڈاکے اور انگریز حکمرانوں کے رویوں کو موضوع بناکر اس انداز سے پیش کیاہے کہ سبط الحسن ضیغم یہ کہنے پر مجبور ہو گئے:

"اکبر لہوری وڈے شاعر نیں یا کہانی کار، ایہہ فیصلہ اسیں نہیں کر سکدے پر ایہہ ضرور آکھنا پووے گا کہ ہر کھیتر وچ اوہناں دی تھاں نویکلی سی۔اوہناں دے کہانی پان یا کہانی لکھن دا ڈھنگ بالکل اپنا اے۔ایہہ اوہ ڈھنگ اے جیہڑا پنجاب دے ہر اوس بچے دے ذہن وچ موجود اے جیس اپنی بھین، ماں، نانی، دادای کولوں باتاں سنیاں نیں۔ اوہناں دیاں کہانیاں تے باتاں دا نکھیڑا کرنا آسان نہیں"۔(6)

4۔چنے دے اوہلے (فرخندہ لودھی)

یہ فرخندہ لودھی کے پنجابی افسانوں کا پہلا مجموعہ ہے جس میں دس نہایت عمدہ افسانے شامل ہیں۔فرخندہ لودھی کا پنجابی زبان میں افسانے کی ترویج کے سلسلے میں کردار نہایت اہم ہے۔فرخندہ لودھی کے افسانوں میں کردار وسیع تر تناظر میں اپنا باطن ظاہر کرتے ہیں۔فرخندہ تعمیر پر یقین رکھنے والی لکھاری تھیں۔ان کو اس بات پر افسوس رہا کہ آج کا انسان تعمیر کی بجائے تخریب کی طرف زیادہ راغب ہے۔بنیادی طور پر وہ مشرقی اقدار کی حامل خاتون افسانہ نگار ہیں جس کو معاشرے نے مناسب حق سے محروم رکھا ہے اور ان کی اداس روح ان کے افسانوں میں جابجا بھٹکتی نظر آتی ہے۔

5۔لوہے دا سپاہی (حنیف چودھری)

حنیف چودھری پنجابی زبان کے عمدہ مصنفین میں سے ایک ہیں۔اس کتاب میں انھوں نے چھ کہانیاں شامل کی جن کو دوسری زبانوں سے ترجمہ کیا گیا ہے۔ان کہانیوں میں عقل و دانش کی باتوں کے ساتھ خاندان میں موجود رشتوں سے محبت اور ان سے سلوک کو موضوع بنایا گیا ہے۔ کہانیوں میں بتایا گیا ہے کہ اپنے ماں باپ کی نافرمانی نہیں کرنی چاہیے کیونکہ وہ ہمیشہ اپنی اولاد کا بھلا چاہتے ہیں۔اخلاقی تربیت کے سلسلے میں یہ سبق دیا گیا ہے کہ وعدہ خلافی اچھی عادت نہیں ہے اور اس سے بچنا چاہیے۔اس کتاب میں جہاں پر ماں باپ کی اپنی اولاد سے محبت کے سچے جذبے کو بیان کیا گیا ہے وہیں پر سوتیلی ماں کے سلوک کے بارے میں بھی بتایا گیا ہے۔ان کہانیوں سے یہ تاثر دینے کی کوشش کی گئی ہے کہ ہمیشہ محنت کے ذریعے ترقی حاصل کرنے کی کوشش کرنی چاہیے اور محنت کامیابی کی ضمانت ہے۔اس کتاب میں چھوٹی چھوٹی کہانیوں کے ذریعے عقل و خرد اور تجربات کی روشنی میں اچھی باتیں بتائی گئی ہیں۔یہ کتاب 1980 میں چھپی تھی۔

6۔چرخے دی موت (حنیف باوا)

حنیف باوا ایک پختہ کہانی کار ہیں اور پنجابی ادب میں نمایاں مقام رکھتے ہیں۔ان کی کہانیاں میں مقامی انداز اور اپنائیت کا احساس پڑھنے والے کو کہانی کے کرداروں میں سے ایک کردار کا روپ دھار کر اس کا حصہ بنا دیتا ہے۔اس کتاب کی

چوبیس کہانیوں میں سے ہر کہانی ہمیں اپنے ارد گرد کی کہانی معلوم پڑتی ہے۔ حنیف باوا نے معاشرے کی اونچ نیچ اور سانجھے دکھ نظر آتے ہیں۔

پاکستان پنجابی ادبی بورڈ نے کتاب کے بارے میں تعارف شائع کرتے ہوئے لکھا ہے؛

''کہانیاں دی زبان سدھ پدھری ہے کوئی بناوٹ نہیں۔High follow کہانی وچ فٹ نہیں ہوندا۔

نہ ای محاورہ وغیرہ۔ کیوں جو کہانیاں مڈھوں بیانیہ ہن جیویں لینڈ سکیپ ہوئے، کدھرے کدھرے

تکراروی ہے''۔(7)

7۔ قصہ کہانی (مرزا حامد بیگ)

یہ مرزا حامد بیگ کی پنجابی کہانیوں کی پہلی کتاب ہے جس کو پاکستان پنجابی ادبی بورڈ نے 1984 میں شائع کیا تھا۔ ان کی کہانیوں میں ہمارا سماج پیش کیا گیا ہے جس میں ظاہری نمائش، بڑھاپے کے دکھ، جنگ اور ان لوگوں کے کردار سامنے آتے ہیں جو دولت اور شہرت کے بھوکے ہیں۔ محمد آصف خاں کی تحریر کے بارے میں لکھتے ہیں؛

''ہن کسے کہانی اتے اوہناں داناں نہ وی سجیا ہووے تد وی اسیں سبھے ای سیان سکدے ہاں کہ ایہہ کس

کہانی کار دی سوجھ دا سٹا ہے۔ کہانیاں دا ایہہ مہاندرا تے نویکلا پن اوہناں نوں ہانی کہانی کاراں توں

وکھرا اوندا ہے اتے اوہناں دی اڈاری ہوند دی سونہہ دیندا اے''۔ (8)

محمد آصف خاں جیسے پنجابی ادب کے نمائندہ لکھاری کا کسی بھی مصنف کے بارے میں اتنا واضح انداز ہی اس کے ادبی مرتبے کو بیان کرنے کے لیے کافی ہے۔

8۔چونویں کہانی (سجاد حیدر)

1986 میں چھپنے والے اس کتاب کے مرتب سجاد حیدر ہیں۔انھوں نے پنجابی زبان میں 1960 سے لے کر 1985 کے دوران تک لکھی گئی تیس لکھاریوں کی کہانیوں کو اکٹھا کیا ہے۔اس کتاب میں موجود کہانیوں کے اکثر مصنفین سے قاری واقف ہیں لیکن چند ایسے مصنفین بھی ہیں جن کی اب تک اکا، دکا کہانیاں منظر عام پر آئی ہیں۔ سجاد حیدر نے اگیتری کہانی تے بھلے راہی کے عنوان کے نیچےان کہانیوں کے بارے میں بارہ سے زائد صفحات تحریر کیے ہیں۔

''کہندے نیں اگ دے ستویں پخ توں کیمیا تیار ہندی اے۔ تے کہانی دی کامنی موہ لین وچ کدوں کسے کیمیانالوں گھٹ اے''۔(9)

9۔ سِیتیاں اَکھاں والے (ناصر بلوچ)

ناصر بلوچ نےاس کتاب کی تیرہ کہانیاں کے ذریعے اپنا تعارف کروایاہے۔انھوں نے معاشرے میں چھوٹے اور کمزور لوگوں کے دکھ اور دیگر سماجی رویوں کو موضوع بنایاہے۔اس کے علاوہ جنگوں کے اثرات کے نتائج میں پیش آنے والے واقعات بھی موجود ہیں۔ یہ کتاب 1986 میں چھپی تھی۔ان کے انداز کے بارے میں سلمان سعید نے یوں اظہار خیال کیاہے؛

''ناصر بلوچ چونکہ بنیادی طور تے اک شاعر اے،ایس واسطے اوہنوں مختصر توں مختصر لفظاں وچ وڈی گل کرن دا فن آؤندااے۔اک گل جیہڑی اوہنوں اپنے دور دے دوجے کہانی کاراں توں وکھ کردی اے یاانفرادیت بخشدی اے اوہ اوہدا کہانی لکھن داڈرامائی اندازاے''۔(10)

10۔ کوک (عائشہ اسلم)

عائشہ اسلم کی کہانیوں کی بھی یہ پہلی کتاب ہے جس میں نوجوان دل میں اٹھنے والی خواہشیں اور جذبوں کو بیان کیا گیاہے۔ان جذبات کی ترجمانی کرتے ہوئے عائشہ اسلم نے عمدہ انداز اپنایاہے اور اپنی بات کہنے میں کافی حد تک کامیاب نظر آتی ہیں کیونکہ ان کی کہانیوں میں نوجوان کرداروں کی شکل میں ان کے جذبات واحساسات اور خواہشات کو اس طرح سے پیش کیا گیاہے کہ وہ زندگی کی حقیقی شکل اختیار کرتے دکھائی دیتے ہیں۔ ویسے بھی ہمارا معاشی نظام ایساہے کہ نوجوانوں کے دلوں میں مچلنے والی خواہشات ان کے دل میں ہی رہ جاتی ہیں اور وہ زندگی کی تلخ حقیقتوں کے آگے بے بس اور بے زبان سی زندگی گزارنے پر مجبور ہوتے ہیں۔

11۔ مٹی اُتے لیک (راشد جاوید احمد)

ہمارے معاشرے کے سماجی اور معاشرتی مسائل جیسے کہ نئی اور پرانی تہذیب کے فرق، غربت، بھوک ننگ، غریبوں کی مشکلات، روٹی کے فکر، امیروں کی چھپی ہوئی صورتیں اور خود غرضی، سرکاری ملازمین کو پیش آنے والی مشکلات وغیرہ کو راشد جاوید نے اپنی انیس کہانیوں پر مشتمل کتاب میں نہایت خوبصورت انداز میں پیش کیاہے جو کہ ان کی پہلی کتاب ہے جس پاکستان پنجابی ادبی بورڈ نے 1986 میں چھاپا تھا۔ انھوں نے اپنی کہانیوں میں ہماری تہذیب میں موجود سماجی اور معاشرتی مسائل کو اپنے انداز میں نمایاں کر کے پیش کیا ہے جس سے پنجابی ادب کے پڑھنے والوں کو یہاں کہ تہذیبی اور ثقافتی زندگی میں موجود اچھائیوں اور برائیوں کے بارے میں آگاہی ہوتی ہے۔اس کتاب کو پنجابی ادب میں ایک اچھااضافہ کہاجاسکتاہے۔

> ''بھورے'' تے ''مور دے پیر'' اوس دیاں اوہ کہانیاں نیں جینہاں وچ بھکھ روزگار تے علاج معالجے دے اوہ مسئلے جیوندے جاگدے پیش کیتے گئے نیں جینہاں دا حل راشد جیسے لوک یاں لکھاری نہیں کر سکدے۔اوہ صرف بھکھیاں بے روزگاراں تے مردے ہوئے مریضاں دے وجود اندر پھردا

ہویا کرب بیان کر سکدے نیں۔ ایہہ کوشش راشد دے کول جنی سوہنی تے فنی اے، اونی ای احساس

دوان والی تے انسانی کرب نوں محسوس کروان والی اے۔"(11)

12۔ ککر دے بُھل (سید نصیر شاہ)

سید نصیر شاہ کی کہانیوں کی یہ پہلی کتاب پاکستان پنجابی ادبی بورڈ نے 1987 میں شائع کی تھی۔ اس کتاب میں اکیس کہانیاں شامل ہیں۔ ان کی کہانیوں کا بنیادی موضوع نچلے طبقے کے لوگوں کا اپنی دھرتی سے پیار ہے۔ یہ بات حقیقت میں درست ہے کہ ہماری تہذیب میں غریب اور نچلے طبقے کے لوگ جن کی زندگیوں میں آسانیاں اور خوشیاں بہت کم ہی موجود ہوتی ہیں۔ وہ کبھی کبھار ان کمیوں اور زیادتیوں کے خلاف آواز بھی بلند کرتے ہیں مگر انہوں نے ہر حال میں اپنی دھرتی، اپنی زمین سے پیار کیا ہے اور ہمیشہ اس کی ترقی اور محبت میں اپنا تن، من، دھن سب کچھ نچھار کرنے میں کمزوری نہیں دکھائی۔

محمد منصور آفاق نے ان کے بارے میں لکھا ہے؛

"شاہ جی دے افسانے دا اسلوب تے مرکزی پہچان خود اوہناں دی ذات بندی اے، جیہڑی اَکھیں کھول کے ہر پاسے ڈِٹھا اے۔ باہر تے اندر دے سارے منظر غور نال ڈِٹھیں تے خود کُوں اوہناں دا گواہ کیتیں تے وَت محسوسات کُوں زبان ڈیون دے ویلے اپنی رُت کُوں اوُں وِچ شامل کر چھوڑا ہس۔ کہانی لکھنا کوئی وڈی گال نہیں پر اپنی شخصیت کُوں اوُں دے وِچ شامل کر کے اوُں کُوں جِیندی جاگدی تصویر بنا چھوڑنا وڈے کمال دی گل اے۔ ایہہ گال کِکر دے بُھل دی خصوصیت اے"۔(12)

پروفیسر اجمل نیازی نے ککراں دی چھاں کے عنوان کے نیچے لکھا ہے؛

''شاہ جی ہوراں دا مشاہدہ بہوں ڈونگھا ہے تے اوہ اپنے ڈیکھن تے ھڈاون کوں فنی پکڑ وچ اُنن دی وڈی چنگی مہارت رکھیندے ہن''۔ (13)

''ہاں دا چانن ساڈی پنجابی کہانی دی تاریخ وچ ہک انوکھا تجربہ ہے۔اصل وچ ایہہ صوفی تجربہ ہے۔ جس نوں شاہ جی تے ادبی تجربہ بنا دتا اے۔اس دی مثال دوجیاں زباناں وچ وی گھٹ ملسی۔ایس طرح نہ ملسی جس طرح شاہ جی نے اس نکی جیہی کہانی وچ بیان کر دتا ہے''۔ (14)

13۔وگدا پانی (منشا یاد)

اکیس کہانیوں پر مشتمل منشا یاد کی یہ کتاب پاکستان پنجابی ادبی بورڈ نے 1987 میں چھاپی تھی۔یہ ان کی کہانیوں کا پہلی کتاب ہے جس میں انھوں نے معاشرے کے نچلے طبقوں کے دکھ، شہر کی زندگی میں موجود افرا تفری، اخلاقی گراوٹ اور عورتوں کی نفسیات کو بیان کیا ہے۔اشفاق احمد نے ان کی کہانیوں پر تبصرہ کرتے ہوئے یادگیریاں والے قصے کے عنواں کے نیچے لکھا ہے؛

''بندے جیہڑے آرہے ہوندے نیں، جا رہے ہوندے نیں۔ کل مکلے یا کٹھ کر کے نیویں پا کے یاں ٹاڑی لا کے کھلوتے ہوندے نیں۔ اوہ تہانوں سارے ای منشا دے افسانیاں وچ ملدے نیں تے سارے ای اپنے جاپدے نیں۔ غصے غصے تے اوکھے اوکھے ہوندے وی اوپرے نہیں لگدے۔ اوپرے اوپرے تے بے تعارفے لوک وی اللہ نہ بھلاوے کدھرے ویکھے ہوئے لگدے نیں۔ بھاویں ناں تھوہ کسے اک دا وی پتا نہ ہوئے۔ایسی کردار نگاری ایسے شخص دا کمال اے تے ایسے دا حصہ

اے۔ایہدیاں کہانیاں دے کردار بڑے ہی سادمرادے، سدھے تے بے چمک جیہے لوک ہوندے نیں۔کسے وچ گھنجل مروڑی یا نفسیاتی کمی نہیں ہوندی جیہڑی پڑھن والے نوں ہلا کے رکھ دیوے"۔ (15)

ان کی کہانیوں کے عنوان بھیڑاں داواڑا،اِک اَنھا کھوہ، سَپ تے خُشبو، انھی چُپ دے بوٹ،اِک سی کاں،ڈنگر بولی، بندے داپُتر، زہر باد، جیکو پچھے، نواب، ایتھر اُن تے اَتھرو، کِکر کنڈے، تیر ھواں کھمبا، سدھراں دی سُولی، لیراں، سرنگی، کرنیچ، وگداپانی، بَوکا، سَویر وادی ہیں۔منشایادنے بسم اللہ کے عنوان کے تحت لکھاہے؛

"کدی کدی مینُوں جاپدااے میں وی اپنے سُتے لیکھاں نُوں جگاون لئی حیاتی دے سفر تے نِکلیا ہویا پینڈو بندااواں۔گھروں نِکلن ویلے میرے کول صرف اپنے کجھ سوال سن جیہڑے میں اپنے سُتے ہوئے لیکھاں نُوں جگا کے پُچھنا چاہنداساں، پر راہ وچ مِلن والے ہور کئی بندے، پکھنُوں، رُکھ تے جنور اپنے اپنے سوال میرے کھیسے وِچ پاندے گئے تے میرابستہ بھاراہوندا گیا"۔(16)

14۔میں تے میں (کنول مشتاق)

کنول مشتاق کی کتاب 1988 میں چھپی جس میں اٹھارہ کہانیاں ہیں۔اس کتاب میں پہلی گل کے تحت محمد آصف خاں نے لکھاہے؛

''اوہناں دیاں کہانیاں وچ غربت، پنڈاں تے شہراں دی حیاتی دا فرق، اکلاپا، محبت، بڑھاپے وچ بڑھے لوکاں دی سوچ، توہم پرستی، بھین بھراواں دی محبت، پڑھن ہاراں دی حالت، کالجاں وچ یونین ورگے موضوعاں نوں چھوہیا اے''۔ (17)

سجاد حیدر نے اپنی مرتب کردہ کتاب چونویں کہانی میں کنول مشتاق کے بارے میں لکھا ہے؛

''ماحول دی تفصیل تے کرداراں دے مہاندرے اگھاڑن دا ول اوہنوں واہوا آوندا اے۔ ایسے کر کے اوہدی کہانی وچ اوہ پکڑ ہوندی اے جیہڑی پڑھاک نوں اول توں آخر تک اپنے مگر مگر لئی آوندی اے''۔ (18)

15۔ منا کوہ لہور (افضل احسن رندھاوا)

افضل احسن رندھاوا ایک کہانی کار ہیں۔ ان کی کتاب منا کوہ لہور کا پہلا ایڈیشن 1989 میں چھپا تھا۔ اس کتاب میں گیارہ کہانیاں شامل ہیں جو اس سے پہلے تماہی پنجابی ادب، ماہوار لہراں، امروز اور پنج دریا میں چھپ چکی ہیں۔ سجاد حیدر ان کے بارے میں یوں بیان کرتے ہیں؛

''افضل احسن صاحب طرز وی اے تے صاحب دل وی۔ ایسے گلے ایہدی تحریر سدھی دل وچ اتر جاندی اے۔ مشاہدے دی باریکی تے گہرائی رندھاوا دے فن دا لنگر اے جیہڑا کہانی دے بے تھوہ سمندر روچ جدوں سٹیا جاندا اے تے پڑھن والے دی توجہ اوتھے ای کھلو جاندی اے''۔(19)

افضل احسن رندھاوانے اس کتاب میں جبر واستحصال، جنگوں اور بھوک سے مرنے والے لوگوں کو دکھ، غربت، لوگوں کی زندگی کے دکھ، نشے کی لعنت کے علاوہ پولیس کے رویے اور امیروں کی من مانیوں کو موضوع بنا کر اس خوبی سے بیان کیا ہے کہ پڑھنے والا کہانی شروع کرنے کے بعد ختم کیے بغیر نہیں رہ سکتا۔

16۔ کلجگ (نزہت گردیزی)

1989 میں پاکستان پنجابی ادبی بورڈ کی طرف سے شائع ہونے والی یہ سولہویں کتاب ہے۔ جس کی کہانی کار اس میدان میں نووارد ہیں۔ انہوں نے اپنی کہانیوں میں اپنے ارد گرد پھیلی سماجی صورت حال، گاؤں اور شہروں کی زندگی میں فرق، امیر رشتے داروں کے اپنے غریب رشتہ داروں سے روا رکھے جانے والے رویے، طالب علموں کی سوچ، توہم پرستی، بے راہ روی، غربت، وڈیرا شاہی اور چھوٹے اور غریب لوگوں کی زندگی میں پیش آنے والے دکھ اور عورت کے قربانی کے جذبوں کو نہایت عمدہ طور پر پیش کیا ہے۔ ان کی کہانیوں کو پڑھتے ہوئے یہ احساس ہوتا ہے کہ وہ اپنے ارد گرد کے ماحول کا نہایت باریک بینی سے جائزہ لیتی ہیں اور ان سے متاثر بھی ہوتی ہیں۔ ان کی کہانیوں کا عنوان پہچان، اک جگراتا، اڈن ہارے، ویلے دا پرچھانواں، اڈار، لیکھ، چپ دا شور، کال، کالے پینڈے، کلجگ، اللہ ہو میں کلی آں، سانجھی پیڑ، خشبو، انھا چانن اور چابی ہے۔ ان کے کرداروں کے بارے میں محمد آصف خاں نے تحریر کیا ہے؛

> ''ایہناں کرداراں دے دکھ سکھ، لوڑاں تھوڑاں، ریجھاں سدھراں ساڈیاں اپنیاں ای ہن۔ ایہہ ہسدے وسدے وی ہن تے روندے کرلاندے وی۔ کہانی کار نے جس جذبے تے خلوص نال ایہناں کرداراں نوں الیکیا ہے، پڑھن ہارے نوں سبھے ای ملوم دیندے ہن''۔(20)

17۔ نُوری (انور علی)

انور علی کی کہانیوں کی یہ دوسری کتاب ہے جو 1993 میں چھپی تھی۔ اس میں چھ کہانیاں پیش کی گئی ہیں جن میں

سے جنازہ جیسی شاہکار کہانی شامل ہے۔ مقصود ثاقب کے مطابق؛

''انور علی نے سانجھے پنجاب دے شہری محلے دی ایہہ کہانی کجھ اجیہے ڈھنگ نال لکھی اے پئی اجو کے نمانیاں محلیاں دے جیون دے کیں گجھے پکھ اگھڑ پوندے نیں۔ کسیاں کامیاں تے باؤاں دی وسوں وچ بھکھ ننگ، مذہب، اخلاق تے انسانی قدراں قیمتاں دا سانجھ شریکا کیویں دا ہونداا ے۔ ایس کہانی نوں پڑھیاں کھری سمجھ لگ جاندی اے''۔ (21)

''انور علی ہوراں اپنیاں پہلیاں کہانیاں وچ ورسی ڈھنگ اپنایا سی۔ ایہو ڈھنگ اوہناں دی ہتھلی کتاب وچ وی ڈھلکاں ماردا ہے''۔(22)

18۔ شیشے دی کندھ (شمس نغمان)

شمس نغمان کی سولہ کہانیاں کی کتاب 1993 میں چھپی تھی۔ جس میں پہلی گل کے عنوان میں انھوں نے ایک جگہ لکھا ہے؛

''میریاں کہانیاں جیہڑیاں ایس کتاب چ نیں تے میریاں کہانیاں جیہڑیاں گواچ گئیاں نیں، میری اپنی دھرتی دیاں جم پل نیں۔ ایس لئی جے میں نگر نگر، گلی گلی، پنڈ پنڈ، پہاڑاں وچ، جنگلاں تے تھلاں وچ، رس دے بھرے شہراں وچ، سنسان تے ہوکدیاں آبادیاں وچ ہون والی توڑ پھوڑ، روح تے دل دی جنگ، جسم تے روح دی جنگ دے گھیرے وچ ایہناں نوں تڑفدیاں اپنیاں اکھاں نال ویکھیا اے''۔(23)

ان کی اس کتاب میں سے کچھ کہانیاں ماہوار پنجابی ادب میں بھی چھپ چکی ہیں۔ ان کی کہانیوں کے موضوعات بھی سماج میں موجود جذبات اور احساسات ہیں اور وہ کہانیاں ان احساسات اور جذبات کی ادائیگی پر مامور کرداروں کے ارد گرد گھومتی ہیں۔

19۔ ترُدے پیر (سلیم خان گمی)

سلیم خان گمی پنجابی، اردو اور انگریزی زبانوں میں یکساں طور پر لکھنے کی صلاحیت رکھنے والے لکھاری ہیں۔ ان کی بہت سی کتابیں شائع ہو چکی ہیں۔ اس کتاب میں چوبیس کہانیاں ہیں اور پاکستان پنجابی ادبی بورڈ نے یہ کتاب 1994 میں چھاپی تھی۔ سلیم خان گمی نے بھی سماج کی صورت حال کو مد نظر رکھ کر اپنے انداز سے بیان کیا ہے جس میں پنجاب کا رنگ نکھرا ہوا نظر آتا ہے۔ محمد آصف خاں نے ان کی کہانیوں کے بارے میں لکھا ہے؛

''پنجاب دے لوک، پنجاب دا کلچر تے پنجابی لوک رہن دے سارے رنگ، اوہناں دیاں کہانیاں دا انگ ہن۔ اتے ایہناں رنگاں نوں اپنیاں کہانیاں وچ کھلار دینا ای اوہناں دا فن ہے''۔(24)

20۔ چُپ دی چیِک (احمد شہباز خاور)

یہ احمد شہباز خاور کی کہانیوں کی پہلی کتاب ہے جو 1994 میں چھپی تھی۔ اس کتاب میں انیتس کہانیاں موجود ہیں جن میں احمد شہباز خاور نے معاشرے میں موجود برائیوں، کمیوں اور فکروں کو بیان کیا ہے۔ ان کی کہانیاں ہمارے معاشرے میں موجود بھوک، بیٹیوں کے جہیز اور شادی کے فکر، دکھاوا، بے بسی اور بے راہ روی کو بیان کرتی ہیں۔ وہ اپنی کہانیوں کے ذریعے نہ صرف معاشرتی برائیوں اور کمزوریوں کو سامنے لاتے ہیں بلکہ اس سے لوگوں میں یہ احساس بھی پیدا کرنے کی کوشش کرتے ہیں کہ کس طرح سے ان کا قلع قمع کیا جا سکتا ہے۔ محمد آصف خاں نے ان کی کہانیوں کے بارے میں اپنی رائے یوں دی ہے؛

''لکھن دا ایہہ پچ ورتب احمد شہباز خاور دا نویکلا ہے پر ساڈے سماج وچ کھنڈیاں کہانیاں دا سگواں مہاندرا

ہے۔ ساڈے روز دیہاڑے دے ورتارے، دکھ سکھ، لوڑاں تھوڑاں، تے ریجھاں سدھراں نوں

اپنیاں کہانیاں راہیں اگے بیاندا ہے جو کجھ سماج وچ لوکائی نال واپر داپیا ہے، ایہناں کہانیاں راہیں اسیں

سدھے سدھ ویکھ سکدے ہاں''۔(25)

21۔اَک دے اَمب (انیل چوہان)

انیل چوہان کی کہانیوں کا ایک ہی مجموعہ سامنے آیا ہے جس کو پاکستان پنجابی ادبی بورڈ نے 1994 میں میں چھاپا تھا۔ اس کتاب میں اٹھارہ کہانیاں ہیں جن کے ذریعے انھوں نے نشے کی لعنت، نئی نسل کے رویوں، ماں باپ کی محبت، ہمارے ہاں موجود بھوک ننگ، بے حسی، بے حیائی اور پیسے والوں کے غرور جیسی معاشرتی لعنتوں کو بیان کیا ہے۔ ان کی کتاب کا عنوان بھی ایسا انوکھا ہے جس میں ہزار معنی پوشیدہ ہیں۔ محمد آصف خاں نے ان کی کہانیوں پر یوں تبصرہ کیا ہے؛

''کہانی بنن ویلے انیل چوہان دا ورتارا کسے پرچارک دا نہیں ہوندا سگوں اک اجیہے لکھیار والا ہوندا اے

جیہڑا اپنے لوکاں دیا ساہواں وچ اوہناں دی بھوئیں دی خشبو رلا دیندا اے''۔(26)

22۔ کہانی (حنیف باوا)

حنیف باوا کی کہانیوں کی دوسری کتاب 1994 میں چھپی تھی۔ اس میں بھی انھوں نے پختہ کہانی کار کے طور پر اٹھارہ کہانیاں پیش کی ہیں۔ پہلی گل کے تحت محمد آصف خاں نے ان کے کام کی تعریف ان الفاظ میں کی ہے؛

''حنیف باوا ہوراں دا ناں پنجابی زبان دے مُڈھلے تے اُگھے کہانی کاراں وِچ گنِیا مِتھیا ویندا اے۔

ساڈے کئی کہانی کار وَڈیاں وَڈیاں گلاں توں نکیاں نِکیاں کہانیاں سرجدے ہن پر ایہہ اجیہا پکّا فن کار

ہے جو ساڈے آلے دوالے پسّریاں نِکیاں نکیاں گلاں نوں وَڈیاں کہانیاں وچ اُن دیندا اے''۔(27)

اس کتاب میں حنیف باوا نے اپنی روایت کو برقرار رکھتے ہوئے معاشرے میں موجود بے انصافیوں اور حالات کی ستم ظریفی بیان کی ہے۔ ان کے موضوعات میں رشوت خوری، استادوں کی بدسلوکی، جہیز، غربت، ماں باپ کی اولاد کی طرف بے توجہی، نشہ اور شراب کی لعنت، بھوک اور ملک میں تقسیم کے وقت کے حالات شامل ہیں۔ یہ کہانیاں اپنائیت کے احساس میں ڈوبی ہوئی تحریریں ہیں۔

23۔ہر دے وچ تریڑاں (فرخندہ لودھی)

فرخندہ لودھی کی 1995 میں چھپنے والی افسانوں کی دوسری کتاب ہے جس کا آغاز سجاد حیدر جیسے کہنہ مشق لکھاری کے ابتدائیے ''ایس لیکھ دا لیکھا'' سے ہوتا ہے۔ انھوں نے جرمن فلسفی شوپن ہار کی بات کو بنیاد بنا کر ایک ایسی حقیقت کی نشاندہی کی ہے جو کئی سوالات کو جنم دیتی ہے۔

''سیہاں تاں بندیاں توں عقل فکر وِچ بہتا تھلے نیں۔ جے اوہناں اِک دُوجی نوں کنڈے چوبھ چوبھ

زخمی کرن دی تھانویں تھوڑی جیہی تھاں چھڈ کے بہن دا سلیقہ سِکھ لیااے تاں بندیاں نوں صدیاں توں

اِک دوجے نال کٹھیاں رہن داوَل کیوں نہیں آیا؟

اس سے آگے وہ ایک زیادہ تلخ حقیقت بیان کرتے ہوئے تحریر کرتی ہیں؛

"کدھرے ایہدی وجہ ایہہ تے نہیں پئی سیہاں دے کنڈے باہر ہوندے نیں تے بندیاں دے اوہناں دے اندر؟ باہر لیاں کنڈیاں نوں ویکھ کے اوہناں توں بچا کیتا جاسکدا اے۔ پَر جیہڑے کنڈے دِسدے ای نہ ہون اوہناں توں دوُجے اپنے آپ نوں کِویں بچان؟ بہر حال کنڈیاں والی مخلوق دِی اِک دوُجے توں وِتھ بہت ضروری اے"۔(28)

اپنی بات ختم کرنے سے پہلے سجاد حیدر نے لکھا ہے؛

"جے ایہناں کہانیاں نوں پڑھ کے تہاڈے دل تے دھمک پوے یاں اندروں کدھروں کسے سسکی جیہی دی آواز آوے تاں ایہہ ایس امر ول اشارہ اے پئی تسیں وی زندگی دے جہاد وچ پیاں بھار کھلون دی ہمت رکھدے او۔۔ ۔۔۔ اوہو ازلاں دی حقیقت! خدا اجے اپنی مخلوق توں مایوس نہیں"۔(29)

اس کتاب میں تیرہ افسانے شامل ہیں جن میں معاشرے کی پوشیدہ حقیقتوں کو بے نقاب کیا گیا ہے۔ ان میں ایسی باتوں کو بیان کیا گیا ہے جن کو ہم سب دیکھتے اور سنتے ہیں لیکن نظر بچا کر اور کنی کترا کر گزر جاتے ہیں۔ کہانی تو ایک ہی ہے کہ ازل سے طاقتور اپنے سے کمزور اور ناتواں لوگوں کو تختہ مشق اور تفریح طبع کا سامان سمجھ کر استعمال کرتے رہے ہیں اور کمزور و ناتواں انسان اپنے آپ کو معمولی کھلونے کے برابر بھی درجہ دلوانے میں ذرہ برابر بھی کامیاب نہیں ہو سکے۔

24۔ پشتو کہانیاں (پروفیسر عاشق رحیل)

1996 میں پاکستان پنجابی ادبی بورڈ کی طرف سے شائع ہونے والی پروفیسر عاشق رحیل کی اس کتاب میں پشتو زبان

کی پچیس کہانیوں کا پنجابی میں ترجمہ پیش کیا ہے۔اس ترجمے کے سلسلے میں ان کے مطابق؛

''ترجمہ کرن ویلے ساڈی نظر دور دراڈے ملکاں تائیں تے بہت چھیتی اپڑ جاندی اے۔ ساڈی ساریاں دی کوشش ایہہ ہوندی اے پئی اسیں روس،انگلینڈ تے امریکہ جیہے ملکاں دیاں لکھتاں دااپنی زبان وچ ترجمہ کریے۔ پر اسیں اپنے آلے دوالے رہن والے اپنیاں بھراواں نوں بھل جاندے ہاں جد کہ اوہناں داحق ساڈے تے ودھیرا اے۔ سانوں اوہناں دے ادب، رہتل، تہذیب، ثقافت تے تاریخ دا جانو ہوناضروری اے''۔(30)

اس کتاب کے بارے میں محمد آصف خاں نے پہلی گل میں لکھا ہے؛

''اک منصوبہ ایہہ وی ہے کہ پاکستان دیاں ساریاں بولیاں تے اوہناں دے ادب نوں پنجابی پیاریاں نوں جانو کروایا جائے۔ مہر کاچیلوی ہوراں دی پنج تارے 1984، ڈاکٹر صابر آفاقی ہوراں دی گوجری ادب 1985 تے رضا ہمدانی ہوراں دی پشتو ادب 1986 تے پشتو کہانیاں ایسے سلسلے دیاں کڑیاں وچوں ہن''۔(31)

اس کتاب کو مرتب کرتے وقت انھوں نے اس بات کا خیال رکھا کہ خیبر پختونخوا کے ہر علاقے کی کہانی کو شامل کیا جائے تاکہ اس طریقے سے کہانی کے ذریعے دوسری زبان کے قاری کے سامنے وہاں پر موجود علاقائی روایات اور ثقافت بھی سامنے آجائے۔ انھوں نے بلوچستان کے کچھ علاقوں میں بولی جانے والی پشتو کی دو کہانیوں کے علاوہ ایک افغان کہانی کار کی کہانی کو بھی اس میں شامل ہے۔ جس سے یہ کتاب پشتو کے تقریباً تمام لہجوں میں لکھی جانے والی کہانیوں کے ترجمہ کی

حامل ہونے کی وجہ سے ایک اہم کتاب مانی جاتی ہے اور اس ذریعے سے پنجابی ادب کے قارئین اپنے ملک کی ایک اور اہم زبان میں موجود کہانیوں اور روایات و ثقافت سے آشنائی حاصل کر سکیں گے۔

25۔ تصویراں والی کہانی (کہکشاں کنول)

کہکشاں کنول کی کہانیوں کا یہ مجموعہ 1998 میں چھپا تھا جس میں اکتیس کہانیاں ہیں۔ ان کی کہانیاں بدلتی ہوئی قدروں، مغرب کی آزادی، جنس پرستی اور توہم پرستی جیسے موضوعات کا احاطہ کرتے ہوئے مختلف مسائل کو واضح کرتی ہیں۔ معروف مصنف اور شاعر احمد ندیم قاسمی نے ان کی کتاب پر تبصرہ کرتے ہوئے کہا ہے؛

"کہکشاں کنول نے دور دراڈے دیس وچ رہن دے باوجود اپنی ماں بولی دا حق اپنی خوبصورتی نال پورا کیتا اے کہ میری نظر وچ تصویراں والی کہانی پنجابی دے نثری ادب دیاں گنیاں چنیاں کتاباں وچ گنی جاوے گی"۔(32)

ان کی کتاب پر تبصرہ کرتے ہوئے فرخندہ لودھی نے تصویراں والی کہانی تے اک جھات کے عنوان کے تحت تحریر کیا ہے؛

"کہکشاں اپنی کہانی دا بی پنجاب دے پنڈاں وچوں وی چکدی اے تے لندن جیسے ماڈرن ترقی یافتہ نگراں دے نگر وچوں وی لبھ لیندی اے"۔(33)

"اک گل کہکشاں دیاں کہانیاں پڑھ کے اوہدے بارے وچ یقین نال آکھی جاسکدی اے کہ اوہ نکیاں نکیاں گلاں نوں وڈیاں تے اہم بنا کے دسدی اے جیہناں بارے عام طور تے بندہ سوچدا وی نہیں۔ اوہ اپنے آل دوالے جس حساب نال ویکھدی اے، اوسے حساب نال اوہدا احساس قلم نسدا اے"۔(34)

26۔ دُوجابٹوارا(حنیف چودھری)

حنیف چودھری پرانے کہانی کار ہیں1996 میں ان کی پہلی کتاب چھپی تھی اور یہ کتاب1998 میں پاکستان پنجابی ادبی بورڈنے چھاپی ہے۔حنیف چودھری نے میرے ولوں کے تحت لکھا ہے؛

''میں ہن تیکر جیہڑی کہانی لکھنا چاہوندا ساں اوہ میتھوں لکھی نہیں گئی کیوں جو اوہ کہانی بہوں لمی ہے

تے میرے کول لفظ بہوں تھوڑے نیں۔اوہ کہانی دکھانت ہے۔سوچ دے سومے وی دکھدے ہن۔

جدوں درد گھٹے گا تے فیر لکھاں گا۔ ہن تے میں دکھاں دیاں پنڈاں بنھ بنھ کے چک رہیاہاں تاں جو

حوصلہ ودھے تے برداشت کیتے ساہ ست پیداہووے''۔(35)

اس کتاب میں اکیس کہانیاں شامل ہیں جن میں مہارنی، اچی کندھ، مٹھے روڑ، ٹٹے گھڑے دی چپنی، بند گلی، پنجواں گھر، پرانے تھہیہ دا اک، سندراں، سلھی ریتا، کوڑ تماں، دوجابٹوارا، اُچھاڑ دی خشبو، دھونی اگ دی، خشبو دا ہوکا، پیلیاں اٹاں، کھبل دی پنڈ، کانجن، بھبھلائے پیر، دھدل دی خشبو اور کالا جگنو شامل ہیں۔اس کتاب کو انھوں نے اپنے سچے دوست ڈاکٹر کرنیل سنگھ تِھند کے نام کیا ہے۔محمد آصف خاں نے پہلی گل میں لکھا ہے؛

''چودھری ہوراں دی کہانی لکھن دی ٹور بھاویں مٹھی ہے پر اوہ ایدھروں کدے او سیلے نہیں ہوئے

جدوں وی اوہناں کہانی چھوہی اے، پورے پنجاب دا وسیب تے رہتل اپنے سبھ تے کجھ نال اوہدے وچ

ڈھلکاں ماردا لبھدا اے''۔(36)

ان کہانیوں میں لوگوں کے سوچنے کے الگ الگ زاویے، غریبوں کا اپنی بیٹیوں کے بیاہ اوران کے جہیز کی فکر اور معاشرے میں عورت کی نفسیاتی کش مکش کو بیان کیا ہے۔

27۔ گواچیاں گلاں (انور علی)

انور علی پنجابی کہانی لکھنے والوں میں ایک نمایاں نام ہے۔ان کی پنجابی کتابوں میں 'نوری' اور 'کالیاں اٹاں کالے روڑ' شائع ہو چکی ہیں۔ 'گواچیاں گلاں' کے نام سے یہ کتاب ان کی آپ بیتی ہے جس کا آغاز تقسیم ہند سے پہلے کے واقعات سے ہوتا ہے۔انھوں نے اپنی آپ بیتی میں تقسیم سے پہلے اور تقسیم کے وقت کے سماجی حالات بتاتے ہوئے اپنی زندگی کے مختلف گوشوں پر روشنی ڈالی ہے۔اس کتاب میں انھوں نے مشاعروں، ادبی محفلوں، انگریزوں کے ساتھیوں کے علاوہ زندگی کے چھوٹے چھوٹے دکھوں کو اپنے انداز میں بیان کیا ہے۔ان کے انداز کی خوبی چبھتے ہوئے الفاظ کا نہایت خوبصورتی سے استعمال ہے جس سے پڑھنے والے کو مزا بھی آتا ہے اور وہ مصنف کو بھی داد دیے بغیر نہیں رہتا۔یہ کتاب ایسے جذبات کی نشاندہی کرتی ہے جن کو بیان کرنا آسان نہیں ہوتا اور یہ تجربات اس کی زندگی پر اتنے گہرے اثرات مرتب کرتے ہیں کہ وہ آخر دم تک اس خیالی دنیا کا اسیر رہتا ہے۔یہ آپ بیتی 1998 میں چھپی تھی۔

28۔ پشو پاشا (جمال ابڑو، محسن عباسی)

سندھی زبان کے لکھاری جمال ابڑو کی کہانیوں کا پنجابی ترجمہ محسن عباسی نے کیا ہے۔اس کتاب میں ان کی سترہ کہانیاں شامل ہیں اور یہ کتاب 1999 میں چھپی تھی۔کتاب کے آغاز انتساب دونوں جمال ابڑو نے تحریر کیے ہیں اور باکمال انداز میں اپنی بات کہی ہے۔پہلی گل میں محمد آصف خاں نے ان کے بارے میں یہ الفاظ کہے ہیں؛

''عالمی پدھر دا ادب او ہو سرج سکدا اے جیہڑا اپنی دھرتی، اپنی ماں بولی، اپنی لوکائی اتے اپنے وسیب تے

رہتل نال جڑیا ہویا ہووے۔جس نے لوکائی دے دکھاں، درداں، ریجھاں، سدھراں نوں نیڑے ہو

کے نیجھ لا کے تکیا ہووے۔ ایہو گن گل جمال ابڑو ہوراں نوں دوجے کہانی کاراں توں وکھر اوندے

ہن''۔(37)

پروفیسر محسن عباسی نے 'میرے ولوں' کے تحت جمال ابڑو کی کہانیوں کو ترجمہ کرنے کا پس منظر بیان کیا ہے۔ ایک جگہ پر وہ رقمطراز ہیں؛

''جمال ابڑو ہوری سندھی کہانی دا سر کڈھواں موڈھی تے جگ مشہور کہانی کار ہے۔ جس دیاں سندھی

کہانیاں کئی عالمی زباناں وچ ترجمہ ہو چکیاں ہن۔ سو میں سوچیا کیوں نا ایس عالمی پدھر دے سندھی

کہانی کار دیاں سندھی کہانیاں پنجابی وچ وی ترجمہ کیتیاں جاون۔ سو میں بغیر پچھے دو، تن کہانیاں ترجمہ

کر دتیاں۔ جد اوہ وکھ وکھ رسالیاں وچ چھپیاں تے اوس لکھیا؛

بخدمت جناب میرے محسن عباسی صاحب، آس ہے تسی خوش ہووگے۔۔۔میریاں کہانیاں دا ترجمہ

بالکل معیاری ہے۔۔۔ انج وی میرا عقیدہ ہے کہ سندھی ادب نوں متعارف کران دا بہترین ذریعہ

سرائیکی یاں پنجابی ای ہو سکدا اے۔ دوجیاں زباناں سندھی ادب دی روح تیک اپڑن دی توفیق ای نہیں

رکھدیاں''۔ (38)

پشو پاشا سندھی عوام کا لوگوں سے تعارف ہے۔ ان کی کہانیوں کے ذریعے لوگوں کو سندھ کے رسوم و رواج، طبقاتی ناہمواریوں، خواتین پر ہونے والے ظلم، انا پرستی، غربت کے مارے لوگوں پر ہونے والے ظلم اور ان کے دکھ، سندھ میں وڈیروں کے چھوٹے لوگوں سے روا رکھے جانے والے رویے، سندھیوں کے عقائد، غیرت، ہمت وغیرہ جیسے موضوعات سے آگاہی ہوتی ہے اور یوں سندھ کی ایک مکمل معاشرتی تصویر سامنے آجاتی ہے۔

29۔انیندرے(ڈاکٹر محسن مگھیانا)

ڈاکٹر محسن مگھیانا کی کتاب ''انیندرے'' دس کہانیوں پر مشتمل ہے جس کو 1999 میں چھپوایا گیا ہے۔انھوں نے اس کتاب میں پنجابی زبان کے جھنگ کے علاقے میں بولے جانے والے لہجے میں معاشرتی ناہمواریوں، بے حسی، دیہی رہن سہن، مقدمے بازیوں، دشمنیوں، بددیانتی، بزرگوں کی بے ادبی، ماں باپ کی بچوں کو دی گئی آزادی اور ڈھیل کے ساتھ معاشرے میں تیزی سے پھیلنے والی نشے جیسی لعنت کو بیان کیا ہے۔ان کا طرز بیان اور زبان پر عبور ان کی کہانیوں میں واضح طور پر نظر آتا ہے۔ محمد آصف خاں نے ان کی تحریر پر یوں بیان کیا ہے؛

''اوہناں اپنیاں کہانیاں وچ اپنی جوہی بولڑی ورتی ہے۔ بولڑیاں ندی، نالیاں وانگ ہوندیاں ہن، جو دریا(بولی)دا ڈھڈ بھر دیاں ہن۔نویں لفظالی دے کے ادبی بولی نوں امیر کر دیاں ہن''۔(39)

''ڈاکٹر ہوراں ڈھیر ساری لفظالی دتی ہے۔پنجابی لکھیاراں نوں چاہی دا ہے کہ اوس نوں پلے بنھن تے اپنیاں لکھتاں وچ اوہنوں ورتن پر اوہناں کجھ لفظاں دی املا اپنے چارن مطابق کیتی ہائی، جو کسے وی صورت وچ وارا نہیں کھاندی''۔(40)

30۔اِک اوپری کُڑی(رفعت)

پنجابی کہانی نویسوں میں رفعت کا نام نمایاں حیثیت کا حامل ہے۔ان کی سولہ کہانیوں پر مشتمل اس کتاب کو پاکستان پنجابی ادبی بورڈ نے چھاپا ہے جبکہ اس سے پہلے اس کتاب کو سنگھم پبلشرز، لاہور نے 1986 میں شائع کیا تھا۔ رفعت کی کہانیوں کی یہ کتاب ایم اے پنجابی کے نصاب میں شامل ہے۔ سجاد حیدر جیسے پختہ کہانی کار، ڈرامہ نویس اور مصنف نے رفعت کی کہانیوں کے اس مجموعے کے بارے میں یوں بیان کیا ہے؛

''کہانی دا ایہہ پراگا اسانوں کنڈیاں دے اوس گلدستے وانگر لگدا اے جیہدے وچ سوہیلے پھل لکے

ہوئے ہون۔ (41)

ان کی کتاب میں ایسی عورتوں کے مسائل شامل ہیں جو ناسمجھ ہونے کی وجہ سے غلط راہ اختیار کر لیتی ہیں۔ اس کے علاوہ ان کہانیوں میں عورت کے جذبات، ان کی ہوس پرستی اور مردوں کی ہوس کو بھی بیان کیا ہے۔

سجاد حیدر نے رفعت کو ان الفاظ میں خراج عقیدت پیش کیا ہے؛

''ساڈے پنجابی ادب وچ حقیقت نگار کہانی کاراں وچوں رفعت داناں سبھ توں پہلے پڑھن والیاں دے

مونہہ اتے چڑھیا تے فیر اوہدے قلم دی سچائی پاروں دلاں وچ اُتر گیا''۔(42)

31۔ سوئمبر (پروفیسر نصیر احمد چیمہ)

یہ کہانیوں کی ایسی کتاب ہے جس میں آج کے سماج کے دور کے مقابل پرانی روایتوں کو بیان کیا گیا ہے۔ پروفیسر نصیر احمد چیمہ ایک پختہ کہانی کار اور سماج کی روایتوں کے ساتھ ساتھ قدروں کے شناسا بھی ہیں اس لیے ان کی کہانیوں میں اپنائیت ہے اور معاشرتی قدروں سے آگاہی حاصل کرنے میں یہ کہانیاں اہم کردار ادا کرتی ہیں۔

32۔ بڑی دیر ہو گئی (اظہر جاوید)

پچیس کہانیوں پر مشتمل یہ کتاب پاکستان پنجابی ادبی بورڈ نے 2004 میں چھاپی تھی۔ اظہر جاوید اردو رسالے تخلیق کے مدیر ہیں اور وہ اپنے اس رسالے میں پنجابی زبان کا ادب شامل کر رہے ہیں۔ اردو لکھاری ہونے کی وجہ سے ان کی پنجابی میں اتنی گہرائی نہیں ہے لیکن ان کی کہانیوں میں ہماری سماجی صورت حال، چھوٹی بڑی ذاتوں میں موجود فرق، دیہاتی

زندگی اور رہن سہن، عورتوں پر ہونے والی زیادتیوں اور ان کی محرومیوں، بے راہ روی، عشق محبت اور اکلاپے جیسے موضوعات بھرپور انداز میں احاطہ کیا گیا ہے۔

انہوں نے اپنی کہانیوں میں نہ صرف اپنے ملک بلکہ دوسرے ممالک کی تہذیب کو بھی بیان کیا ہے۔یوں یہ کتاب دیس اور پردیس دونوں معاشروں میں موجود سماجی برائیوں اور رویوں کی بھرپور عکاسی کرتی ہے۔

33۔ چھوپے (راجہ رسالو)

اس کتاب کو راجا رسالو نے ترتیب دیا ہے۔انھوں نے اس کتاب میں پنجابی زبان میں کہانیاں لکھنے والی نئی اور پرانی خواتین مصنفین کی کہانیوں کا انتخاب پیش کیا ہے۔اس طرح پنجابی ادب کی بہت سی بکھری ہوئی کہانیوں کو ایک کتاب میں اکٹھا کر کے محفوظ کر دیا گیا ہے۔ راجا رسالو کا یہ کام پنجابی ادب میں ایک خوبصورت اضافہ ہے۔اس طرح نئی اور پرانی خواتین مصنفین کی کہانیوں کو ایک جگہ اکٹھا کرنے سے ایک فنی تقابل کی صورت پیدا ہو گئی ہے۔ جس سے نہ صرف نئی لکھاری خواتین بلکہ پرانی لکھاری خواتین کی تصنیفات کا ان کہانیوں کے ذریعے سے تعارف ہو جائے گا۔ پاکستان پنجابی ادبی بورڈ نے یہ کتاب میں چھاپی تھی۔

34۔ نکے نکے دُکھ (پروین ملک)

پروین ملک کی کہانیوں یہ کتاب 2004 میں چھپی تھی۔اس کتاب میں پنجابی زبان کے دو لہجوں کو خوبصورت کہانیوں کے ذریعے پیش کیا گیا ہے۔ مصنفہ کا تعلق چونکہ علاقہ چھچھ سے ہے جب کہ اب وہ لاہور میں رہائش پذیر ہیں اس لیے انھوں نے چھاچی رنگ میں تین اور ماجھی لہجے میں تیرہ کہانیاں تحریر کی ہیں۔ان کے چاچھی لہجے میں کہانیاں لکھنے سے اپنے علاقے سے محبت تو ظاہر ہوتی ہے لیکن ان کہانیوں کے ذریعے پنجابی ادب کے قارئین ان کے آبائی علاقے کی تہذیب و ثقافت سے قدرے آشنائی حاصل کر لیتے ہیں۔

چاچھی رنگ کی تین کہانیوں کے عنوان 'روٹی مینڈھی کاٹھ دی'، 'تال' اور 'جھلی' ہیں۔ راوی رنگ میں 'اکھراں دی موت'، 'پئی وگے ہر وماہیا'، 'گواچے سمے دی خوشبو'، 'ٹالھی تے میرے بچڑے'، 'ذات برادری'، 'کالیاں بھور اکھاں'، 'بارھاں ورھیاں داپندھ'، 'ایتھے کویں گزاریئے زندگی نوں'، 'بھکھڑا'، 'اک سی راجا'، 'تارے لاہنی'، 'تیتھوں اتے'، 'لہور نگ اکھیاں دامنظر نامہ' کے عنوان سے تیرہ کہانیاں شامل ہیں۔ٹائٹل انتہائی دیدہ زیب اور رنگین ہے۔

پروین ملک نے اپنی کہانیوں میں عورتوں کے ساتھ ہونے والی زیادتیوں، چوہدریوں کے لوگوں سے روا رکھے جانے والے رویوں، ذات برادریوں کی تقسیم، چھوٹی عمر میں کی جانے والی شادیوں، بھائی بہنوں کی باہمی محبت، شہروں کی صورت حال اور دیگر سماجی برائیوں کو موضوع بنایا ہے اور ان کو نہایت جامع اور بھرپور انداز میں پیش کیا ہے۔ان کے انداز تحریر پر تبصرہ کرتے ہوئے راجار سالو نے یہ الفاظ استعمال کیے ہیں؛

"پروین ملک ہوراں نوں کہانی لکھن تے لوکاں تک اپڑان دا ول آؤنداا ے۔ اپنیاں کہانیاں وچ پینڈو تے شہری وسیب دا نقشہ ڈاڈھے سوہنے انداز نال کھچیاا ے۔ پروین ملک ہوری معاشرے وچ کھلریاں ہوئیاں سچائیاں نوں کُھلیاں اکھاں نال ویکھدے نیں۔ عورت اتے ہون والے ظلم تے جبر نوں نویکلے انداز نال پیش کردے نیں۔"۔(43)

35۔ شہر تے سُفنے (حسین شاد)

حسین شاد معروف کہانی کار ہیں یہ ان کی کہانیوں کی کتاب ہے جس میں معاشرتی تضادات کو موضوع بنایا گیا ہے۔ بڑی خوبصورتی سے بیان کردہ کہانیوں میں اپنائیت اور جذبات کی موجودگی ان کو اور بھی خوبصورت بنا دیتی ہے۔ جس وجہ سے پنجابی ادب کے پڑھنے والوں فخر اور امتیاز محسوس ہوتا ہے کہ ان کی مادری زبان میں اتنی اچھی کہانیاں تحریر کی جارہی ہیں۔

ڈرامہ

پنجابی ڈرامے کی ابتدا مذہبی ناٹکوں رام لیلا وغیرہ سے ہوئی۔ بھائی ویر سنگھ کے ''راجا لکھ داتا'' کو پہلا پنجابی ڈراما کہا جاتا ہے۔ اس میں سکھوں کی حالت کا نقشہ کھنچا گیا ہے۔ انگریزی اور اردو ادب میں ڈرامے کی صنف کی مقبولیت کو دیکھتے ہوئے پنجابی میں بھی ڈرامے تحریر ہونے شروع ہوئے تو 1899 میں چرن سنگھ نے پنجابی میں ''شکنتلا'' کے نام سے سنسکرت سے ترجمہ کیا۔ شیکسپیئر کے ایک ڈرامے کا نرائن سنگھ نے ''لال بادشاہ'' کے نام سے پنجابی میں ترجمہ کیا۔ ہرچرن سنگھ، ڈاکٹر گوپال سنگھ دردی، سجاد حیدر، اشفاق احمد، بانو قدسیہ، سلطان علی کھوسٹ وغیرہ نے کئی ڈرامے لکھے۔

1۔ سورج مکھی (سجاد حیدر)

سجاد حیدر پنجابی ادب میں اعلیٰ پائے کے مصنف کا مقام رکھتے ہیں۔ ان کی ڈراموں کی یہ کتاب پاکستان پنجابی ادبی بورڈ نے 1970 میں شائع کی تھی اور 1999 میں اس کا پانچواں ایڈیشن شائع ہوا تھا۔ سجاد حیدر نے اپنے ڈراموں میں ایسے کرداروں کے بارے میں بات کی ہے جن کی زندگی میں موجود ظاہری شان و شوکت، چکاچوند اور چمک دمک کو دیکھتے ہوئے لوگ عمومی طور پر ان کے بارے میں یہ رائے قائم کر لیتے ہیں کہ وہ لوگ عملی طور پر بھی زندگی اسی طرح گزارتے ہوں گے جیسا کہ وہ ڈراموں کے کرداروں میں نظر آتے ہیں۔ ان میں 'مداری' اور 'جمورے' جیسے کرداروں کی نفسیات، نشے کی لعنت، توہم پرستی، معاشرے میں اونچے درجے پر قابض لوگوں کی سوچ، عورتوں کی نفسیات اور خیالات کے بارے میں معلومات موجود ہیں۔ سجاد حیدر کے ڈراموں کے بارے میں محمد آصف خاں نے لکھا ہے؛

> ''سجاد حیدر ہوراں دے بالے ہوئے دِیوے راہیں اج ہزاراں ہور دِیوے جگمگ کریندے پئے ہن
>
> تے پنجابی پیاریاں وچ چانن ونڈدے پئے ہن''۔(44)

سجاد حیدر نے درمنداں دے سخن محمد دین گواہی حالوں میں لکھا ہے؛

''لکھیار بندہ وی ہوندااے تے بندیاں دابلاراوی۔ پکھنوواں دابلارا باہر لیاں سوہاں لے کے بولدااے تے ایسے کر کے اوہدے دوالے اکٹھے ہو جان والے اوہدے ہم جنس پھاہی وچ پھس جاندے نیں۔ بندیاں داایہہ بلاراندر دے اشارے تے بولدااے تے دوجے نوں سوجھ تے سچ دے چانن ول بلاندا اے''۔ (45)

ممتاز مفتی نے تعارف کے عنوان میں لکھا ہے؛

''ایہناں اٹھاں ناٹکاں وچوں پنجاں وچ دُکھ دی مِٹھی مِٹھی اَگ دُھکھدی اے۔ سجاد حیدر نے حیاتی دے دُکھ نوں محسوسیا تے اپنے اندر لکائی رکھیااے پر ایہدے دُکھ دی کٹار والی دھار نہیں جیہدے نال ان بھول پڑھن والا پٹھیا جاوے۔ ایہدا دُکھ سومیاں وچوں ہولے ہولے سِمدااے تے حیاتی دیاں رنگاں دی روح سمجھدااے''۔(46)

''سجاد حیدر نے ایہناں ناٹکاں وچ جذبے تے احساس دا میلہ لایا ہویااے، جتھے سنگاں دے سنگ کردار لگے آوندے نیں۔ ایتھے کوئی روک ٹوک نہیں۔ تسیں وی ایس رونق رپے وچ آن رلو، خورے کوئی تہاڈا ہانی وی کسے سنگ وچ رل آیا ہووے۔ ایہہ ساد مرادے دل دے سخی، سوہنے ساہلڑے کردار صدق دیاں جھولیاں بھر بھر لٹاندے نیں تے اُتوں اِنج دِسدے نیں جیویں آپ لٹے گئے ہون''۔(47)

2۔ جزیرہ(منو بھائی)

منیر نیازی کی عمومی شہرت ایک شاعر کی ہے لیکن انھوں پنجابی نثری ادب میں بھی حصہ بٹایاہے۔ان کے تحریر کردہ ڈرامے ''جزیرہ''میں غریبوں کی ایک بستی کے حالات کو موضوع بنایا گیاہے۔امارت کے نشے میں معمور و مخمور افراد اس بستی کو مسمار کر کے وہاں پر نئی آبادی بسانا چاہتے تھے۔ اس پس منظر میں اپنی خواہشات کی تکمیل کی خاطر غریبوں سے کی جانے والی زیادتیوں کو نمایاں کرنے کی کوشش کی گئی ہے۔منو بھائی کا یہ ڈرامہ تیرہ اقساط پر مشتمل ہے جو ٹیلی ویژن پر کئی مرتبہ دکھایا جاچکاہے۔اس ڈرامے میں ہمارے سماج میں موجود بہت سی خرابیوں، غربت، بچوں اور عورتوں کے روّیے، پیری فقیری کے جال اور پھندے، توہم پرستی، نشے کی لعنت، جوان بیٹیوں کے مستقبل کی فکر اور دوستی کے جذبات کو نمایاں کر کے بیان کیا گیاہے۔سبط الحسن ضیغم نے ان کے ڈرامے کو یوں سراہاہے؛

''منو بھائی تِکھا تے تیز ہو ویندا اے تے وکھانت ای ناٹک دی جان ہندی اے۔ایس ناٹک وچ وی اوہ

اپنی ایس پیڑھی رِیت نال موجود نیں''۔(48)

3۔ سوہنا خواب(نواز)

نواز نے اپنے پنجابی ڈرامے اور افسانے میں انسان کے مقصد حیات کو موضوع بناتے ہوئے یہ بتانے کی کوشش کی ہے کہ انسان کو ہمیشہ مثبت سوچ اور اچھے نظریات کا حامل ہونا چاہیے۔اس کو نیک کام کرنے چاہییں۔ بڑوں کی عزت کرنی اور وطن کی ترقی کے لیے کام کرنے چاہییں۔انھوں نے یہ بتایاہے کہ بے مقصد زندگی گزارنا یعنی ایسا انسان جو نہ تو کوئی نیک کام کرے اور نہ ہی کسی کے کام آئے تو اس کے مقابلے میں وہ درخت بہتر ہے جو کم از کم چھاؤں تو دیتاہے۔یہ کتاب 1980 میں چھپی تھی۔

4۔ بوہا کوئی نہ (شفقت تنویر مرزا)

پنجابی زبان کے معروف لکھاری شفقت تنویر مرزا نے مشہور فرانسیسی مصنف اور ڈرامہ نگار ''ژاں پال سارتر'' کے دو ڈراموں کا پنجابی زبان میں ترجمہ کیا ہے جس کو پاکستان پنجابی ادبی بورڈ نے 1980 کو چھاپا تھا۔ 'پہلی گل' میں اس ترجمے کے بارے میں یوں تحریر کیا گیا ہے؛

''پاکستان پنجابی ادبی بورڈ ایس ویلے اک اجیہا ادارہ ہے جیہڑا پاکستان وچ پنجابی زبان تے ادب دی سنبھال، ترقی اتے وادھے لئی کم کر رہیا ہے۔ جتھے ایہہ ادارہ پنجابی دے نویں تے پرانے ادب نال پڑھن ہاراں دی سانجھ قائم رکھن دے جتن کر رہیا ہے اوتھے ای اوس دی ذمہ داری ایہہ وی ہے کہ اوہ دنیا دے اُچے ادب توں وی پاکستانیاں نوں جانو کراوے''۔ (49)

ان ڈراموں کے پس منظر میں فرانس پر جرمن نازیوں کے حملے، پیرس پر قبضے کے بعد ژاں پال سارتر کی قید اور رہائی کے بعد جرمنوں سے نفرت کے جذبات کو بیان کیا گیا ہے۔ ان کی بہت سی کتابوں کے تراجم دنیا کہ دیگر زبانوں میں بھی ہو چکے ہیں۔ شفقت تنویر مرزا نے اس کے انگریزی ترجمے کو پنجابی میں ترجمہ کیا ہے۔

ژاں پال سارتر۔۔۔ فن تے فلسفہ کے عنوان کے تحت فرانسیسی مصنف کی زندگی، تعلیم، تصنیفات اور فلسفے کے بارے میں چند باتیں کی گئی ہیں اور ان کا تقابل پنجابی صوفی شاعری سے کیا گیا ہے۔ شفقت تنویر مرزا کے مطابق؛

''سارتر دے فلسفے موجودیت یا وجودیت دی اِک نہ اِک تنّاں پنجابی دی صوفیانہ شاعری اندر وی گڈی ہوئی ہے۔ موجودیت تے وجودیت وچ خدا دے نہ ہون والی گل نوں پاسے رکھ کے ویکھیا جاوے تے پنجابی دا صوفی شاعر بندے اُتے جو ذمہ داری پاؤندا اے، وجودیت وِی اوہو ذمہ داری بندے اُتے پا

دیندی ہے۔ بندہ مختار وِی ہے تے مجبور وِی۔ ایس مختاری تے مجبور وچ بندے دی زندگی داڈھب کیہہ

ہونا چاہی دا ہے، ایس سوال دا جواب دوہاں کول اکو جیہا ہے۔ کم از کم ٹڈھ اک ہے، ٹہنیاں پتے وَکھ وَکھ

ہو سکدے ہن تے ہین"۔ (50)

5۔ قصہ دو بھراواں دا (منیر نیازی)

منیر نیازی پنجابی ادب کا ایسا نام ہے جس کے بغیر پنجابی ادب کی بہت سی اصناف نامکمل لگتی ہیں۔ وہ ایسا شاعر، افسانہ نگار، کہانی کار، ڈرامہ نگار اور دانشور تھا جس نے پنجابی ادب کو اپنے الگ انداز سے مالا مال کیا۔ 'قصہ دو بھراواں دا' ان کے ڈراموں کی پہلی کتاب ہے جس کو پاکستان پنجابی ادبی بورڈ نے 1981 میں چھاپا تھا۔ شاعری کی طرح انھوں نے ڈراموں میں بھی عوامی انداز اور عام لوگوں کے مسائل کو موضوع بنایا گیا ہے۔ اس کتاب میں دو ڈرامے شامل ہیں جن میں دیہاتی لوگوں کے رہن سہن، ان کے باہمی معاملات، توہم پرستی، غربت اور شہر کے لوگوں کے روّیوں اور دوہرے کرداروں کو موضوع بنایا ہے۔

"ایس کتاب وچ اوس دے دو ڈرامے اوس دی شاعری وانگ ای اپنے اندر نواں پن رکھدے ہن۔ جیہدی وجہ کر کے لہندے پنجاب وچ ای نہیں سگوں چڑھدے پنجاب وچ وی 'ساہت' دے پڑھن ہار ایہناں نوں پڑھن پچھوں ضرور چونکن گے۔ کیوں جو ایہناں وچوں منیر دی سوچ اُڈاری نوں پورے طور تے پڑھیا جا سکدا اے"۔(51)

6۔ شام رنگی کُڑی (نواز)

ڈراموں کی اس کتاب میں نواز کے ریڈیو کے لیے لکھے گئے چھ ڈرامے شامل ہیں جن کو 1983 میں چھاپا گیا تھا۔ یہ ان کے ڈراموں کی پہلی کتاب ہے جس میں پنجاب کی ثقافت، رہن سہن، لوگوں کے آپس میں محبت و نفرت کے جذبات، قربانی اور ایثار جیسے عنوانات نظر آتے ہیں۔ ان کے ڈراموں میں عورت کے کردار کو اس طرح سے پیش کیا گیا ہے جس سے عورت کے جذبات کی بھرپور عکاسی ہوتی ہے۔ اس کے علاوہ معاشرے میں موجود برائیاں جن میں اولاد کی نافرمانی، بڑھاپے میں پیش آنے والی مشکلات اور دکھ، بے اولاد ہونے کا دکھ اور جہیز جیسی لعنتوں کے بارے میں آگاہی ملتی ہے۔ اشفاق احمد نے ان کے کے کام کو ان الفاظ میں سراہا ہے؛

''شام رنگی کڑی دا مصنف اک اجیہا ڈراما نگار اے جیہدے ہر ڈرامے دی بُنتر ہانواں دے تانے تے درداں دے پیٹے نال بُنی ہوندی اے۔ میں سمجھناں واں کہ اک اچھے ڈراما نگار دی شناخت ای ایہواے کہ اوہدے الیکے ہوئے واقعات دی لڑی دے آسے پاسے وی اوہو جیہا سماں ہوؤے جیہو جیہی لڑی دے اندر دی رَت ہووے''۔ (52)

مرزا ادیب کے مطابق؛

''اوہ سدھے سادے ڈرامے لکھدا اے پر ایہناں سدھے سادے ڈرامیاں وچ کوئی اجیہی چیز رکھ دیندا اے کہ اوہدا اہر ڈراما قاری یاں سامع یا ناظر تے گہرا اثر چھڈ دا اے''۔ (53)

7۔ لہو سہاگ (شفقت تنویر مرزا)

شفقت تنویر مرزا کو اپنی پنجابی تصانیف کے ذریعے پنجابی ادب کی خدمت کے ساتھ ساتھ اسے دنیا کی دوسری

زبانیں بولنے اور پڑھنے والوں تک پہنچانے اور اپنے ادب کو دنیا میں روشناس کرانے میں بھی انفرادیت حاصل ہے۔ ان کا منفرد کام یہ ہے کہ انھوں نے دوسری زبانوں کے ادب کا پنجابی میں ترجمہ کر کے نہ صرف پنجابی ادب میں اضافہ کیا ہے بلکہ اس طرح سے پڑھنے اور لکھنے والوں کو ایک نئی راہ بھی دکھائی ہے۔ دوسرے ملکوں اور زبانوں کے ادب کے مطالعہ سے ہمیں اپنی زبان میں لکھے جانے والے ادب کا موازنہ کرنے اور اس کا مقام و مرتبہ جانچنے کا موقع تو ملتا ہی ہے لیکن اس طرح ہم دوسری تہذیبوں سے بھی قدرے قریب ہو جاتے ہیں۔

انھوں نے سپین کے شاعر اور ڈرامہ نگار ''فیڈریکو گارشیا لورکاز'' کے تین ڈراموں کا 'لہو سہاگ' کے نام سے پنجابی میں ترجمہ کیا ہے جس کو پاکستان پنجابی ادبی بورڈ نے 1984 میں شائع کیا تھا۔ 'لہو سہاگ' میں موجود کرداروں اور موضوعات میں ازل سے موجود زن کے جھگڑے پر مرد کا قتل، اولاد کی خواہش، شادی نہ ہونے کے خوف میں مبتلا لڑکیوں کی خودکشی، انتقام لینے کی دھن میں بربادی، لڑکیوں کے گانے، نانی اور دادی کی لوریاں، جوان بیٹوں کی موت، بے راہ روی اور عشق و محبت جیسے موضوعات شامل ہیں جن کو پڑھتے ہوئے یہ کردار اور کہانیاں ہمیں اپنے معاشرے میں موجود قصے کہانیوں کے کرداروں کی طرح نظر آتے ہیں۔ ان ڈراموں سے ہمیں ایسا ہی محسوس ہوتا ہے کہ جیسے ہمارے پنجاب کی بات کی جا رہی ہے کیونکہ یہ تمام جذبات، واقعات، کردار ہمیں اپنے پنجاب میں بھی نظر آتے ہیں۔

8۔ سپ شیہنہ تے فقیر (افضل احسن رندھاوا)

افضل احسن رندھاوا پنجابی ادب کا ایسا نام ہے جس کے ناول، افسانے اور شاعری بہت سی کتابیں شائع ہو چکی ہیں۔ اس کتاب میں چھ ڈرامے شامل ہیں جو 1997 میں چھپی تھی۔ ان کے ڈراموں میں پنجاب کا ثقافتی، سماجی، تہذیبی، سیاسی، مذہبی اور لوک رنگ نمایاں طور نظر آتا ہے۔ ان کے ڈراموں میں پنجاب کی دیہاتی زندگی کی عکاسی اس انداز میں کی گئی ہے کہ ایک ایسا تصویر سامنے آ جاتی ہے جس سے معلوم ہوتا ہے اس معاشرے میں کس طرح صرف عزت اور شان دکھانے کے لیے اپنی کمائی کو مختلف کیسوں اور جیلوں پر خرچ کر دیا جاتا ہے۔ دیہات کے رہنے والوں کے برعکس شہروں کے لوگ ایک دوسرے کے لیے محبت کا وہ جذبہ نہیں رکھتے ہیں۔ پنجاب میں پولیس والوں کے کردار اور روّیے بھی ان کے ڈراموں میں نمایاں کیے گئے ہیں۔ اس کتاب کے آغاز میں سجاد حیدر نے 'چھنج حیاتی دی' کے عنوان کے تحت اپنے خیالات کا اظہار کرتے ہوئے بات کا آغاز ان الفاظ سے کیا ہے؛

"افضل احسن رندھاوا اجو کے پنجابی ادب دا مونہہ مہاندرا اے۔ اوہدیاں کہانیاں تے ناول ساڈیاں

اکھاں اگے دیس پنجاب دی پرانی وسوں دا اجیہا من بھاوندا تے بھرواں نقش کھولدے نیں پئی اپنے

وطن نال پیار کرن والا ایسی تحریر دے سحر وچ کیلیا جاندا اے"۔(54)

اپنی بات ختم کرتے ہوئے انھوں نے لکھا ہے؛

"کہانی کھیتر وچ افضل احسن رندھاوے پہلوں ای اپنی کرت دا گھوڑا پھیر کے ڈھیر تھاں ول لئی ہوئی

اے تے ہن ایہہ گھڑسوار ڈرامے دے نخاس اندر داخل ہویا اے۔ سوار تے ستھرا اے، تھلے جنور وی

واہ واہ ملوک جیہا اے، نالے پہلی سٹے میدان توں چھ کے وی پھنڈ لیا یا اے۔ اگوں جے بندیائی نال جڑیا

رہیا تے اپنے گن دی پالنا کیتی سوُتے ایہہ پڑ وی ایہدے ہتھ ای رہوے گا۔ اسیں تے باہر بیٹھے ہلاشیری

ای دے سکنے آں"۔ (55)

9۔ بول مٹی دیا باویا (سجاد حیدر)

سجاد حیدر کا نام ڈراموں کی صنف کو مقبول کرنے کے سلسلے میں نمایاں حیثیت کا حامل ہے۔ یہ ان کے ڈراموں کا تیسرا مجموعہ ہے۔ پاکستان پنجابی ادبی بورڈ نے یہ کتاب 1997 میں چھاپی تھی۔ ان کے ڈراموں میں معاشرتی اونچ نیچ، سماجی معاملات، نیکی بدی، عدل دیانت، ظلم بے انصافی، پیار نفرت جیسے جذبات کو موضوع بنا کر واضح کیا گیا ہے۔ ان ڈراموں میں کمزور اور چھوٹے طبقے کے لوگوں کے ساتھ کیا جانے والا سلوک دکھایا گیا ہے۔ احمد ندیم قاسمی نے لکھا ہے؛

''جیہڑا لکھاری اپنے اندر اینا ڈونگھا اُتر جاندا اے کہ فطرت دے نال اوس دا رشتہ مک جاوے، اوہ اندروں باہر کدی وی نہیں آسکدا۔ سجاد حیدر اندر باہر دوواں تھاواں داوسنیک اے تے ایسے لئی حق دی گل کردا اے تے ڈب کے وی کردا اے۔ اینی ذمہ داری نال حسن کاری کرنا سجاد حیدر دا ای کمال اے''۔ (56)

20۔خانہ آبادی(میجر اسحاق)

یہ ڈرامے کی کتاب ہے جس کو خاندان کے باہمی معاملات اور تعلقات کے تناظر میں تحریر کیا گیا ہے۔خانہ آبادی میجر اسحاق کا تین ایکٹ کا ڈراما ہے جس کو انہوں نے اردو میں تحریر کیا اور پروفیسر شارب نے اس کا ترجمہ پنجابی میں کیا۔ میجر اسحاق نے اس سے پہلے 'مصلی' اور 'قُقنس' کے عنوان سے پنجابی ڈرامے تحریر کیے تھے۔ پاکستان پنجابی ادبی بورڈ نے 'خانہ آبادی' کو 1999 میں چھاپا تھا اور اس کے صفحات 189 ہیں۔

میجر اسحاق نے اپنے پہلے ڈرامے 'مُصلی' میں مُصلیوں کے بارے میں بیان کیا ہے، یہ تین ایکٹ کا ڈراما ہے جو میجر اسحاق نے 1971 میں جیل میں لکھا۔ 'ققنس' کے نام سے تحریر کردہ ڈرامے میں پنجاب کے حریت پسند بیٹے 'دُلے بھٹی' کی کہانی بیان کی گئی ہے جس کو 1976 میں پنجابی ادبی مرکز نے چھاپا تھا۔

ناول

ناول اطالوی زبان کے لفظ Novella سے اخذ کیا گیا ہے۔ جس کے معنی انوکھا، عجیب، نرالا، نئی چیز اور بدعت کے ہیں۔ اصطلاحی معنوں میں ناول وہ قصہ یا کہانی ہوتی ہے جس کا موضوع انسانی زندگی ہوتا ہے یعنی انسانی زندگی کے حالات وواقعات اور معاملات کا انتہائی گہرے اور مکمل مشاہدے کے بعد ایک خاص انداز میں ترتیب کے ساتھ کہانی کی شکل میں پیش کرنے کا نام ناول ہے۔ ناول کی ابتدا اٹلی کے شاعر اور ادیب 'جینووینی بوکاشیو' نے 1355ء میں 'ناویلا سٹوریا 'نامی کہانی سے کی۔ انگریزی ادب میں پہلا ناول ''پامیلا'' کے نام سے لکھا گیا اُردو ادب میں ناول کا آغاز انیسویں صدی میں انگریزی ادب کی وساطت سے ہوا۔ ناول انگریزی ادب سے اردو ادب میں متعاف ہوا اور پھر پنجابی میں بھی ناول نگاری شروع ہوئی تو ویر سنگھ امرتسری کے ناول ''سندری''، ''بابا نودھ سنگھ'' وغیرہ سامنے آئے۔ چرن سنگھ شہید کا ''رنجیت کورتے دلیر کورنیم'' گوربخش سنگھ اور فضل حسین کے ناول سامنے آئے۔ میراں بخش منہاس نے ''جٹ دی کرتوت'' لکھا۔ نانک سنگھ نے کافی ناول تحریر کیے جن میں ''اگ دی کھیڈ''، ''آدم خور'' وغیرہ شامل ہیں۔ کرتار سنگھ نے ''آندراں'' اور ''نونہہ تے ناں'' وغیرہ تحریر کیے۔ ان کے علاوہ جسونت سنگھ، امرتا پریتم، عبدالمجید بھٹی، افضل احسن اور دیگر مصنفین نے اپنے انداز میں ناول تحریر کیے۔ تقسیم ہند کے بعد سامنے آنے والا ناول جوشوا فضل دین کا ''برکتے'' تھا۔

پروفیسر بیکر نے ناول کے لیے چار شرطیں لازم کر دیں۔ نمبر ایک یہ قصہ ہو۔ نمبر دو یہ نثر میں ہو۔ نمبر تین یہ زندگی کی تصویر ہو۔ نمبر چار اس میں ربط اور یک رنگی ہو یعنی یہ قصہ صرف نثر میں لکھا نہ گیا ہو بلکہ حقیقت پر مبنی ہو اور کسی خاص مقصد یا نقطہ نظر کو بھی پیش کرتا ہو۔ دراصل ناول وہ صنف ہے جس میں حقیقی زندگی کی گوناگوں جزیات کو کبھی اسرار کے قالب میں، کبھی تاریخ کے قالب میں، کبھی رزم کے قالب میں، کبھی سیاحت یا پھر نفسیات کے قالب میں ڈھالا جاتا رہا لیکن ان تمام شکلوں میں جو چیزیں مشترک ہوتی ہیں وہ قصہ، پلاٹ، کردار، مکالمہ، مناظر فطرت، زمان ومکاں نظریہ حیات اور اسلوب بیان کو خاص اہمیت حاصل ہے۔ قیام پاکستان کے بعد پنجابی میں ناول کے ابتدائی مصنفین میں جوشوا فضل دین اور عبدالمجید بھٹی کا نام آتا ہے۔ پاکستان پنجابی ادبی بورڈ نے اب تک تیرہ ناول چھاپے ہیں۔

1۔ جَٹ دی کرتُوت (میراں بخش منہاس)

اس ناول میں مصنف نے معاشرے میں موجود فضول رسوم، فضول خرچی، رشتے داروں کے باہمی جھگڑے، خاندانی رشتوں میں باہمی تعلقات، جہیز کے لالچ وغیرہ کے موضوع پر بات کی ہے۔ میراں بخش منہاس کا ناول ایک سادی کہانی ہے جس کو ناول اس لیے کہا جاسکتا ہے کیونکہ یہ عام کہانی کی نسبت کافی لمبا ہے۔ اس ناول کی سادگی اور بے رنگی کے باوجود اس میں ہمارے معاشرے کے ایسے بہت سے رنگ دکھائی دیتے ہیں جو بہت سے دیگر ناولوں میں نہیں ہیں۔

آصف خان نے لکھا ہے؛

''میراں بخش ہوراں دے ایس اکو ناول نے اج تو پنجاہ ورھے پہلاں پنجابی ناول کاراں نوں اک نویں سیدھ، اک نویں سوچ، اک نواں لکھن ڈھنگ دتا سی۔ اوہناں پنجابی وچ ہور وی ڈھیر سارا لکھیا۔ وڈے ہر کھ والی گل ایہہ ہے کہ اوہناں دیاں باقی چیزاں نہ چھپ سکیاں''۔ (57)

3۔ پہاج (ظفر لاشاری)

ظفر لاشاری کا یہ دوسرا ناول پاکستان پنجابی ادبی بورڈ نے 1983 میں چھاپا تھا۔ محمد آصف خاں نے اس ناول کی تعریف ان الفاظ میں کی ہے؛

''ایس دی بنتر اوہناں اینی پیڈھی رکھی ہے کہ پڑھن ہارے نوں ایہہ اپنی پکڑ وچ جکڑی رکھدی اے۔ اک وار پڑھن چھوہ لوو، وت جد تائیں مک نہیں ویندا ناول ہتھوں چھڈن نوں جی نہیں کردا''۔ (58)

ظفر لاشاری ماہر تعلیم اور کئی دوسری کتابوں کے مصنف بھی ہیں انھوں نے اس ناول میں سرائیکی لہجہ اس طرح سے استعمال کیا ہے کہ پنجابی پڑھنے والا قاری اس سے سرائیکی کے بہت سے الفاظ کے مطالب باآسانی سمجھ لیتا ہے۔ یوں

انھوں نے دوسرے لہجوں کو استعمال کرنے والوں کو سرائیکی لہجے سے آشنا کرنے کا کام بھی کیا ہے۔اس ناول میں عورت کی بیوی کی حیثیت سے زندگی،اس کی نفسیات،سوتن، محبت، عشق، سماجی تقسیم اور عورت کی قربانی جیسے جذبات کو خوبصورت انداز میں پیش کیا ہے۔358صفحات پر مشتمل یہ ناول پنجابی زبان کے ادب میں خوبصورت اضافہ ہے۔

"میں سمجھدا ہاں کہ کہانی نالوں وی ودھ ایس ناول دی وڈیائی ایس دی بولی وچ ہے۔ ظفر لاشاری

ہوراں اجیہی ڈھکویں تے بچاویں بولی ورتوں وچ لیاندی اے۔ جیویں لکھیار دا وڈا مقصد ایہہ ہے کہ اوہ

اپنی مٹھی تے ستر انی بولی دی دکھ توں اساں نوں جانو کروانا لوڑدا اے"۔(59)

3۔چکڑرنگی موُرتی(کہکشاں ملک)

کہکشاں ملک نے اپنے پہلے ناول میں ایک عورت کو معاشرے میں پیش آنے والی مشکلات اور جدوجہد کو موضوع بنایا ہے۔ان کا یہ ناول پاکستان پنجابی ادبی بورڈ نے 1984 میں چھاپا تھا۔ان کے ناول کا عنوان اپنے اندر معنوں کا ایک سمندر لیے ہوئے ہے۔ جس میں برائیوں اور مصیبتوں کو 'چکڑ' سے اور 'مورتی' کو سکھ اور اچھائیوں سے تشبیہ دی جاسکتی ہے لیکن اس کی مزید بھی کئی پرتیں ہیں جن کو واقعات کے مطابق سمجھا جاسکتا ہے۔

اس ناول میں کہکشاں ملک نے طنز بھی کیا ہے اور ان کی تحریر میں کاٹ بھی ہے۔ وہ اپنی بات بیان کرتی ہیں کہ اخبار والے کس طرح سے بلیک میل کرتے ہیں، کس طرح سیاسی قائدین کو دوغلہ پن کامیاب رکھتا ہے، معاشرے میں کمزور لوگوں پر کیا گزرتی ہے، ہسپتالوں میں مریضوں سے کیا سلوک روا رکھا جاتا ہے اور سکول میں پڑھانے والی استانیوں کی مشکلات کیا ہوتی ہیں۔ غرض یہ کہ سماج میں موجود برائیوں کے کوڑھ کی اس طرح سے نشاندہی کی گئی ہے کہ ان سے نفرت ہونے لگتی ہے لیکن ناول میں عورت کی جدوجہد اور کامیابی امید کی کرن جگاتی ہے۔اس ناول کو انھوں نے سولہ ابواب میں تقسیم کیا ہے۔

4۔ٹُٹ بَھج (ترجمہ افضل احسن رندھاوا)

یہ ناول افریقی ملک نائجیریا کے ناول نگار 'شنوا ایشبی' کے چار ناولوں میں سے ایک ناول کا پنجابی ترجمہ ہے جس کو پاکستان پنجابی ادبی بورڈ نے 1986 میں چھاپا۔افضل احسن رندھاوا نے ناول نگار کے بارے میں چند باتیں بیان کرنے کے بعد اس کا ترجمہ کرنے کے بارے میں لکھا ہے؛

''ایس ناول نوں میں انگریزی توں پنجابی وچ ترجمہ کرن دا فیصلہ ایس لئی وی کیتا اے جے اک تے ایہہ اک بہت طاقت ور ناول اے تے دوجے ایہہ ناول پنجاب دے بڑے نیڑے اے''۔ (60)

اس ناول کو پڑھتے ہوئے ہر گز یہ گمان نہیں ہوتا کہ یہ کسی دوسری زبان اور دوسرے علاقے کا ناول ہے کیونکہ اس کے کردار ہمیں اپنے علاقے اور اپنے معاشرے کے کردار نظر آتے ہیں۔اس کی وجہ یہ ہے کہ ہماری طرح سے یہ لوگ بھی مکار انگریز کی چالوں میں آکر ان کے ظلم وستم کا نشانہ بنے۔ یہ ناول انگریزوں کی غلامی کی لعنت اور ان کی بے انصافی کے پس منظر میں تحریر کیا جانے والا بہترین ناول ہے۔

5۔تائی (فرزند علی)

فرزند علی کا یہ پہلا ناول ہے جو 1986 میں چھپا تھا۔اس ناول میں فرزند علی نے پنجاب کے سماجی پس منظر کو سامنے رکھتے ہوئے دیہاتی رہن سہن، رسم ورواج، عشق ومحبت، اولاد کی محبت، یتیمی کا دکھ، حاکموں کے فیصلے اور عورت پر ہونے والے ظلم کو اجاگر کیا ہے۔ محمد آصف خاں نے اس کے بارے میں لکھا ہے؛

''فرزند علی ہوراں ایس ناول دِیاں تَنداں نوں اجیہے ڈھنگ نال اُنیا اے کہ ایہہ ساڈے پنجاب دے پِنڈاں دی کہانی تھی گئی اے۔ سارے پاتراں نوں تُسیں سیانندے او، واہی وان وی ہن تے پٹوانیا وی لمبڑ دار وی ہے تے فوجی وی، کُڑیاں چِڑیاں وی ہِن تے ڈنڈاں پٹاں والے تکڑے گھبروی''۔(61)

6۔ پہلوں دس دتی گئی موت دا روزنامچہ (افضل احسن رندھاوا)

'گیبریل گارسیامارقیس' کے ناول 'ون ہنڈرڈ ایرز آف سالی ٹیوڈ' کا ترجمہ افضل احسن رندھاوا نے 'پہلوں توں دسی گئی موت دا روزنامچہ' کے نام سے کیا ہے۔ اس ناول کو نوبل انعام بھی مل چکا ہے، یہ کہنے کے بعد ناول نگار کی اہمیت اور قدر کے بارے میں مزید کچھ کہنے کی ضرورت نہیں رہتی۔ افضل احسن رندھاوا نے ناول نگار کے بارے میں 'دو گلاں تے ناول بارے ادھی گل' کے عنوان کے نیچے گیارہ صفحات پر ناول اور ناول نگار کے بارے میں خاصی تفصیل دی ہے۔ محمد آصف خاں نے 'پہلی گل' میں لکھا ہے؛

''ایس ناول دا دنیا بھر دیاں وڈیاں زباناں وچ ترجمہ ہو چکیا ہے۔ ساریاں پاکستان زباناں دیاں جھولیاں ایس عالمی پدھر دے ناول کھنوں سکھیاں ہن۔ ایس ناول نوں سبھ توں پہلاں چھاپن دا مان پنجابی زبان لے رہی ہے۔ اتے ایہدی ودھائی افضل احسن رندھاوا ہوراں نوں جاندی ہے''۔(62)

'گارسیامارقیس' کی کہانی بھی پنجاب کی تہذیب کے بہت قریب ہے۔ اس ناول کو پڑھتے ہوئے پنجاب کے غیرت مند جوان اور یہاں کی روایات سامنے آجاتی ہیں اور یوں یہ ناول اپنائیت کا احساس دلاتا ہے۔

7۔چیتر باغ(سجاد حیدر)

سجاد حیدر پنجابی کے ایسے مصنفین میں شامل ہیں جو کسی تعارف کے محتاج نہیں ہیں۔ان کا یہ ناول 1992 میں چھپا۔ محمد آصف خاں نے 'اپنی گل' کے عنوان کے نیچے لکھا ہے؛

''اوہناں ایس ناول وچ پنجاب دی رہتل، رسم و رواج، ملک ونڈ ویلے دے حالات، خودکشی، جسمانی تسکین، رشوت خوری تے اولاد دی سک جیہے موضوعاں نوں بیانیا اے''۔(63)

''سجاد حیدر ہوراں اپنے ناول وچ اک پنڈ دی رہتل نوں انج الیکیا اے کہ ایہہ پنجاب دے سارے پنڈاں دی کہانی بن کے رہ گئی اے''۔(64)

8۔سنجان(نذر حسین جانی)

یہ نذر حسین جانی کا پہلا ناول ہے جس میں دیہاتی رہن سہن، دیہات کے رسوم و رواج اور روایات، تعلیم کی اہمیت اور ضرورت،اولاد کا شوق، معرفت، جنسی پہلو اور چودھریوں کا اپنے کمیوں سے سلوک وغیرہ جیسے موضوعات کو قلم بند کیا گیا ہے۔اس ناول کو پاکستان پنجابی ادبی بورڈ نے 1992 میں چھاپا تھا۔ محمد آصف خاں نے پہلی گل کے عنوان کے نیچے لکھا ہے؛

''میری جاچے جیہڑا بندہ دھرتی، وسیب یا بولی وچوں کسے اک نالوں وی اپنا سانگا توڑ لیندا اے، اوہ اپنی سنجان گوا بہندا اے۔ اجیہا سنجان میٹر بندہ اپنے ساکاں سیناں وچ وی اوبھڑ بن کے اپنے جیون پل لنگھاوندا اے''۔(65)

9۔اِک چُونڈی لوݨ دی(فرزند علی)

پاکستان پنجابی ادبی بورڈ کی طرف سے فرزند علی کا 1994 میں چھپنے والا یہ دوسرا ناول ہے۔ سعید بھٹہ نے اس ناول کے بارے میں پہلی گل میں لکھا ہے؛

''ایہہ ناول پچھلے چالھی ورھیاں توں بیٹھلے میل دے حقاں لئی یُدھ تے اُتلے میل دے دھرُوہاں دی کتھا ہے۔ کلیم اللہ نوں کیموبنان والیاں دا کھلا ڈُلھا مہاندرا اے۔ جیونے ورگیاں سدھیاں دے مونہوں وی اک چونڈھی لوݨ دی منگ وی اے تے وصیت وی''۔(66)

اس ناول میں پنجاب کی پرانی کہانی دہرائی گئی ہے جس میں ہمیشہ ایک طاقتور اپنے سے کمزوروں پر نت نئے ستم ایجاد کرتا رہتا ہے۔اس ناول میں بھی ایک ایسے ہی جاگیر دار اور صنعتکار کے ملی بھگت کی کہانی بیان کی گئی ہے جو اپنے علاقے میں سر اٹھانے کی کوشش کرنے والے کسی کمزور کو برداشت کرنے کو تیار نہیں ہے۔وہ اس کو ہر طرح سے دبانے اور اپنا محتاج رکھنے میں کامیاب رہنے کے لیے ہر حد سے گزر جاتا ہے اور یوں اپنی چودھراہٹ کو قائم رکھتا ہے۔سعید بھٹہ نے لکھا ہے؛

''اِنج ایہہ ناول بیتے چالھی وَرھیاں دی تاریخ ہے۔لوک موّرخ دی لکھی تاریخ۔لوک سجن کرداراں دا نِت دُکھانت ہے۔کیوں جو ناول نگار نے لوکاں نال واپری دا شیشہ جو وکھاونا ہائی۔۔۔اساڈیاں کیتیاں دا۔۔۔اساڈے نال واپریاں دا۔۔۔اساڈے نال ہوئیاں دا۔ناول دا سدھا ڈھنگ باہواں اُلار اُلار کے پڑھیاراں نوں اپنے وَل سددا اے''۔(67)

10۔ لہور نگی سویر (احسان باجوہ)

احسان باجوہ کے ناول کا پہلا صفحہ ہی انسان کو ایسے حصار میں لے لیتا ہے جس میں پیار کی ایسی من موہنی صورت پیش کی گئی ہے جس کا مقابلہ دنیا میں شاید کوئی بھی نہیں کر سکتا۔ انھوں نے چڑھاوا کے عنوان سے لکھا ہے؛

''جنت دے مکھ ورگی اپنی ماں جی نوں جیہنے پنجاب دھرتی دی بھاگاں والی زبان پنجابی دا پہلا حرف میرے کن پایا''۔(68)

ان کا پہلا ناول ہے جس کو پاکستان پنجابی ادبی بورڈ نے 1994 میں چھاپا تھا۔ اس میں انھوں نے صدیوں پرانے جاگیر دارانہ نظام طبقاتی اونچ نیچ، پرانے رسوم ورواج اور دیگر سماجی برائیوں کا احاطہ 358 صفحات پر کیا ہے۔ انھوں نے اپنے ولوں میں لکھا ہے؛

''ہتھلا ناول لہور نگی سویر ایہو جیہے وسیب دے پنڈ واسی لوکاں دے روّیے دی گل کردااے۔ ایہہ حیات دے ہر طبقے دی وکھری وکھری سوچ نوں الیکن دی کوشش اے۔ ایہدی زبان لفظاولی اتے خیال بارے ایہنوں پڑھن والے سجن ساتھی ای چنگی جانکاری دے سکن گے''۔(69)

11۔ پکی سڑک (پروفیسر مہر سردار خان)

یہ پروفیسر مہر سردار خان کا پہلا ناول ہے جس کو پاکستان پنجابی ادبی بورڈ نے 1995 میں چھاپا تھا۔ اس ناول میں محمد آصف خاں نے پہلی گل میں لکھا ہے؛

''پروفیسر مہر سردار خان ہوراں دا ناول پنجاب دی رہتل، ایتھوں دے سماج اتے خاص کر کے پنڈاں

دے مسئلیاں ول دھیان دواندا اے۔ ناول دا تانا بانا اجیہے آلے دوالے بارے اُنیا گیا ہے جس توں

سانوں جھنگ دی رہتل نوں ویکھن، جاچن تے اوہدے توں جس لین دا موقع ملدا اے''۔(70)

پروفیسر سردار خان نے 'پکی سڑک' کے عنوان کو علامتی معنوں میں لیا ہے۔ جس وقت اتنی سڑکیں نہیں تھیں، گاؤں کے لوگوں میں باہمی محبت اور ایثار موجود تھا۔ سڑکیں بننے سے لوگوں کے دلوں میں تو دوریاں پیدا ہو گئی ہیں لیکن یہ سڑکیں لوگوں کی شعوری بلندی کا باعث بھی ہیں اور تعلیم عام ہونے سے ذات پات کی تقسیم تو ختم نہیں ہوئی لیکن اتنی کم ہو گئی ہے کہ کسی غریب ترکھان کا بیٹا بھی ڈاکٹر بن کر معاشرے میں وہی حیثیت حاصل کر لیتا ہے جو کوئی دوسرا ڈاکٹر حاصل کرتا ہے۔ اس ناول میں بھی ذات پات جیسی سماجی برائی کو موضوع بنا کر اس کی نشاندہی کی گئی ہے۔ 340 صفحات پر محیط یہ ایک عمدہ ناول ہے۔

12۔ بُھُبھل (فرزند علی)

فرزند علی کا ناول ویسے تو 1995 میں چھپا تھا لیکن اس سے پہلے یہ ناول گورمکھی رسم الخط میں آرسی پبلیکیشنز نے بھی چھاپا ہے۔ یہ ایک ضخیم ناول ہے جس کے بارے میں محمد آصف خاں نے پہلی گل میں لکھا ہے؛

''استاد دامن دی اکتھ کہانی نوں فرزند علی ہوراں ناول دا روپ دتا ہے۔ اوہناں دیاں لکھتاں دا وڈا گن

حقیقت نگاری ہے۔ ناول کار کیوں جو مزدور یونین نال جڑیا ہویا ہے ایس پاروں اتلے میل تے ہیٹھے

دھر وچلے جو کھچ تان ٹری آوندی ہے، اوہدا اویر وا دینا کدے نہیں وساردا''۔(71)

ناول نگار نے کچھ میرے ولوں میں لکھا ہے؛

"استاد دامن اوس سمے کیویں حیاتی گزار رہے سن۔ جیویں میں ویکھیا سی، جو کجھ سمجھ آئی، پوری سچائی نال لکھن دا چارا کیتا اے۔ ایہہ وی دسن دا جتن کیتا اے جو اوہناں اپنے پچھو کڑ تے بچپن بارے مینوں دسیا سی۔ اپنی محبت، اپنی نفرت تے بیتی حیاتی اوہناں میتھوں نہیں سی لکائی۔ ہو سکدا اے کجھ گلاں رہ گئیاں ہوؤن پر میں اپنے ولوں کجھ نہیں لکایا۔ میں اپنے ولوں استاد دامن دی حیاتی بارے بالکل دیانتداری نال لکھن دی ہمت کیتی اے"۔(72)

گو کہ ناول نگار کے ان الفاظ کے بعد ناول کے بارے میں کچھ کہنے کی ضرورت باقی نہیں رہتی لیکن تھوڑا پس منظر یوں ہے کہ یہ ایک سوانحی ناول ہے۔ ناول نگار کا تعلق محنت کش گھرانے سے ہے اور اس نے نہ ہی اس بات کو اپنے لیے طعنہ سمجھا ہے۔ اس ناول کے پس منظر میں شیخوپورہ کے صنعتی علاقے کے اثرات اور زرعی رہن سہن میں ہونے والے واقعات بھی ملتے ہیں۔ پنجاب سے نکل کر یہ ناول سندھ کی دیہاتی زندگی اور وڈیرہ شاہی کے ہتھکنڈوں پر بھی روشنی ڈالتا ہے اور یہ بتاتا ہے کہ کمزوروں پر صنعتی اور دیہی علاقوں میں ایک جیسی بیتتی ہے۔

13۔ سورج گرہن (افضل احسن رندھاوا)

افضل احسن رندھاوا کا نام پنجابی پڑھنے والوں کے لیے نیا نہیں ہے، اس سے پہلے ان کے دو ناول چھپ چکے ہیں۔ افضل احسن رندھاوا ناول نگار، کہانی کار، شاعر کے علاوہ مترجم بھی ہیں۔ انھوں نے انگریزی زبان کی متعدد اصناف کو پنجابی میں ترجمہ کیا ہے۔ ان کے ناول پر اظہار خیال کرتے ہوئے ستار طاہر نے ایک جگہ لکھا ہے؛

"افضل احسن رندھاوا پنجابی دا اوہ نثر نگار اے جیہنے کہانی کار تے ناول نویس دی حیثیت نال ایہہ ثابت کیتا اے کہ اوہدی نثر وچ پنجاب دی دھرتی دی مہک رچی ہوئی اے۔ اوہد ے لہجے دی

Authenticity توں انکار نہیں کیتا جاسکدا۔ افضل احسن رندھاوا پنجابی زبان دیاں ساریاں نزاکتاں

تے پرتاں نوں ورتن داہنر جانداا ے''۔(73)

''میں باہر دی گل نہیں کردا۔ اردو وچ ناول دی تکنیک تے فارم وچ کئی تجربے ہوئے نیں پر کوئی وڈا

تخلیقی ناول ایس تکنیک وچ نہیں لکھیا گیا جیہڑی تکنیک وچ سورج گرہن لکھیا گیااے''۔ (74)

خطوط کے انداز میں تحریر کردہ اس ناول کو وارث شاہ ایوارڈ اور اکادمی ادبیات کی طرف سے ایوارڈ مل چکے ہیں۔ اس ناول میں 'ایوا' اور 'صاحباں' دو علامتی اور بنیادی کردار ہیں جو دو مختلف دنیاؤں سے تعلق رکھتے ہیں۔ یہ دنیا ظاہری بھی ہے اور باطنی بھی۔ 'ایوا' کے سارے خطوط انگریزی میں اور 'صاحباں' کے خطوط میں سے کچھ انگریزی اور کچھ اردو میں تحریر کیے گئے ہیں۔

متفرق شاعری

1۔ کالا پینڈا (افضل احسن رندھاوا)

اس کتاب میں افضل احسن رندھاوا نے 19 افریقی ملکوں کے 41 شاعروں کی 82 نظموں اور 11 امریکی شاعروں کی 19 نظموں کا پنجابی میں ترجمہ کیا ہے۔ یہ سارے شاعر کالی رنگت کے والے (حبشی) ہیں۔ کتاب کے ٹائٹل پر 'کوتر سو افریقی نظماں' لکھا گیا ہے جس کا مطلب ایک سو ایک ہے۔ افریقی ملکوں میں سینی گال، گھانا، نائیجیریا، جنوبی افریقہ، مڈغاسکر، انگولا، کیمرون، کینیا، یوگنڈا، زائر، کیپ وردی آئی لینڈ، مالاوی، گیمبیا، نیاسالینڈ، سوؤلومی، موزمبیق، ماریتانیا، گانگو، گنی جیسے ملک شامل ہیں۔ کسی بھی دوسری زبان سے ترجمہ کرنا ایسا فن ہے جس کے لیے نہ صرف اس زبان اور اس کے رموز و اوقاف کو جاننا ضروری ہوتا ہے بلکہ اس زبان کی علاقائی، سیاسی، ثقافتی، مذہبی، تاریخی اور ادبی معلومات حاصل کیے بغیر اصل روح کو بیان نہیں کیا جاسکتا۔ پھر اگر شاعری کا ترجمہ کرنا ہو تو یہ کام مزید مشکل ہو جاتا ہے۔ افضل احسن رندھاوا نے اس کام کو کس انداز میں انجام دیا ہے اس بارے میں ستار طاہر نے تحریر کیا ہے؛

> ''ترجمہ کرنا بڑا مشکل فن اے۔ ایک تخلیق نوں جیہڑی اوپری زبان وچ ہووے اوہنوں اپنی زبان وچ تبدیل کرنا ایک مشکل کم اے۔ ایہہ گل عام قسم دیاں ترجمیاں بارے وی آکھی جاسکدی اے۔ پر ایسے گل توں اندازہ لگ سکدا ہے کہ تخلیقی ترجمے دا فن کنا مشکل ہووے گا۔ ایہہ کم اوہو بندہ کر سکدا ہے جیہڑا نہ صرف اپنی تے بیگانی دوواں زباناں اُتے پورا عبور رکھدا ہووے۔ سگوں اصل تخلیق دی روح نوں وی سمجھدا ہووے تے اوہنوں اپنی زبان وچ ڈھال وی سکدا ہووے تے آپ وی وڈا شاعر ہووے''۔ (75)

اس سے پہلے ستار طاہر نے اپنی خیالات کے اظہار کا آغاز ایسی بات سے کیا ہے جو دنیا کی تمام زبانوں والوں کو ایک مالا کی شکل میں اکٹھا کر سکتی ہے؛

''میں اپنا اِک ہتھ ساری دنیا ول ودھایا اے تے دُوجا ہتھ اپنے لوکاں وَل کرناہاں کہ اوہ ایس ہتھ نوں پھڑ کے ساری دنیا دی لوکائی نال ہتھ ملاون تے اک دوجے دے دل دیاں دھڑکناں گن لین''۔ (76)

کتاب کے آخر میں شاعروں کے بارے میں کچھ معلومات بھی دی گئی ہیں۔ یہ کتاب 1988 میں چھپی تھی۔

2۔ نظراں کردیاں گلاں (صوفی تبسم)

یہ کتاب صوفی تبسم کی شعری تخلیقات کا مجموعہ ہے جسے پاکستان پنجابی ادبی بورڈ نے 1988 میں چھاپا تھا۔ صوفی غلام مصطفی تبسم فارسی، اردو اور پنجابی زبان کے شاعر تھے۔ اس کتاب میں ان کا پنجابی کلام پیش کیا گیا ہے جس میں 3 نعتیں، 12 نظمیں، 8 گیت، 25 دوہڑے، 13 غزلیں، 3 رباعیاں اور 8 ملی ترانے شامل ہیں۔ صوفی تبسم نے 'اقبال'، 'شیلے'، 'ورڈزورتھ' اور دیوان غالب کا پنجابی ترجمہ کیا ہے۔

''اوہناں دا پنجابی کلام پڑھ کے پڑھن والا ایہہ سوچن لگ جاندا اے کہ اوہناں میرے ای دل دی ترجمانی کیتی اے۔ ایہہ اوہدے ای جذبات تے احساسات نیں۔ اوہ ایہہ سمجھن لگ جاندا اے کہ صوفی صاحب اوہدے غم وچ برابر دے شریک نیں تے اوہدا درد اپنا سمجھدے نیں''۔ (77)

3۔ کچے گھڑے (باقی صدیقی)

باقی صدیقی پنجابی زبان کے پوٹھوہاری رنگ میں شاعری کرنے والے شاعروں میں شامل ہیں۔ ان کی شاعری میں پنجاب کی دیہی ثقافت کی جھلک نہایت واضح ہے۔ اس کتاب میں ان کی خوبصورت شاعری شائع کی گئی ہے۔ منیر نیازی کی شاعری پر رائے منصب علی خان نے 'اک دو گلاں' اور منیر احمد شیخ نے 'چھیویں حس دی شاعری' کے عنوانات کے تحت اظہار خیال کیا ہے۔ ان کی نظموں کے عنوانات بھی پنجاب کی دیہی ثقافت کی نشاندہی کرتے ہیں۔ عنوانات میں 'باری وچ بیٹھا تکاں'، 'ایویں مینڈا اصافہ کھلا'، 'دل عمراں ناں پینڈا ناپے'، 'بھری جوانی شکر دو پہراں'، 'کھیڈن دے دن چار'، 'وگنا پیاسواں ڈھولا' وغیرہ شامل ہیں۔ منیر احمد شیخ کے مطابق؛

> ''جے تسیں مینوں مصور دی اصطلاح استعمال کرن دی اجازت دیوتے میں کہواں گا کہ باقی صدیقی دی شاعری واٹر کلر یعنی پانی رنگیاں تصویراں نیں۔ جینہاں وچ کتے کتے تیز بُرش لا کے ڈونگھے جذبے نوں نکھاریا گیا اے''۔ (78)

سفر نامہ/آپ بیتی

1۔ دیس پردیس (سلیم خان گمی)

یہ دراصل سلیم خان گمی کا اسلام آباد سے لندن کا سفر نامہ ہے جس کو پاکستان پنجابی ادبی بورڈ نے 1978 میں چھاپا تھا۔ پنجابی ادب میں منظوم سفر نامے تو ملتے ہیں لیکن نثری سفر ناموں کا رواج نہ ہونے کے برابر ہے۔ انھوں نے اس کتاب میں سفر پر جانے سے پہلے، سفر کے دوران اور اس کے بعد پیش آنے والے واقعات بیان کیے ہیں جس سے پنجابی ادب میں نئ صنف کی ابتدا کے ساتھ مفید معلومات بھی ملتی ہیں۔ انھوں نے لندن میں ہونے والی ادبی محفلوں اور چوالیس شاعروں اور ادیبوں کا تذکرہ بھی کیا ہے۔ ایم مسعود نے اس کے بارے میں اپنے تاثرات کا اظہار یوں کیا ہے؛

> ''سفر تے کسے قسم دا ہووے کہانی کار جاں ناول نویس دے ہتھے چڑھن نال ہور وی دل کھچن والی سرجنا بن ویندی اے۔ ایہو کارن اے کہ سلیم خان گمی اپنی ایس نویں کھیچل نوں ہور وی دل موہ لین والی رچنا بناون وچ کامیاب رہے ہن۔ ایہہ پنجابی ادب وچ اک نرویاوادھا اے۔ جینھوں پنجابی جگت ساہمنے پیش کرن دامان لیا جارہا ہے''۔(79)

2۔ لاپریت اجیہی محمد (راجہ رسالو)

راجا رسالو کا شمار زندگی بھر پنجابی زبان کی ترقی و ترویج کے لیے کام کرنے والوں میں اولین درجے پر ہوتا ہے۔ پنجابی زبان میں مثل مشہور ہے ''اِک آہری تے سو کامے''، لیکن راجا رسالو ساری زندگی خود 'آہری' کے ساتھ ساتھ 'کامے' بھی رہے اور ساری زندگی ماں بولی کی خدمت میں گزار دی۔ یہ کتاب ان کی آپ بیتی ہے جس کو ان کی وفات کے

بعد پاکستان پنجابی ادبی بورڈ نے 2008 میں چھاپا۔ یہ آپ بیتی اقساط کی صورت 'سویر' رسالے میں بھی چھپ چکی ہے۔ پروین ملک نے ان کے بارے میں لکھا ہے؛

''اوہناں ساری حیاتی پنجابی دی سیوالئی کم ٹوری رکھیا۔ کدی کسے نوں گلہ گلا ہما نہیں دتا، کدی ایس گلوں اپنی ماں بولی ولوں کنڈ نہیں کیتی پئی دوجے لوکی تاں ارام نال بیٹھے نیں تے میں دھپاں، میہناں وچ جھج رہیا واں۔ ایہو جیہے بندے دی لیہہ تے ٹرنا کیڈا اوکھا کم اے، ایہہ گل سارے جاندے نیں تے جیہڑے نہیں جاندے، اوہناں نوں آپے پتا لگ جاندا اے جدوں اوہ راجا رسالو بنن دی کوشش کردے نیں''۔(80)

راجا رسالو کا اصل نام محمد صادق تھا۔ انھوں نے پہلے پہل محمد صادق عاجز کے نام سے لکھنا شروع کیا لیکن سرکاری ملازمت کی پابندیوں کی وجہ سے اپنا نام پنجابی قصے 'پورن بھگت' کے ایک کردار 'راجا رسالو' کے نام پر جو 'پورن بھگت' کا چھوٹا بھائی تھا پر رکھ لیا۔ اپنی اس آپ بیتی میں انھوں نے ایسی سادہ اور عام فہم زبان استعمال کی ہے کہ بے اختیار پڑھتے چلے جانے کو جی کرتا ہے۔ انھوں نے دیہاتی زندگی اور معاشرے کے بارے میں نہایت خوش اسلوبی سے بیان کیا ہے۔ اپنی آپ بیتی کا آغاز انھوں نے تقسیم سے پہلے کے حالات سے کیا ہے اور اس زمانے کے سماجی سیاسی اور معاشرتی حالات کو نہایت اچھی طرح سے بیان کیا ہے۔

راجا رسالو نے اپنی آپ بیتی کا اختتام سلطان العارفین حضرت سلطان باہو کے کلام سے کیا ہے۔

ہجر غماں دی رات ڈراؤنی کِیہ کِیہ کردی کارے ہُو
بدلاں اوِلھے پئی لکاوے نِیل گگن دے تارے ہُو
لکھاں نالوں ہولے ہوندے نادم درداں مارے ہُو
تاڑی مار اُڈانہ باہو اسیں آپے اُڈن ہارے ہُو (81)

3۔ یاداں گنجی بار دیاں (ہر کیرت سنگھ، پروفیسر عاشق رحیل)

یہ کتاب ایک آپ بیتی بھی ہے اور پنجاب کے لوگوں پر ہونے والی ظلم کی بہت سی داستانوں میں سے ایک ایسی داستان ہے جس کا ہر لفظ اس بات کی گواہی دے رہا ہے کہ پنجاب اور پنجابیوں نے ہمیشہ سختیاں اور مشکلات سہی ہیں۔ اس میں جذبات بھی ہیں اور احساسات بھی، احساس زیاں بھی ہے اور ماضی کی یادوں میں گم ہو جانے والی خوشیاں بھی ہیں۔ اس کتاب کے لکھاری ڈاکٹر ہر کیرت سنگھ کی آپ بیتی بیسویں صدی کے ابتدائی زمانہ سے شروع ہوتی ہے۔ مصنف نے 'بار' کا مطلب اور اس کے دو پرانے نام بتاتے ہوئے اپنے آبائی علاقے گورداسپور کو چھوڑ کر یہاں گنجی بار میں آباد ہونے سے اس کتاب کا آغاز کیا ہے۔ اس کے بعد یہاں جنگل نما علاقے کو آباد کرنے میں پیش آنے والی مشکلات کا ذکر کیا ہے۔ آگے چل کر انھوں نے یہاں پر ایک نئی بستی چک نمبر 79/15 ایل بسانے سے لے کر آپس میں ایک دوسرے کے ساتھ معاملات، تعلقات، کاروبار، کھیتی باڑی، فصلوں، درختوں، پودوں، لباس، رسوم و رواج، خوشیوں کے مواقع غرض ہر جذبے، ہر موقعے اور زندگی کے ہر رخ کے بارے میں اظہار خیال کیا ہے۔ مصنف نے پرانی یادوں کو لکھتے ہوئے بہت سی باتیں بھول جانے یا صحیح طور پر یاد نہ رہنے کا ذکر تو کیا ہے لیکن بیان کرنے کا انداز اور ترتیب اس قدر عمدہ، سادا اور دلچسپ ہے کہ پڑھنے والا بے اختیار پڑھتا چلا جاتا ہے۔ اس کتاب کے اختتام پر انتہائی دلگیر واقعات اور حقیقتوں کو بیان کرتا ہے۔

اس کے بعد بات تقسیم ہند کے دوران ہونے والے ان واقعات تک پہنچتی ہے جن کو سن اور پڑھ کر برصغیر میں آباد ہر آنکھ آج بھی اشک بار ہو جاتی ہے اور استاد دامن کے شعر اس کی ترجمانی کرتے ہیں۔

جاگن والیاں رَج کے لُٹیا اے	سوئے تسی وی او، سوئے اسی وی آں
لالی اکھیاں دی پئی دس دی اے	روئے تسی وی او، روئے اسی وی آں

یہ داستان پنجابی اخبار 'پنجابی ٹریبیون' میں بھی قسط وار چھپ چکی تھی جس کو عاشق رحیل نے شاہ مکھی رسم الخط میں ڈھال کر پنجابی ادب میں اضافہ تو کیا ہے لیکن دونوں پنجاب کے بچھڑ کر الگ ہو جانے والے پنجابیوں کی سوچوں اور جذبوں کی ایکتا کو نئی زندگی دی ہے۔ 212 صفحات پر مشتمل یہ کتاب 2007 میں چھپی تھی۔

شخصیات

1۔ حضورؐ دی حیاتی (پروفیسر سمیع اللہ قریشی)

اللہ تعالیٰ کے پیارے اور آخری پیغمبر حضرت محمد مصطفیٰ ﷺ کی سیرت بیان کرنے کے لیے صفحات تو جتنے بھی ہوں، ناکافی ہیں لیکن پروفیسر سمیع اللہ نے اس کتاب میں حضور نبی کریم ﷺ کے بچپن سے لے کر حج الوداع کے خطبہ تک کے حالات و واقعات کو نہایت خوبصورتی اور اختصار سے بیان کر کے نبی پاک ﷺ کی زندگی کے حالات سے آگاہی فراہم کی ہے۔اس کتاب میں سیرت پاک کے علاوہ عرب کی تہذیب بھی بیان کی گئی ہے۔انھوں نے نبی کریم ﷺ کی جوانی، شادی، نبوت، دین کی تبلیغ، کافروں کے مظالم، سفر طائف اور واقعہ معراج جیسے واقعات بیان کیے ہیں جس کو پڑھنے سے سیرت پاک کے ساتھ ساتھ اعلان نبوت سے پہلے اور بعد میں پیش آنے والے واقعات کے بارے میں جانکاری ملتی ہے۔ یہ کتاب سیرت پاک کی کتابوں میں ایسا اضافہ ہے جس میں نبی کریم ﷺ کی زندگی کے بارے میں نہایت مفید معلومات ملتی ہیں۔

3۔ قائداعظم دی وار (مسعود منور)

یہ کتاب 1997 میں چھپی تھی۔ پنجابی شاعری کی ایک پرانی صنف 'وار' کو مسعود منور نے اس کتاب میں اپنایا ہے اور اس کے لیے موضوع قائداعظم کی جدوجہد کو بنایا ہے۔پرانی شاعری میں 'وار' کی صنف میں بہادروں اور جنگی کارناموں کو نظمایا جاتا تھا لیکن وقت کے ساتھ اس رجحان میں تبدیلی آئی ہے اور آج کی نسل کے نمائندہ کے طور پر مسعود منور نے 'وار' کے انداز میں بابائے قوم محمد علی جناح کی جدوجہد کو شروع سے آخر تک پیش کیا ہے۔اس کی قدر و قیمت کا اندازہ اس بات سے لگایا جا سکتا ہے کہ سبط الحسن ضیغم جیسے کہنہ مشق مصنف نے اس پر اپنی رائے دی ہے اور مسعود منور کے کام کو سراہتے ہوئے لکھا ہے؛

''بھاویں ایہناں دی عمر دا رشتہ نویں نسل نال جڑیا ہویا اے، پر گل کرن دی اٹکل وچ اوہ پوری طرح سگھڑ تا دا اظہار کردے نیں''۔(82)

4۔ فیروزدین شرف (حیاتی تے فن)(ڈاکٹر دلشاد ٹوانہ)

یہ کتاب دراصل ڈاکٹر دلشاد ٹوانہ کا پی ایچ ڈی کا مقالہ ہے جس کو پاکستان پنجابی ادبی بورڈ نے 2008 میں چھاپا تھا۔ ڈاکٹر صاحبہ نے اس کا انتساب اپنے والدین کے نام کرتے ہوئے ''میرے ولوں'' میں اپنا مقالہ جمع کرانے سے لے کر اس کو کتابی شکل میں چھپوانے تک کے مراحل بیان کیے ہیں۔ دیباچے میں پنجابی زبان کے ادب اور ذریعہ تعلیم کے سلسلے میں کچھ حقائق بیان کرتے ہوئے نئے دور میں ہونے والی پنجابی شاعری کا پس منظر بیان کیا گیا ہے۔ اس کے بعد فیروز دین شرف کے بارے میں ابتدائی معلومات اور اپنے تحقیقی مقالے کے لیے مواد جمع کرنے اور مرتب کرنے کا ذکر کیا ہے۔

اس کتاب کو چھ ابواب میں تقسیم کیا گیا ہے اور ہر باب کے بارے میں چند معلومات دیباچے میں موجود ہیں۔ اس مقالے کا آغاز پنجاب کے سیاسی، معاشرتی اور سماجی حالات بیان کرنے سے کیا گیا ہے۔ اس کے بعد ان حالات اور اس دور میں جنم لینے والی تحریکوں کے زیر اثر فیروز دین شرف کے کردار کو واضح کیا گیا ہے۔ دوسرا باب فیروز دین شرف کی زندگی کے بارے میں ہے۔ تیسرے باب میں ان کے ہم عصر شاعروں کا تذکرہ کیا گیا ہے۔ چوتھا اور پانچواں باب فیروز دین شرف کی کتابوں اور نثر نگاری سے متعلق ہے۔ چھٹے باب میں ان کی شاعری پر بھرپور تبصرہ کیا گیا ہے۔ یہ کتاب 568 صفحات پر مشتمل ہے جس کے ٹائیٹل پر فیروز دین شرف کی تصویر اور بیک پیج پر ڈاکٹر دلشاد ٹوانہ کے متعلق پروین ملک سیکریٹری، پاکستان پنجابی ادبی بورڈ کے چند کلمات درج کیے گئے ہیں۔ یہ مجلد کتاب ہے جس کی کمپوزنگ اور پرنٹنگ بہت اچھی ہے۔

یہ کتاب فیروز دین شرف کی زندگی، حالات اور شاعری کے بارے میں بھرپور معلومات فراہم کرنے کے ساتھ ساتھ اس دور کے سیاسی، سماجی اور معاشرتی حالات کی تصویر کشی کرتی ہے۔ مصنف نے اس دور میں چلنے والی تحریکوں ''سنگھ سبھا لہر''، ''انڈین نیشنل کانگرس''، ''آل انڈیا مسلم لیگ''، ''کسان تحریک''، ''تحریک خلافت''، ''غدر پارٹی''، ''اکالی لہر''، ''سنٹرل پنجابی سبھا''، ''تحریک عدم تشدد''، ''تحریک عدم تعاون''، ''تحریک ہندوستان چھوڑ دو''، ''خاکسار

تحریک''، ''شدھی تحریک'' کے بارے میں کچھ معلومات دی گئی ہیں۔اس کے ساتھ انہوں نے ''سانحہ جلیانوالہ باغ'' اور ''ہوم رولٹ ایکٹ'' کاذکر کیاہے۔اسی باب میں فیروز دین شرف پر ان تحریکوں کا اثر اور ان تحریکوں پر فیروز دین شرف کی شاعری کے اثرات کو نمایاں کیا گیاہے۔

دوسرے باب میں فیروز دین شرف کی زندگی اور حالات کو بیان کیا گیاہے جس میں ان کی پیدائش، باپ کا نام، پیشہ اور ذات کے ساتھ ان کے بہن بھائیوں کے نام، پیشے اور فیروز دین شرف کا شجرہ شامل ہے۔اسی باب میں ان کی عائلی زندگی، ان کے استاد اور شاگرد، ان کے شاعر بیٹے کے ذکر سے لے کر وفات تک کو موضوع بنایا گیاہے۔تیسرے باب میں فیروز دین شرف کے ہم عصر شعرا کا تذکرہ کیا گیاہے جن میں امرتا پریتم، درشن سنگھ آوارہ، بلدیو چندر بیکل، کرتار سنگھ بلگن، جوشوا فضل الدین، حشمت شاہ، استاد دامن، باباعالم سیاہ پوش، سر شہاب الدین، اللہ دتا صابر، صوفی غلام مصطفی تبسم، عشق لہر، ڈاکٹر فقیر محمد فقیر، مولا بخش کشتہ، بابو کرم امرتسری، استاد گاموں خان، پروفیسر موہن سنگھ وغیرہ شامل ہیں۔اس سے اگلے باب میں فیروز دین شرف کی کتابوں کا تذکرہ اور تبصرہ شامل ہے۔فیروز دین شرف کی کتابوں میں ''دُکھاں دے کیرنے'' (1923)، ''سنہری کلیاں'' (1931)، ''شرف نِشانی'' (1934)، ''نُوری دَرشن'' (1934)، ''شَردھا دے پُھل''، ''جوگن'' (1934)، ''شرف ہُلارے''، ''دل دے ٹکڑے''، ''مشترکہ نظمیں، گیت''، ''دِل دیاں ٹِیساں''(1933)، ''شرف دے گیت'' (1944)، ''جدائیاں والیاں راتاں''، ''زلف دے کنڈل''، ''ہجر دی رات''، ''نبیاں دا سردار''، ''حبیب خدا''، ''مدنی ساقی''، ''شرف اُڈاری''، نورانی کرناں'' (1987)، ''پریم ہُلارے''، ''شرف رچناولی'' (پہلا بھاگ)(1983)، ''شرف رچناولی'' (بھاگ دوجا)(1972) چھپ چکی ہیں۔ان کتابوں کا تذکرہ کرتے ہوئے منتخب کلام بھی دیا گیاہے۔اس کے بعد قلمی نسخے کا ذکر کیا گیاہے جس کو محقق و مقالہ نگار نے ''کلیات شرف'' کا نام دیاہے۔اس نسخے کو مذہبی شاعری، اخلاقی شاعری، عشقیہ شاعری اور اردو شاعری کے عنوان سے چار حصوں میں تقسیم کرتے ہوئے یہاں پر بھی منتخب کلام دیا گیاہے۔پانچواں باب فیروز دین شرف کی نثر نگاری سے متعلق ہے جس میں ڈرامہ ''ہِیر سیال''، ''سسی پُنوں''، ''پُورن بھگت'' کاذکر ہے۔اس سے آگے فیروز دین شرف نے فلمی دنیا میں جو کام کیاہے، وہ بیان کیا گیاہے۔فیروز دین شرف نے فلم ''ہیر سیال''، ''چَن وِے'' اور دیگر فلموں کے مقالمے تحریر کیے۔ان میں سے کچھ فلمیں مکمل نہ ہو سکیں۔

چھٹے اور آخری باب میں فیروز دین شرف کی شعری خوبیوں کو بیان کیا گیا ہے۔ اس باب میں شعری خوبیوں کو حوالوں اور مثالوں کے ساتھ واضح کیا گیا ہے اور شعری باریکیوں کو مد نظر رکھتے ہوئے فیروز دین شرف کی شاعری پر بھرپور تنقیدی و تحقیقی نظر ڈالی گئی ہے۔ یہ کتاب پنجابی زبان کے ایک عمدہ شاعر کی زندگی اور شاعری سے پنجابی ادب کے قارئین کو روشناس کرانے کے ساتھ ایک تاریخ کو بیان کرتی ہے۔ ڈاکٹر دلشاد ٹوانہ نے نہایت محنت اور تحقیق سے فیروز دین شرف کی زندگی کے نظروں سے او جھل پہلوؤں کو بھی نمایاں کیا ہے۔

5۔احمد خان کھرل (محمد آصف خاں)

پنجاب کی سر زمین ایسے سپوتوں سے بھری پڑی ہے جنھوں نے اپنے علاقوں پر حملہ آور ہونے اور اس پر قبضہ جمانے والوں کا مردانہ وار مقابلہ کیا۔ آصف خان نے اس بہت چھوٹی کتاب میں پنجاب کے ایک بہادر احمد خان کھرل کے بارے میں ذکر کیا ہے جس نے مادر وطن پر انگریزوں کے غاصبانہ قبضے کے خلاف جدوجہد کی اور ان سے نفرت کا اظہار کیا۔ اس مختصر سی کتاب میں کچھ ڈھولے بھی شامل ہیں اور یہ کتاب 1980 میں چھپی تھی۔

6۔ مسعود کھدر پوش (محمد ظہیر اختر)

مسعود کھدر پوش کا شمار پاکستان پنجابی ادبی بورڈ کے بانیوں میں ہوتا ہے۔ ان کو ماں بولی سے بے حد پیار تھا۔ اس کتاب کے دو حصے ہیں۔ پہلا حصہ پنجابی میں اور دوسرا حصہ اردو میں ہے۔ اس کتاب کے مصنف نے مسعود کھدر پوش کے بارے میں معلومات مہیا کی ہیں اور پہلے حصے میں اقبال قیصر، جمیل احمد پال، محمد شفیع بلوچ، محمد اعظم خان، فخر زمان اور دیگر مصنفین کی آرا شامل ہیں۔ اردو والے حصے میں محمد مسعود، ایم ایچ صوفی، سبط الحسن ضیغم، قاضی جاوید اور دیگر نے مسعود کھدر پوش کے بارے میں اپنی بات کی ہے۔ اس کتاب میں مصنف نے 'پوکھو' کے عنوان کے تحت پانچ صفحات پر اظہار خیال کیا ہے۔ یہ کتاب 1986 میں چھپی تھی۔ محمد آصف خاں نے پہلی گل میں لکھا ہے؛

''مرحوم ایم مسعود کھدر پوش ہوری 30 مئی 1975 توں لے کے 18 دسمبر 1981 تائیں پاکستان پنجابی ادبی بورڈ دے صدر، 14 اگست 1985 تائیں نائب صدر تے 22 دسمبر 1985 تائیں پھیر صدر رہے۔ انج جیوندے دم تائیں اوہ اوس بوٹے دی راکھی کردے رہے جس نوں اوہناں اپنے ہتھیں لایا ہائی''۔(83)

7۔ وڈے بندے (پروفیسر رضیہ مدد علی)

اس کتاب میں مصنف نے دنیا کے آٹھ مشہور دانشوروں کا تعارف پیش کرتے ہوئے ان کی صفات بیان کی ہیں۔ ان معروف دانشوروں میں دنیا کے مختلف علاقوں، قوموں اور زبانوں سے تعلق رکھنے والے دانشور شامل ہیں۔ ان دس معروف لوگوں میں 'بو علی سینا' مسلمان سائنسدان، حکیم، ریاضی دان اور فلسفی ہے جس کا تعلق بخارا سے تھا۔ دوسرا 'تھامس ایڈیسن' ایک معروف امریکی موجد تھا جس نے ایک ہزار کے قریب ایجادات کیں۔ تیسرا 'مصطفی کمال پاشا' جدید ترکی کا بانی ہے۔ چوتھی 'جون آف آرک' فرانس کو انگریزوں کی غلامی سے آزادی کی طرف لے جانے والی لڑکی ہے۔ پانچواں 'ابراہام لنکن' امریکی صدر رہے۔ چھٹی 'فلورنس نائٹ نگیل' اٹلی میں پیدا ہوئی وہ جنگ میں زخمیوں کی دیکھ بھال کرنے وجہ سے مشہور ہوئی۔ ساتویں 'محمد علی جناح' برصغیر کے عظیم قائدین میں سے ایک ہیں اور پاکستان کو معرض وجود میں لانے کے سلسلے میں ان کی خدمات کی وجہ سے ان کو قائد اعظم کا خطاب دیا گیا۔ آٹھواں 'نیوٹن' ایک انگریز سائنسدان، ریاضی دان اور فلسفی ہے جو اپنے 'حرکت' کے قوانین کے سبب مشہور ہے۔ یہ کتاب 1986 میں شائع ہوئی تھی۔ اس چھوٹی کتاب سے بہت بڑے دانشوروں، سائنسدانوں، ریاضی دانوں، حکیموں، کیمیادانوں، موجدوں، ملکوں کے بانیوں اور ماہر طبیعات کے بارے میں بہت مفید معلومات ملتی ہیں۔ یقینی طور پر کتاب کے عنوان کے مطابق یہ لوگ ''وڈے بندے'' ہی تھے۔

8۔ڈاکٹر نذیر احمد (راجار سالو)

راجار سالو نے اس کتاب میں گیارہ عنوانات کے نیچے ڈاکٹر نذیر احمد کے بارے میں مختلف مصنفین کے خیالات کو شامل کیا ہے۔ڈاکٹر نذیر احمد گورنمنٹ کالج لاہور میں پروفیسر تھے۔انھوں نے پنجابی کے کلاسیکی شاعروں کے بارے میں جو کام کیا اس کو پنجابی ادب پڑھنے والوں نے بہت سراہا ہے۔ پاکستان پنجابی ادبی بورڈ نے اسی وجہ سے ان کے بارے میں 1987 میں یہ کتاب چھاپی تھی۔اس کتاب کے دو حصے ہیں،ایک حصہ پنجابی اور دوسرا اردو میں ہے۔اس کتاب میں 'پہلی گل' میں راجار سالو نے اپنی بات کی ہے۔ شفقت تنویر مرزا، پروفیسر مشکور حسین، پروفیسر صابر لودھی، بانو قدسیہ، محمد حنیف رامے، ڈاکٹر محمد اجمل، سید بابر علی کے خیالات اور تاثرات بھی ان کے بارے میں شامل ہیں۔ محمد آصف خاں سیکرٹری پاکستان پنجابی ادبی بورڈ نے لکھا؛

> ''ڈاکٹر ہوری چھیکڑی عمرے پنجابی نال جڑے سن۔ اینے تھوڑے چر وچ اوہناں اپنے پچھے اجیہے یادگیری کم چھڈے ہن کہ کئی لکھیار پنجابی نال ورھیاں بدھی جڑے رہن مگروں وی نہیں کر سکے''۔ (84)

9۔ ڈاکٹر فقیر محمد فقیر (جنید اکرم)

بابائے پنجابی ڈاکٹر فقیر محمد فقیر پر یہ کتاب پاکستان پنجابی ادبی بورڈ نے 1992 میں چھاپی تھی۔ بیسویں صدی میں پنجابی زبان کے فروغ کے لیے اور پنجابی ادب کی ترویج کی خاطر محنت کرنے والوں میں سب سے معتبر، اہم اور اوّلین نام بابائے پنجابی ڈاکٹر فقیر محمد فقیر ہی کا ہے۔آپ ہمہ جہت ادبی شخصیت کے مالک تھے۔ قدرت نے اُنھیں بے شمار گنوں سے نوازا تھا۔ڈاکٹر فقیر مرحوم نے شاعری کی تقریباً تمام اصناف میں طبع آزمائی کی۔ پنجابی زبان کی قدیم کلاسیکی روایات کو برقرار رکھتے ہوئے انھوں نے 'وارثی بحر' میں 'ہیر' لکھنے کا تجربہ کیا۔ ڈاکٹر فقیر محمد فقیر ایک نامور محقق اور مصنف تھے اور انھوں

نے آزادی کے بعد پنجابی زبان کے لیے بہت کام کیا۔ جنید اکرم نے اس کتاب میں ان کے بارے میں مرزا ادیب، ڈاکٹر اسلم رانا، پروفیسر شریف کنجاہی کے مضامین شامل کیے ہیں۔ محمد آصف خاں نے اس کتاب میں 'پہلی گل' میں لکھا ہے:

''میری جاچے ڈاکٹر ہوراں دی وڈی دین اوہ متا ہے، جیہدے وچ اوہناں منگ کیتی کہ سکولاں کالجاں وچ پڑھاؤن دا آہر کیتا ونجے۔ اج پنجابی زبان سکولاں، کالجاں تے پنجاب یونیورسٹی وچ پڑھائی جا رہی اے۔ ایہہ ڈاکٹر ہوراں دے ای اُدم دا سٹا ہے۔ اسانوں اپنے اجیہے محسن نوں ہر ویلے چیتے رکھنا چاہیدا اے۔ انج میں سمجھدا ہاں کہ اوہناں دی روح نوں جنت وچ اودوں ودھیرا سکھ چین ملے گا جدوں مڈھلیاں جماعتاں وچ پنجابی راہیں تعلیم دتی جاوے گی۔ اتے اوہ دن دور وی نہیں''۔(85)

10۔ مہاندرے (پروفیسر غلام حسین ساجد)

پروفیسر غلام حسین ساجد نے اپنی کتاب میں پنجابی کے چند لکھاریوں کے خاکے اس انداز میں پیش کیے ہیں کہ ان ہستیوں کی زندگی اور ان کی ادبی زندگی کے گوشے نمایاں ہو جاتے ہیں۔ انھوں نے مندرجہ ذیل عنوانوں کے ذریعے لکھاریوں کے خاکے تحریر کیے ہیں۔

1۔ عجیب مستانہ	مستان علی	2۔ چکڑالے دا شینہہ	نور خاں شاہین ملک
3۔ پیر جلالی	سید علی عباس جلالپوری	4۔ فٹ پاتھیا	نجم حسین سید
5۔ پتر پنج دریاواں دا	محمد آصف خاں	6۔ ست رنگا درویش	طاہر تونسوی
7۔ ساندل بار دا جن	مرزا حامد بیگ	8۔ یار بروچل	ناصر بلوچ
9۔ تل وطنی	عابد عمیق	10۔ جہدی	شوکت مغل
11۔ مداری	عامر فہیم		

11۔جانباز جتوئی(ظفر لاشاری)

جانباز جتوئی پنجابی کے سرائیکی لہجے میں شاعری کرنے والے معروف شاعروں میں شامل ہیں۔ ظفر لاشاری نے اس کتاب میں ان کے حالات زندگی اور شاعری کے بارے میں معلومات دی ہیں۔اس کتاب میں انہوں نے جانباز جتوئی کے بارے میں چھبیس دانشوروں کی طرف سے دی جانے والی آرا بھی شامل کی ہیں۔اس کتاب میں چوبیس مضامین دیے گئے ہیں۔ محمد آصف خاں نے کتاب میں پہلی گل کے عنوان کے نیچے دو صفحات تحریر کیے ہیں۔

لوک ادب

1۔لوک گیت (تنویر بخاری)

تنویر بخاری ایک معروف مصنف ہیں اور پنجابی زبان کے ادب کو قارئین تک پہنچانے کے سلسلے میں ان کی بہت خدمات ہیں۔ پنجابی لوک گیت ہر دور میں مقبول رہے ہیں کیونکہ ان میں سچے جذبوں کو سمویا جاتا ہے۔ان گیتوں کی مختلف اصناف کی تعداد اتنی زیادہ ہے کہ بہت سے مصنفین نے ان کے بارے میں اپنی اپنی کتابوں میں معلومات دی ہیں۔ اس کتاب میں تنویر بخاری نے لوک گیتوں کی کچھ اقسام مثلاً گوری، تھال، چھلا، جگنی،ڈھولا،ماہیا، گِدھا اور بولیاں وغیرہ کا تذکرہ کرنے کے ساتھ ساتھ شادی کی مختلف رسومات مائیوں، گھڑولی، کھارے کے موقع پر گائے جانے والے گیتوں کی اقسام کا ذکر کیا ہے۔ یہ کتاب 1980 میں چھپی تھی اور اس کتاب کے ذریعے سے ہمیں پنجابی کی ثقافت میں موجود بہت سی رسوم اور ان کی اہمیت کو واضح کرنے میں مدد ملتی ہے۔

2۔اللہ والی کلڑا (مسز ستنام محمود)

اس کتاب کی مصنفہ نے خواتین کے پسندیدہ موضوع شادی بیاہ اور ماؤں بہنوں کے دلی جذبات واحساسات کا اظہار کرنے والے لوک گیتوں اور ان کی مختلف اقسام کو موضوع بنایا ہے۔اس کتاب میں لوریاں، کلیاں، گھوڑیاں، سہاگ کے گیت، سٹھنیاں، بارات روکنے، بارات جانے، دوپٹے کا لاگ، کھٹ، ڈولی وغیرہ جیسی شادی کی رسومات کے موقع کی مناسبت سے کی جانے والی پنجابی شاعری کو بیان کیا ہے۔ان گیتوں کے ذریعے بہن کا بھائیوں سے پیار اور ماں کی محبت کے جذبات کا اظہار جس گہرائی اور مٹھاس سے کیا جاتا ہے دنیا بھر میں بولی جانے والی تمام زبانیں اس سے محروم ہیں۔ یہ کتاب 1980 میں چھپی تھی۔

3۔لوک گاون(پروفیسر باغ حسین کمال)

کسی بھی زبان میں سب سے پہلے پیدا ہونے والا ادب لوک ادب کہلاتا ہے اور جس زبان میں لوک ادب پیدا ہونا شروع ہوتا ہے، وہ زبان ترقی کی منزلیں طے کرنا بھی شروع کر دیتی ہے۔ لوک ادب کے ذریعے مختلف زبانوں اور تہذیبوں یا ثقافتوں سے شناسائی ہوتی ہے لیکن اس کے مصنف یا شاعر نامعلوم ہوتے ہیں اور یوں یہ اس زبان ہی نہیں بلکہ پوری انسانیت کا سانجھا ورثہ ہوتا ہے۔پنجابی زبان میں لوک ادب نظم اور گیتوں کی صورت موجود ہے۔لوک گیت کسی بھی معاشرے کی ثقافتی سرگرمیوں کے ساتھ ساتھ ان کے روزمرہ کے معاملات کو اس طرح سے بیان کرتے ہیں کہ ایک تصویر نمایاں ہو جاتی ہے۔لوک گیتوں میں رہن سہن، کھیلوں، مشغلوں، خواہشوں، امیدوں، سوچوں اور جذبوں کے ساتھ ساتھ کارناموں کو بھی بیان کیا جاتا ہے۔1980 میں 31 صفحات پر مشتمل اس کتاب کے ذریعے ہمیں اپنے لوک ورثے کے بارے میں اچھی خاصی معلومات مل جاتی ہیں۔پروفیسر باغ حسین کمال نے اس کتاب میں ماہیے، چھولا، سمی، سہرے، بارات اور رخصتی کے وقت گائے جانے والے گیت جمع کیے ہیں۔ اس لیے اس کتاب کو پنجابی لوک ادب کو عوام میں متعارف کرانے کا ذریعہ قرار دیا جاسکتا ہے۔

4۔شُغل(شفقت تنویر مرزا)

شفقت تنویر مرزا نے اس کتاب کے نام سے ظاہر ہونے معنی اور مطلب کے مطابق مختلف انداز اپناتے ہوئے پنجاب کی تہذیب میں موجود چند مشاغل کے بارے ہمارے لوک گیتوں میں کیے جانے والے تذکرے کے بارے میں بتایا ہے۔جس طرح سے شاہ حسین نے ساری زندگی کو کھیل تماشے سے تشبیہ دی ہے۔لڑکیوں کے لیے گڑیاں گڈے کا کھیل ایک مشغلے کی حیثیت رکھتا ہے۔ تھال، گیٹیڑا، گدھا، پنج گیٹیا، رسی پھلانگنا، ککلی اور مختلف علاقائی ناچ بھی مشغلوں میں شمار ہوتے ہیں۔اس کے علاوہ علاقائی روایات کے مطابق گھروں وغیرہ کا سجانا، دیواروں پر نقش و نگار بنانا، تصویریں، ٹکٹ اور سکے جمع کرنا بھی مشغلوں میں شامل ہیں۔اس کتاب میں مصنف نے پنجاب کے دیہی علاقوں میں کھیلی جانے والی تمام کھیلوں اور ناچوں کو شغل کے زمرے میں شمار کیا ہے۔ان کے مطابق جس چیز سے بندے کو خوشی حاصل ہو، وہ شغل یا مشغلہ ہے۔

مشغلے اور بھی بہت سے ہو سکتے ہیں جو نہ صرف انسان کو مصروف رکھنے کا ذریعہ بنتے ہیں بلکہ ان سے اس کو خوشی بھی حاصل ہوتی ہے۔ یہ کتاب 1980 میں شائع ہوئی تھی۔

5۔ تِکھیاں سُولاں (استاد اللہ دتہ صابر)

استاد اللہ دتہ صابر کی یہ کتاب پاکستان پنجابی ادبی بورڈ نے 1981 میں چھاپی تھی۔ پنجابی مشاعروں کی وجہ سے پنجابی شاعری میں استاد اللہ دتہ صابر جیسا شاعر میسر آیا جن کے نقش قدم پر چلنے والوں میں استاد ہمدم، فیروز دین شرف، استاد دامن اور مولا بخش کشتہ وغیرہ شامل ہیں۔ ان کے شعری کلام میں بلھے شاہ دے حضور، وارث شاہ دے ناں، غزل، چوبرگہ، جھنڈا، کافی، گیت، اک سوال، جنگ، میرا پنجاب، شاعر نال گل، لڑکے دی موت، چومصرعے کے عنوانات کے تحت شاعری اور دیگر مضامین ملتے ہیں۔ سبط الحسن ضیغم اس دور میں پاکستان پنجابی ادبی بورڈ کے سیکریٹری تھے۔ سبط الحسن ضیغم نے 'پہلی گل' کے تحت لکھا ہے؛

> ''استاد صابر دی شاعری دا پیٹرن پرانا ہے۔ بیت اتے دوبیتی، ردیف، قافیہ، شاعری، غزل وغیرہ وچ ایہناں سَچیاں وچوں اوہناں نویں توں نویں سوچ نوں اُلیکیا تے اک اجوکے سرجن پاروں پاکستان پنجابی ادبی بورڈ اوہناں دی ہر لیکھ چھاپن دامان حاصل کر رہیا اے''۔ (86)

6۔ کال بلیندی (اے ڈی اعجاز)

اے ڈی اعجاز نے اس کتاب میں ساہیوال اور اس کے ارد گرد کے علاقے کو موضوع بناتے ہوئے پندرہ موضوعات کے تحت معلومات فراہم کی ہیں۔ اس علاقے میں لڑی جانے والی رائے احمد خان اور برکلے کی لڑائی ایک اہم اور مشہور واقعہ ہے۔ اس کتاب میں 'کال' اور 'نارد'، جنگ آزادی، مجاہدوں، انگریز کا ساتھ دینے والوں ہندو اور سکھوں کے بارے میں معلومات دی ہیں۔ اس کتاب میں اڑتالیس ڈھولے بھی شامل کیے گئے ہیں۔ اس علاقے کے بڑے بوڑھے ان

واقعات کو جانتے ہیں اور اپنی اگلی نسل کو سینہ بہ سینہ منتقل کرتے رہے ہیں جن کو مصنف نے کتابی شکل میں محفوظ کر لیا ہے۔ کتاب کے آخر میں مشکل الفاظ کے معنی بھی دیے گئے ہیں۔

پاکستان پنجابی ادبی بورڈ نے یہ کتاب 1983 میں چھاپی تھی اور آصف خان نے اس کے بارے میں 'پہلی گل' کے عنوان کے تحت لکھا ہے؛

''جس محنت، لگن تے جذبے نال اے ڈی اعجاز ہوراں 1857 دی جنگ آزادی بارے کھوج کیتی اے اتے پنڈاں دے پنڈ کچھ کے لوک روایتاں تے ڈھولے اکٹھے کیتے ہن، ایہہ منناپوسی کہ اوہناں پنجاب دے وسنیکاں اُتے وڈا احسان کیتا ہے''۔ (87)

7۔ کنیں بُندے (پروفیسر شارب)

پنجابی لوک شاعری میں ڈھولا ایک ایسی صنف ہے جس میں تقریباً ہر طرح کے مضامین سما جاتے ہیں اور بے شمار شاعروں نے اس صنف میں اپنی اپنی بات کی ہے۔ پروفیسر شارب نے اس کتاب میں 'ڈھولا کیہ ہے' کے مضمون میں ڈھولا، اس کا مطلب، ڈھولے کی عمر، ہیت، اقسام اور فنی جائزہ بیان کیا ہے۔ 'پہلی گل' میں محمد آصف خاں نے لکھا ہے؛

''ہتھلی کتاب دا دیباچہ وی اوہناں دی وڈی سوجھ سیانپ دا ثبوت ہے۔ ایس لوک شاعری (ڈھولے) بارے ساری دی ساری لوڑیندی جان کاری اوہناں دتی ہے۔ انج ایس صنف بارے اج تائیں جو بھلیکھے ٹرے آؤندے ہاین، اوہ گھنوئی کر کے ٹک ویسن''۔ (88)

اس کتاب کے تیسرے عنوان 'جھتیاں بُندیاں دے ڈھولے' میں اکیاسی ڈھولے ہیں، 'قصہ شمس رانی' میں اٹھائیس اور 'کال دے ڈھولے' میں پانچ ڈھولے شامل ہیں۔ انھوں نے یہ ڈھولے بہت سی جگہوں پر جا جا کر اور مختلف راویوں سے اکٹھے کیے ہیں جن کے نام مختلف صفحات پر دیے گئے ہیں۔ 'قصہ شمس رانی' کے عنوان میں 'بٹنی خان' نامی حاکم کی داستان بیان کی گئی ہے۔ 'کال دے ڈھولے' میں بر کلی دے ڈھولے، میاں متلی دا ڈھولا، ستو تے ہاشماں، احمد تے احمدی کے پانچ ڈھولے دیے گئے ہیں۔ یہ کتاب 1984 میں چھپی تھی۔

8۔ بار دے گیت (مشتاق صوفی)

مشتاق صوفی کی یہ کتاب پاکستان پنجابی ادبی بورڈ نے 1984 میں چھاپی تھی۔ اس کتاب میں مشتاق صوفی نے پنجاب کے شعری لوک ادب کو اکٹھا کرتے ہوئے انہتر گیت شامل کیے ہیں۔ مشتاق صوفی نے یہ گیت 'ساندل بار' جس میں جھنگ کا علاقہ آتا ہے، وہاں سے اکٹھے کیے ہیں۔ یہ گیت پنجاب کے معاشرے میں موجود جذبات، احساسات، رسومات اور دیگر معاملات کے بارے میں ہیں۔ انھوں نے کجھ لوک گیتوں کے بارے میں لکھا ہے؛

''کیوں جو لوک گیت لوکائی دی سانجھی حیاتی دا جھلکارا ہوندے نیں۔ سو اوہناں نوں رڈّن دا مطلب لوکائی دی ورتی واپری نوں رڈّن دے برابر اے''۔ (89)

''پر کوئی گیت لوک گیت تاں ای بن سکدا اے جے کر اس وچ لوکائی دی سانجھی حیاتی ہوئے، دکھ سکھ دا کوئی نہ کوئی انگ موجود ہوئے۔ فرد دی نری آپ بیتی دا اظہار کافی نہیں''۔ (90)

''ایہہ سارے گیت ساندل بار (جھنگ وغیرہ) وچوں کٹھے کیتے گئے ہن۔ پر ایہہ پنجاب دیاں دوجیاں علاقیاں وچ وی گائے تے مانے جاندے نیں۔ کجھ گیت تاں مشہور نیں باقی ہولی ہولی مشہور ہوندے پئے نیں''۔ (91)

9۔ بار دے ڈھولے (پروفیسر شارب)

پنجابی لوک شاعری میں ڈھولے انتہائی مقبول صنف رہی ہے اور تقریباً تمام بڑے شاعروں نے اس پر طبع آزمائی کی ہے لیکن بہت سے ڈھولے زبان زدعام تو ہیں لیکن ان کو مختلف شاعروں سے منسوب کیا جاتا ہے۔ انھوں نے 'ویروا' کے عنوان میں لکھا ہے؛

''ایہہ ڈھولے میں وکھو وکھ راویاں کولوں سنے ہن۔ بوہتے ڈھولیاں دا راوی جعفر حسین، چک موچیوالہ دا ہے۔ ڈھولے بعض تے لوک ڈھولے ہن یا اوہناں دے لکھاری دا اتہ پتا نہیں''۔ (92)

پروفیسر شارب نے مختلف معلوم اور نامعلوم شاعروں کے ڈھولے اس کتاب میں جمع کر کے پنجابی شعری ادب میں خاطر خواہ اضافہ کیا ہے۔

10۔ رکھتاں ہرے بھرے (ڈاکٹر سیف الرحمن ڈار)

اس کتاب میں ڈاکٹر سیف الرحمٰن ڈار نے لوک کہانیوں کو اکٹھا کیا ہے جس کو پاکستان پنجابی ادبی بورڈ نے 1985 میں چھاپا تھا۔ لوک کہانیوں کو ایک کتاب میں اکٹھا کرنا کوئی آسان کام نہیں ہے کیونکہ کہانیاں اکٹھی کرنے کے سلسلے میں یقیناً بہت سی جگہوں پر جا کر رنگ رنگ کے لوگوں سے ملنا اور سارا مواد اکٹھا کرنا ایک انتہائی مشکل کام تھا جس کو انھوں نے ماں بولی کے پیار میں انجام دیا ہے۔ اس کتاب میں کچھ معروف داستانیں مثلاً ہیر رانجھا، سوہنی مہینوال، سسی پنوں، مرزا صاحباں، بالو ماہیا، جگا، پورن بھگت کے ساتھ غیر معروف داستانیں بھی موجود ہیں۔ اس کے علاوہ ٹپے، ماہیے، ڈھولے، بولیاں، باتاں، بجھارتاں اور اکھان بھی دیے گئے ہیں۔ بجھارتیں اور اکھان الف بائی ترتیب سے دیے گئے ہیں۔ مہاندرا کے عنوان میں انھوں نے لکھا ہے؛

''ایہدے اندر ساڈیاں لوک کہانیاں داذکر اے، میلیاں وچ گاون والے ڈھولے، ٹپے تے بولیاں

نیں''۔ (93)

11۔جتھے پپلاں دی ٹھنڈی چھاں(ڈاکٹر سیف الرحمن ڈار)

ڈاکٹر سیف الرحمٰن ڈار کی یہ کتاب بھی لوک ادب کے سلسلے کی ایک کتاب ہے۔ پاکستان پنجابی ادبی بورڈ نے اس کتاب کو 1985 میں چھاپا تھا۔ اس کتاب میں ڈاکٹر سیف الرحمٰن ڈار نے ماں بولی سے اپنی محبت کا حق ادا کرنے کی کامیاب کوشش کی ہے۔

''پنجابی زبان نال میری محبت تے لوک گیتاں نال میرا لگاؤ مینوں اپنے والدین کولوں ورثے وچ ملیا

اے۔ خاص طور تے اک عرصہ تک میرے والد مکرم ایم غلام محمد ڈار صاحب میرے ایس کم وچ عملی

طور تے شریک رہے نیں''۔ (94)

سیف الرحمٰن ڈار نے اس کتاب کو سات ابواب 'کھیڈن دے دن چار نی جندے'، 'چار دناں دی سانجھ سہیلیاں دی'، 'چاء لاہ لیئے گدھے جھمراں دے'، 'کتک کو نجاں پیکے دھیاں'، 'پھلاں باجھ نہ سوہندیاں ٹاہناں'، 'ایس اک اولاد دی سک بدلے' میں تقسیم کیا ہے اور اس کو مزید عنوانات کے تحت بیان کیا ہے۔ انھوں نے 'اسانوں کون خیالے' کے عنوان میں تحریر کیا ہے؛

''پنجابی لوک گیت زیادہ تر عورتاں دی زبان وچ نیں۔ ایہہ انمول خزانے عورتاں دے ای دماغاں وچ

محفوظ نیں۔ ایہناں گیتاں دے ناں نال اوہناں دیاں بچپن دیاں شرارتاں، جوانی دیاں کہانیاں تے

بڑھاپے دیاں محرومیاں وی چھپیاں ہوندیاں نیں۔ ایہناں وچ اوہناں دے پیار دیاں ناکامیاں تے

وچھوڑے دیاں نا بھل سکن والیاں گھڑیاں، کسے نال بے پناہ محبت تے کسے ہور نال ان مک نفرت ملدی

اے"۔ (95)

لوک گیتوں میں مذہبی تقسیم اور ثقافتی فرق کے بارے میں بات کرتے ہوئے انھوں نے لکھا ہے؛

"پر جتھوں تیک لوک گیتاں دا تعلق اے اوہ سبھناں لئی سانجھے سن۔ ایہناں گیتاں دیاں کئی قسماں نیں

پر ایک وی قسم اجیہی نہیں جیہڑی کسے خاص مذہب یا فرقے دے منن والیاں واسطے مخصوص ہوئے یا

کسی دوجے مذہب دے خلاف اے۔ اگرچہ مسلماناں، ہندواں تے سکھاں دے ویاہواں وچ کافی فرق

سن پر ایہناں موقعیاں تے گون والے گیت اکو جیہے ہوندے سن۔ گھوڑیاں، سہاگ، گیت، ڈولیاں،

کامن، سٹھنیاں وغیرہ سبھے سانجھے سن"۔ (96)

یہ کتاب ان لوک گیتوں کا مجموعہ ہے جن کو چھوٹے بچے بچیاں، جوان لڑکے لڑکیاں اور مائیں بہنیں اپنے صحنوں، ڈیوڑھیوں، کھلے چھتوں یا پیپل اور بوڑھ کے درخت کے نیچے دن یارات کو مل بیٹھ کر گاتے ہیں۔

12۔ پنجاب دے لجپال پتر (اقبال اسد)

برصغیر پاک وہند کا علاقہ ہمیشہ حملہ آوروں اور لٹیروں کی آماجگاہ بنا رہا ہے۔ اس سونے کی چڑیا کو دنیا بھر سے اٹھ کر آنے والوں نے لوٹنے کی کوششیں ہمیشہ جاری رکھی ہیں لیکن اس دھرتی کے بہادر سپوتوں نے ہر بار ان کا نہ صرف ڈٹ کر مقابلہ کیا بلکہ ان میں سے اکثر کو نکال باہر کیا۔ پھر ایسا بھی ہوا کہ فرنگی کاروبار کا دھوکہ دے کر آئے اور یہاں کے حاکم بن بیٹھے۔ انھوں نے اپنے قدم جمانے کے لیے لڑاؤ اور راج کرو کی پالیسی کے تحت اپنا مقصد حاصل کیا۔ ایسے میں پنجاب کے

بہت سے سپوت تھے جنھوں نے فرنگیوں سے آزادی اور اپنے ملک کی سلامتی کے لیے بہادری کی ایسی داستانیں رقم کیں جن کو پڑھ کر آج بھی خون جوش مارتا ہے۔

اقبال اسد نے جہاں اپنی کتاب کا نام 'پنجاب دے لجپال پتر' رکھ کر ان بہادر سپوتوں کو خراج عقیدت پیش کیا ہے، وہیں ان بہادروں کے نام اور کارناموں کو تیرہ مضمونوں کی شکل میں ایک کتاب میں اکٹھا کر کے آنے والی نسلوں کے لیے آج کے دور میں سکولوں میں پڑھائی جانے والی تاریخ سے ہٹ کر ایسی تاریخ بیان کی ہے جس کے ذریعے وطن سے حقیقی محبت کرنے والوں کے بارے میں آگاہی اور وطن کے لیے قربانی دینے کا سبق بھی ملتا ہے۔ ان بہادروں کے قصوں اور کارناموں کو مختلف شاعروں نے واروں اور ڈھولوں کی شکل میں بیان کیا ہے۔ پاکستان پنجابی ادبی بورڈ نے یہ کتاب 1986 میں چھاپی تھی۔ آصف خان نے 'پہلی گل' میں لکھا ہے؛

> ''پنجاب دے جماندرو شاعر کدے اویسلے نہیں رہے۔ اوہ دھاوڑیاں دے ہلیاں دی کہانی نوں نال دے نال واراں دے ڈھولیاں وچ سانبھی آئے ہن۔ پنجابیاں دے دیس پیار دی کہانی رگ وید توں لا بر کلی دے ڈھولے تیک اِک اُمک لڑی وچ پُر جی لبھدی اے''۔ (97)

اس کتاب میں ملنگی، جگا، احمد خان کھرل، بابا گوردت سنگھ، کرتار سنگھ سوبھا، مراد، سارنگ کی بہادری کے واقعات کے علاوہ ان کے بارے میں کچھ گیت بھی موجود ہیں۔

13۔ٹانگے جھنگ جاندے (پروفیسر شارب)

1987 میں چھپنے والی کتاب میں پروفیسر شارب نے 'کجھ ماہیے بارے' کے عنوان میں لوک شاعری کی ایک مقبول صنف 'ماہیے' کے بارے میں بہت تفصیل سے بتایا ہے۔ انھوں نے اس کتاب میں مغربی پنجاب میں میں لکھے گئے ماہیے شامل کیے ہیں۔ ان کے عنوانات میں زیور، باغ، کھیت، سبزیاں، عید، کھانا، پانی، کھیتی باڑی، خوشبوؤں، دھاتوں،

فصلوں، پالتو جانوروں، پرندوں، پھلوں، پھولوں، کھیلوں جیسے چالیس کے قریب موضوعات شامل ہیں۔ محمد آصف خاں نے لکھا ہے؛

''پروفیسر شارب ہوراں دا ناں پنجابی دے سر کڈھویں شاعراں وچ گنِیا مِتھیا وِیندا اے تے اوہناں دی شاعری دا مجموعہ بال ہڈاں دی اگ دے ناں ہیٹھ چھپ چکیا اے۔ اوہناں جس اُدم، جس لگن تے جس محنت نال لہندا کچھ کے ماہیے اکٹھے کیتے سن، اوس نوں جِناوی سلاہیا جاوے اوہ گھٹ اے''۔ (98)

14۔ لہندی شعر ریت (پروفیسر شاہین ملک)

پروفیسر شاہین ملک نے پنجابی زبان کی لوک شاعری کی مختلف لوک داستانوں 'مرزا صاحباں'، 'رانجھن بارے لوک گیت'، 'پیلو اور کراڑی'، 'قصہ حسن تے کراڑی' کے ساتھ لوک شاعری کی مختلف اصناف مثلاً ماہیے، ڈھولے، دوہڑے، چھلا، شادی بیاہ کے گیت اور چھوٹی چھوٹی واریں، پوڑی وغیرہ شامل کی ہیں۔ انہوں نے اس کتاب میں بہت سے مقامی شعرا کے کلام کو شامل کرنے کے علاوہ مولانا اللہ یار خان، مولوی غلام نبی (عبداللہ چکڑالوی)، گامے شاہ، قاضی قمر الدین کے بارے میں معلومات اکٹھی کی ہیں۔ یہ کتاب 1987 میں چھپی تھی اور اس کتاب کو شاہین ملک نے اپنے جوانسال مرحوم بیٹے امجد شاہین کے نام کیا ہے۔

15۔ گنجی بار دے ڈھولے (اقبال اسد)

گو لوک گیت کسی زبان میں تخلیق پانے والے ادب کی ابتدائی شکل ہوتی ہے جس کے بعد اس زبان میں باقاعدہ ادب جنم لینا شروع ہو جائے تو اس زبان کو ترقی یافتہ زبانوں کی صف میں شامل کیا جا سکتا ہے۔ خوش قسمتی سے پنجابی زبان میں تخلیق پانے والا لوک ادب دیگر ترقی یافتہ اصناف کے ہوتے ہوئے بھی اپنا مقام رکھتا ہے۔ وقت گزرنے کے ساتھ

ساتھ اس کی افادیت اور مقبولیت میں اضافہ ہی ہوا ہے۔ اقبال اسد نے اسی طرح کے لوک ورثے کو اکٹھا کر کے پنجابی ادب میں خاطر خواہ اضافہ کیا ہے۔ انھوں نے نہایت محنت اور لگن سے ماں بولی میں تخلیق کیے گئے لوک ادب کے لیے مشقت کر کے اس کو اکٹھا کیا جس سے ہمارے لوک ادب میں موجود نظام لوہار، جبر و نائی اور ملنگی جیسے کرداروں اور ان کی کہانیوں کو محفوظ کیا ہے۔ اس کتاب میں نعتیں، نظام لوہار تے جبر و نائی اور مہر دین کا ملنگی کے بارے میں گیت بھی موجود ہے۔ یہ کتاب پاکستان پنجابی ادبی بورڈ نے 1989 میں چھاپی تھی۔

16۔ آپنا گراں ہووے (ڈاکٹر ارشد محمود ناشاد)

پاکستان پنجابی ادبی بورڈ نے دیدہ زیب ٹائٹل، عمدہ بائنڈنگ اور خوبصورت پرنٹنگ کے ساتھ ضلع اٹک کے لوک ادب پر مشتمل ڈاکٹر ارشد محمود کی کتاب ''آپنا گراں ہووے'' 2009 میں چھاپی تھی۔ یہ کتاب دیکھنے میں جتنی خوبصورت لگتی ہے، اپنے اندر اس سے کہیں زیادہ خوبصورتی کو سمیٹے ہوئے ہے۔ لوک ادب ہر زبان میں مقبولیت کا درجہ حاصل کر لیتا ہے کیونکہ اس میں پیش کردہ احساسات اور جذبات اس معاشرے کی تہذیب و ثقافت کی صحیح عکاسی کرتے ہیں۔ پنجاب کے تمام اضلاع اپنی اپنی منفرد تاریخ اور ثقافتی اقدار کے حامل ہیں۔ ان میں بہت سی قدریں مشترک حیثیت کی حامل ہونے کے باوجود کسی نہ کسی رخ سے انفرادیت کی بھی حامل ہیں۔ ضلع اٹک کی ایسی ہی انفرادیت کو ڈاکٹر ارشد محمود ناشاد نے اس کتاب کے ذریعے پیش کیا ہے۔

اس کتاب میں ضلع اٹک کے لوک ادب سے 'اکھان'، 'ماہیے'، 'بجھارتاں'، 'بالاں دے گیت'، 'لوک گیت'، 'محاورے'، 'طب'، 'عقیدے' اور کہانیاں شامل ہیں۔ پروین ملک، سیکریٹری پاکستان پنجابی ادبی بورڈ نے 'کھبل' کے عنوان سے لکھا ہے؛

''اٹک دی دھرتی نے ون سونیاں تہذیباں دا منہ ویکھیا اے، ایہناں وچوں اک ادھ نوں چھڈ کے

ساریاں دھاڑویاں دے نال آئیاں دھاڑوی جنہاں ایس دھرتی تے اوہدے وسیب نوں آپنے گھوڑیاں

دیاں سماں تھلے مدھول کے آپنے ولوں مکادتا پر میں آکھیا نالوک ادب کھبل ہوندا اے آپنی دھرتی دے

نال جڑ کے کھلرن تے پنگرن آلا۔

''آپنا گراں ہووے'' وچ تہانوں پہاڑاں، دریاواں تے گاڑاں اتے پسری حیاتی دے ساریاں رنگاں

دی جھلک نظری آندی اے''۔ (99)

''مکھ بند'' میں ڈاکٹر ارشد محمود ناشاد نے لوک ادب کے بارے میں لکھا ہے؛

''ایہہ آپ مہارے ای پیدا نہیں ہو جاندا سگوں ایہنوں گھڑن تے پالن پوسن والے اوہ بندے

ہوندے نیں جیہناں دا اپنے علاقے تے اپنے وسیب نال گوہڑا سمبندھ ہوندا اے''۔ (100)

''لوک ادب اپنے علاقے دے تہذیبی آثار، ذہنی معیار تے جغرافیائی ماحول دا عکاس ہوندا اے۔

ایس سارے ورثے نوں اگلیاں نسلاں وچ منتقل کرنا لوک ادب دا سبھ توں وڈا مقصد ہوندا اے۔

نالے لوک ادب زباناں دیاں ارتقائی صورتاں دا محافظ تے اوہدے کھلار وچ معاون وی ہوندا

اے''۔ (101)

''ضلع اٹک دا لوک ادب اکٹھا کرن واسطے میں اڈو اڈ تھانواں، شہراں، پنڈاں تے گرانواں دے

پھیرے لائے۔ اوتھے دے بالاں، بڈھیاں عورتاں، سانگیاں، میراثیاں تے آجڑیاں کولوں ایہہ

لوک ادب دا انملا ورثہ اکٹھا کیتا''۔(102)

ڈاکٹر ارشد محمود ناشاد نے اٹک کا نیا اور پرانا حدود اربعہ بیان کرتے ہوئے کچھ مشہور جگہوں کے بارے میں بیان کرتے ہوئے اٹک کے علاقے میں بولی جانے والی زبان کا تعارف اور کچھ مثالیں دی ہیں۔ اس کے بعد ''اکھان'' کی تعریف بیان کر کے اٹک کے لہجے میں الف بائی ترتیب سے اکھان درج کیے ہیں۔ ''ماہیے'' عنوان میں ماہیے کی صنف کے بارے میں کچھ ماہرین کی آرا بتانے کے بعد ماہیے درج کیے ہیں۔ اس سے اگلا عنوان ''بجھارت'' ہے جو کہ لوک ادب کی ایک مقبول صنف رہی ہے۔ ڈاکٹر ارشد محمود ناشاد نے بجھارت کا پس منظر اور اقسام بیان کرنے کے بعد الف بائی ترتیب سے کافی بجھارتیں بیان کی ہیں۔ ''بالاں دے گیت'' میں بچوں کے گیتوں کا تذکرہ کیا گیا ہے اور بہت سے گیت دیے گئے ہیں۔ لوک گیت کا مفہوم بیان کرتے ہوئے ڈاکٹر ارشد محمود ناشاد نے رفیق خاور کی بات کو دہرایا ہے؛

''گیت کیا ہیں؟ موجِ نفس کی اٹھکیلیاں؟ نہیں یہ تو ہوا کی موج ہیں جو رَم کے سوا کچھ بھی نہیں۔ گیت تو ''دل دریا سمندروں ڈوہنگے'' کی ہلکورے لیتی موجیں، نازک نازک خیالوں اور والہانہ احساس کی متوالی لہریں ہیں جو وجدان کی گہرائیوں سے ابھر کر لاانتہا بلندیوں تک پہنچتی اور دھرتی سے لپک کر گگن کو چُھو لیتی ہیں''۔(103)

''گیتاں دے کلاوے وچ انسانی حیاتی دے سارے موسم آوندے نیں۔ خوشیاں، غم، تاہنگاں، ارادے، کسک، کرب تے ہور سبھ کجھ گیتاں دے موضوعات نیں''۔(104)

اس کے آگے گیتوں کے مختلف انداز اور موضوعات بیان کیے گئے ہیں۔ 'محاورا' اس کا پس منظر اور استعمال کے بارے میں کافی تفصیل سے ذکر کیا گیا ہے۔ لوک عقیدے اور لوک طب کے بارے میں کہیں پر بھی ذکر نہیں ملتا لیکن ڈاکٹر ارشد محمود ناشاد نے اس کے بارے میں دلیل کے ساتھ بتایا ہے؛

''لوک طب تے لوک عقیدے کسے علاقے دے لوکاں دے بار بار دے تجربیاں داسٹہ ہوندے نیں۔
علاقے دے وسنیک ایہناں عقیدیاں تے علاجاں دے رکھوالے ہوندے نیں تے سینہ بہ سینہ ایہہ
سلسلہ ٹردا رہندا اے''۔ (105)

ڈاکٹر ارشد محمود ناشاد نے کچھ لوک عقیدے، ٹونے، ٹوٹکے، دم اور علاج بھی بیان کیے ہیں۔ لوک کہانیوں کے ضمن میں اس کا مکمل پس منظر بیان کرنے کے بعد ماضی میں کہانیاں سننے اور سنانے کی روایت بیان کی ہے جس سے ہمیں اپنی پرانی روایات سے آگاہی ملتی ہے۔ یہ کتاب نہ صرف ضلع اٹک کے لوک ادب کو بیان کرتی ہے بلکہ اس کے ذریعے اس علاقے کی معاشرتی اور سماجی حالت کا اندازہ لگایا جاسکتا ہے اور وہاں کی ثقافت کی عکاسی اس طرح سے کی گئی ہے کہ جس سے اس علاقے کی تاریخی تصویر نظروں کے سامنے آجاتی ہے۔

17۔ جنور باتاں (الیاس گھمن)

لوک ادب کی یہ کتاب پاکستان پنجابی ادبی بورڈ نے 1992 میں چھاپی تھی جس میں الیاس گھمن نے پچاس لوک کہانیاں جمع کی ہیں۔ ان کہانیوں میں بچوں کو سنائی جانے والی ایسی کہانیاں شامل ہیں جن میں ذات برادری اور پیشوں کے حوالے سے بات کی گئی ہے اس کے ذریعے الیاس گھمن نے عقلمندی کی باتیں بھی بتائی ہیں۔ اس کتاب پر الیاس گھمن کو ایوارڈ بھی مل چکا ہے۔ محمد آصف خاں نے اس کے بارے میں کہا ہے؛

''الیاس گھمن ہوری مہینہ وار رویل لہور دے چیف ایڈیٹر تے سائنسی کتاب ریڈار دے لکھیار ہن۔
ایس توں وکھ اوہ کہانی کار تے شاعر ہن۔ اوہناں وڈی جھج دھڑک مگروں تہاڈے لئی ایہہ کتاب جوڑی
اے''۔ (106)

''جنور باتاں دے جوڑن ہار الیاس گھمن دے تھورایت ہاں جو اوہنے ایہہ کتاب جوڑ کے ٹھکور یاتاں

ہے باقی ایہہ کتاب جوڑن ہار دا بہوں مڈھلا جتن اے۔ پورا پنجاب اپنے اندر کہانیاں نوں ویکھدیاں آس

بجھدی اے جو ایہہ سمندر ہن چو کھا چر او ہلے نہیں رہے گا''۔ (107)

18۔بجھ لو میری بات (حنیف چودھری)

یہ کتاب بھی پاکستان پنجابی ادبی بورڈ کی لوک ادب کے سلسلے کی ایک کڑی ہے جس کو حنیف چودھری نے مرتب کیا ہے اور یہ 1996 میں چھپی تھی۔ حنیف چودھری نے پنجاب کے معاشرے میں موجود پہیلیوں کی روایت کو الف بائی ترتیب سے اپنی کتاب میں اکٹھا کیا ہے۔ دنیا بھر کے معاشروں میں بچوں کی ذہنی نشو نما کے لیے اس طرز کی پہیلیاں یا کوئز کے سلسلے ہوتے ہیں لیکن ہمارے ہاں خصوصاً دیہاتی ماحول میں یہ بجھارتیں یا پہیلیاں بہت عام ہیں۔ محمد آصف خاں نے پہلی گل میں لکھا ہے؛

''بجھارتاں ہر وسوں وچ پائیاں جاندیاں رہیاں ہن۔ مہابھارت (انگریزی ترجمہ راج گوپال اچاریہ صفحے

41 تو 143) وچ بجھارتاں لبھدیاں ہن۔ سکندر یونانی جدوں ٹیکسلا وچ اپڑیا تاں اوہنے ایتھوں دے

فلسفیاں نوں بجھارتاں پائیاں''۔ (108)

حنیف چودھری نے 'پوکھو' کے عنوان کے تحت لکھا ہے؛

''دوجے ملکاں نے اپنے ایس ادبی ورثے نوں چم چٹ کے مقدس کتاب وانگر سودھ کے رکھیا ہویا اے۔

1181ء وچ یونانیاں نے سب توں پہلاں بجھارتاں دا مجموعہ Demand Joyous دے ناں ہیٹھ

چھاپیا۔ مگروں 1852ء وچ فرانسیسی بجھارتاں دا مجموعہ چھاپے چڑھیا۔ ایویں عربی بجھارتاں دی پہلی کتاب اقلید انعایات چوتھی، پنجویں ہجری وچ چھپی۔ گویا بجھارتاں داوجود دنیادے ہر حصے وچ ملدا اے۔ پاکستان دے ہر صوبے وچ ایس بجھارت داوجود موجود اے''۔(109)

انگریزی کتابیں

1۔ سورس میٹریل آن دی پنجاب (ملک احمد نواز)

اس کتاب کو ملک احمد نواز نے تحریر کیا ہے اور پاکستان پنجابی ادبی بورڈ نے اس کتاب کا پہلا ایڈیشن 1979 میں چھاپا تھا۔ اس کتاب میں پنجابی کے بارے میں چھپنے والے مضامین کی انگریزی میں bibliography دی گئی ہے۔ ان مضامین میں زبان، ادب، تاریخ، سیاست، زمینیں، لوگ، صنعتیں، شہر، زراعت، معیشت، اخبارات، رسالے اور پنجاب کی ثقافت سے متعلقہ دیگر موضوعات پر تحریر کیے گئے مضامین شامل کیے گئے ہیں۔

اس کتاب کے آخر میں bibliography کے اصولوں کے مطابق Index دے کر پڑھنے والوں کے لیے آسانی پیدا کی گئی ہے۔ احمد نواز ملک نے پنجابی زبان کے بارے میں تحقیق کرنے والے انگریزی زبان کے محققین کے لیے بہت عمدہ research tool مہیا کیا ہے۔ یہ کتاب پنجابی ادب کو دیگر زبانوں میں متعارف کرانے اور پھیلانے کے سلسلے میں عمدہ کوشش ہے۔

2۔ قادر یار اے کرٹیکل انٹروڈکشن (محمد اطہر طاہر)

قادر یار کا شمار پنجابی زبان کے کلاسیکی شعرا میں ہوتا ہے۔ ان کی شاعری اور حالات کے بارے میں تحقیقی کام نہیں ہوا اس لیے پنجابی ادب کے قارئین ان کے بارے میں ناواقف ہیں۔ محمد اطہر طاہر نے انگریزی میں ان کے بارے میں کتاب مرتب کر کے ان کو دوسری زبانوں کے قارئین سے متعارف کروایا ہے۔ ان کا اصل نام قادر بخش تھا اور تعلق گوجرانوالہ سے تھا، تاریخ پیدائش کے بارے میں اختلاف ہے۔ ان کو حافظ شاہ مراد کا ''نور نامہ'' پڑھ کر شعر کہنے کا شوق پیدا ہوا اور انھوں نے ''پورن بھگت'' سی حرفی کے انداز میں لکھا۔ ان کے انداز اور قصے کو خاصی پزیرائی حاصل ہوئی اور اس نے بہت مقبولیت حاصل کی۔ محمد اطہر طاہر نے اس کتاب میں قادر یار کی شاعری میں سے 'معراج نامہ'، 'ہری سنگھ نلوہ دی وار'، 'روزہ نامہ'، 'سوہنی مہینوال' اور 'پُورن بھگت' شامل کرتے ہوئے ان کا پس منظر بیان کیا ہے۔ اس کے ساتھ ہی

انھوں نے قادر یار کی شاعری کا تنقیدی انداز سے جائزہ لے کر اس کی خوبیوں کو یوں اجاگر کیا ہے کہ انگریزی پڑھنے والے بھی پنجابی زبان کے ایک کلاسیکی شاعر کے فن اور سوچ سے مستفید ہوں گے۔ اس سے پہلے اتنے بڑے شاعر کے کام کے بارے میں ایسی کوئی کتاب دستیاب نہیں تھی۔ محمد اطہر طاہر نے قادر یار جیسے کلاسیکی شاعر کی شاعری کے بارے میں انگریزی میں کتاب تحریر کر کے پنجابی ادب کو انگریزی اور دوسری زبانوں سے جوڑ دیا ہے۔ اس کتاب کے آخر میں bibliography اور index دیے گئے ہیں۔ اس کتاب میں مختلف کرداروں اور جگہوں کی تصاویر بھی شامل ہیں۔ اس کتاب کا پہلا ایڈیشن 1988 میں چھپا تھا۔

3۔ ورلی فین (محسن مگھیانہ) (مترجم حمید یوسفی)

اس کتاب میں ڈاکٹر محسن مگھیانہ کی پنجابی کہانیوں کی کتاب ''بھنبھیری'' کا انگریزی ترجمہ کیا گیا ہے اور اس کے مترجم حمید یوسفی ہیں۔ اس کتاب کے آغاز میں جناب شفقت تنویر مرزا، صدر پاکستان پنجابی ادبی بورڈ کے انگریزی کالم کو شامل کیا گیا ہے۔ اس کتاب میں دس پنجابی کہانیوں کا مندرجہ ذیل انگریزی عنوانوں کے تحت شائع کیا گیا ہے۔

"Earth Quake", "Bum Patch", "Tobacco Torch", "Sobs", "Flood", "Goof", "O God", "Statue in Smoke", "Utter Wildness", "Whirlifan"

ڈاکٹر محسن مگھیانہ کہانی نویسی کے میدان میں نووارد ہیں لیکن ان کہانیوں کے انگریزی ترجمے سے ادبی حلقوں اور پنجابی ادب سے دنیا بھر کو آشنا کرنے میں بہت مدد ملی ہے۔ 2002 میں اس کتاب کا پہلا ایڈیشن چھپا تھا۔ پاکستان پنجابی ادبی بورڈ کی یہ کاوش پنجابی زبان کو دنیا میں متعارف کرانے اور یہاں کے ادب کی ترویج کے سلسلے میں بہت اہمیت رکھتی ہے۔ محسن مگھیانہ نے ان کہانیوں کو جھنگ کے لہجے میں تحریر کیا ہے جس سے ان کی ماں بولی سے محبت نہایت واضح انداز میں ظاہر ہوتی ہے۔

حوالے باب چہارم

1۔ روزنامہ نوائے وقت، راولپنڈی۔

2۔ نواز، ڈونگھیاں شاماں، لاہور، پاکستان پنجابی ادبی بورڈ، 2009، ص13۔

3۔ انور علی، کالیاں اٹاں کالے روڑ، لاہور، پاکستان پنجابی ادبی بورڈ، 1972، ص8۔

4۔ کالیاں اٹاں کالے روڑ، ص12۔

5۔ اکبر لہوری، اکبر کہانیاں، لاہور، پاکستان پنجابی ادبی بورڈ، 1976، ص8۔

6۔ ایضاً۔

7۔ حنیفؔ باوا، چرخے دی موت، لاہور، پاکستان پنجابی ادبی بورڈ، 1981، ص4۔

8۔ حامد بیگ مرزا، قصہ کہانی، لاہور، پاکستان پنجابی ادبی بورڈ، 1984، ص7۔

9۔ چونویں کہانی، لاہور، پاکستان پنجابی ادبی بورڈ، 1986، ص17۔

10۔ سلمان سعید، سیتیاں اکھاں والے، پنجابی ادب تماہی، لاہور، جلد نمبر1، شمارہ نمبر4،
اکتوبر-دسمبر1987، ص106۔

11۔ مٹی اتے لیک، لاہور، پاکستان پنجابی ادبی بورڈ، 1986، ص89۔

12۔ محمد منصور آفاق، ککر دے پھل، پنجابی ادب تماہی، لاہور، جلد نمبر1، شمارہ نمبر3، جولائی- ستمبر1987، ص90۔

13۔ ایضاً

14۔ نصیرؔ شاہ، سید، ککر دے پھل، لاہور، پاکستان پنجابی ادبی بورڈ، 1987، ص23۔

15۔ محمد منشا یاد، وگدا پانی، لاہور، پاکستان پنجابی ادبی بورڈ، 1987، ص7۔

16۔ وگدا پانی، ص11۔

17۔ کنول مشتاق، میں تے میں، لاہور، پاکستان پنجابی ادبی بورڈ، 1988، ص2۔

18۔ چونویں کہانی، لاہور، پاکستان پنجابی ادبی بورڈ، 1986، ص256۔

19۔ چونویں کہانی، ص38۔

20۔ نزہت گردیزی، کلجگ، لاہور، پاکستان پنجابی ادبی بورڈ، 1989، ص 8۔

21۔ کتاب جہات، نوری، ماں بولی مہینہ وار، لاہور، جلد نمبر 6، شمارہ نمبر 2، فروری 1994، ص 18۔
22۔ انور علی، نوری، لاہور، پاکستان پنجابی ادبی بورڈ، 1993، ص 4۔
23۔ شیشے دی کندھ، لاہور، پاکستان پنجابی ادبی بورڈ، 1993، ص 14۔
24۔ سلیم خان گمی، تردے پیر، لاہور، پاکستان پنجابی ادبی بورڈ، 1994، ص 5۔
25۔ احمد شہباز خاور، چپ دی چیک، لاہور، پاکستان پنجابی ادبی بورڈ، 1994، ص 3۔
26۔ انیل چوہان، اک دے امب، لاہور، پاکستان پنجابی ادبی بورڈ، 1994، ص 7۔
27۔ حنیف باوا، کہانی، لاہور، پاکستان پنجابی ادبی بورڈ، 1994، ص 6۔
28۔ ہر دے وچ تریڑاں، لاہور، پاکستان پنجابی ادبی بورڈ، 1995، ص 7۔
29۔ ہر دے وچ تریڑاں، ص 14۔
30۔ پشتو کہانیاں، لاہور، پاکستان پنجابی ادبی بورڈ، 1996، ص 8۔
31۔ پشتو کہانیاں، ص 7۔
32۔ کہکشاں کنول، تصویراں والی کہانی، لاہور، پاکستان پنجابی ادبی بورڈ، 1998، ص 7۔
33۔ تصویراں والی کہانی، ص 11۔
34۔ تصویراں والی کہانی، ص 12۔
35۔ دوجا بٹوارا، لاہور، پاکستان پنجابی ادبی بورڈ، 1998، ص 8۔
36۔ دوجا بٹوارا، ص 7۔
37۔ محسن عباسی، پروفیسر، پشو پاشا، لاہور، پاکستان پنجابی ادبی بورڈ، 1999، ص 11۔
38۔ پشو پاشا، ص 15۔
39۔ ڈاکٹر محسن مگھیانہ، انیندرے، لاہور، پاکستان پنجابی ادبی بورڈ، 1999، ص 9۔
40۔ تصویراں والی کہانی، ص 7۔
41۔ رفعت، اک اوپری کڑی، لاہور، پاکستان پنجابی ادبی بورڈ، 2003، ص 5۔
42۔ ایضاً۔
43۔ پروین ملک، نکے نکے دکھ، لاہور، پاکستان پنجابی ادبی بورڈ، 2004، ص 3۔

44۔ سجاد حیدر، سورج مکھی،لاہور، پاکستان پنجابی ادبی بورڈ،1999ص7۔

45۔ سورج مکھی، ص9۔

46۔ سورج مکھی، ص17۔

47۔ سورج مکھی، ص718۔

48۔ منو بھائی، جزیرہ،لاہور، پاکستان پنجابی ادبی بورڈ، 1997، ص 7۔

49۔ بوہا کوئی نہ،لاہور، پاکستان پنجابی ادبی بورڈ، 1980، ص3۔

50۔ بوہا کوئی نہ، ص7۔

51۔ منیر نیازی، قصہ دو بھراواں دا،لاہور، پاکستان پنجابی ادبی بورڈ، 1981، ص4۔

52۔ نواز، شام رنگی کڑی،لاہور، پاکستان پنجابی ادبی بورڈ، 1983۔

53۔ شام رنگی کڑی، پنجابی ادب، تماہی،لاہور، جلد نمبر 1، شمارہ جنوری-مارچ 1987، ص140۔

54۔افضل احسن رندھاوا، سپ شہینہ تے فقیر،لاہور، پاکستان پنجابی ادبی بورڈ، 1997، ص11۔

55۔ایضاً۔

56۔ سجاد حیدر، بول مٹی دیا باویا،لاہور، پاکستان پنجابی ادبی بورڈ، ص14۔

57۔ میراں بخش منہاس، جت دی کرتوت،لاہور، پاکستان پنجابی ادبی بورڈ، 1976، ص13۔

58۔ ظفر لاشاری، پہاج،لاہور، پاکستان پنجابی ادبی بورڈ، 2003، ص5۔

59۔ایضاً۔

60۔ٹٹ جھج،لاہور، پاکستان پنجابی ادبی بورڈ، 1986، ص9۔

61۔ فرزند علی، تائی،لاہور، پاکستان پنجابی ادبی بورڈ، 1996، ص5۔

62۔افضل احسن رندھاوا، پہلوں دس دتی گئی موت دا روزنامچہ،لاہور، پاکستان پنجابی ادبی بورڈ، 1992، ص7۔

63۔ سجاد حیدر، چیتر باغ،لاہور، پاکستان پنجابی ادبی بورڈ، 1992، ص5۔

64۔ایضاً۔

65۔ نذر حسین جانی، سنجان،لاہور، پاکستان پنجابی ادبی بورڈ،1992، ص8۔

66۔ فرزند علی، اک چونڈھی لون دی،لاہور، پاکستان پنجابی ادبی بورڈ، 1994، ص7۔

67۔ایضاً۔

68۔لہور نگی سویر،لاہور، پاکستان پنجابی ادبی بورڈ، 1994،ص5۔

69۔لہور نگی سویر،ص8۔

70۔ سردار خان، پروفیسر، پکی سڑک،لاہور، پاکستان پنجابی ادبی بورڈ، 1995،ص5۔

71۔فرزند علی، بھبھل،لاہور، پاکستان پنجابی ادبی بورڈ، 1995،ص5۔

72۔ بھبھل،ص6۔

73۔افضل احسن رندھاوا، سورج گرہن،لاہور، پاکستان پنجابی ادبی بورڈ، 1996،ص11۔

74۔دوجا بٹوارا،ص12۔

75۔افضل احسن رندھاوا،کالا پینڈا،لاہور، پاکستان پنجابی ادبی بورڈ، 1988،ص26۔

76۔کالا پینڈا،ص25۔

77۔صوفی تبسم، نظراں کر دیاں گلاں،لاہور، پاکستان پنجابی ادبی بورڈ، 1988،ص12۔

78۔باقی صدیقی، کچے گھڑے،لاہور، پاکستان پنجابی ادبی بورڈ، 1994،ص10۔

79۔دیس پردیس، سلیم خان گمی،لاہور، پاکستان پنجابی ادبی بورڈ،1978،ص6۔

80۔راجا رسالو،لاپریت اجیہی محمد،لاہور، پاکستان پنجابی ادبی بورڈ،2008،ص5۔

81۔لاپریت اجیہی محمد،ص191۔

82۔مسعود منور، قائداعظم دی وار،لاہور، پاکستان پنجابی ادبی بورڈ، 1997،ص7۔

83۔ محمد ظہیر اختر، مسعود کھدرپوش،لاہور، پاکستان پنجابی ادبی بورڈ،1986،ص4۔

84۔راجا رسالو،ڈاکٹر نذیر احمد،لاہور، پاکستان پنجابی ادبی بورڈ،1998،ص5۔

85۔ محمد جنید اکرم،ڈاکٹر فقیر محمد فقیر،لاہور، پاکستان پنجابی ادبی بورڈ،1992،ص5۔

86۔استاد اللہ دتہ صابر، تکھیاں سولاں،لاہور، پاکستان پنجابی ادبی بورڈ،1981،5۔

87۔اعجاز،اے۔ڈی،کال بلیندی،لاہور، پاکستان پنجابی ادبی بورڈ،1983،ص5۔

88۔شارب، پروفیسر، کنیں بُندے،لاہور، پاکستان پنجابی ادبی بورڈ،1984،ص10۔

89۔باردے گیت،لاہور، پاکستان پنجابی ادبی بورڈ،1984،ص5۔

90۔ بار دے گیت، ص7۔

91۔ بار دے گیت، ص11۔

92۔ بار دے ڈھولے،لاہور، پاکستان پنجابی ادبی بورڈ،1985، ص7۔

93۔ رکھ تاں ہرے بھرے،لاہور، پاکستان پنجابی ادبی بورڈ،1985، ص8۔

94۔ جتھے پپلاں دی ٹھنڈی چھاں،لاہور، پاکستان پنجابی ادبی بورڈ،1985، ص24۔

95۔ جتھے پپلاں دی ٹھنڈی چھاں، ص15۔

96۔ جتھے پپلاں دی ٹھنڈی چھاں، ص21۔

97۔اقبال اسد، پنجاب دے لجپال پتر،لاہور، پاکستان پنجابی ادبی بورڈ،1995، ص6۔

98۔ شارب، پروفیسر، ٹانگے جھنگ جاندے،لاہور، پاکستان پنجابی ادبی بورڈ،1987، ص9۔

99۔ارشد محمود ناشاد، ڈاکٹر، آپنا گراں ہووے،لاہور، پاکستان پنجابی ادبی بورڈ،2009، ص10۔

100۔ آپنا گراں ہووے، ص11۔

101۔ آپنا گراں ہووے، ص13۔

102۔آپنا گراں ہووے، ص18۔

103۔آپنا گراں ہووے، ص174۔

104۔ آپنا گراں ہووے، ص175۔

105۔ آپنا گراں ہووے، ص218۔

106۔الیاس گھمن، جنور باتاں،لاہور، پاکستان پنجابی ادبی بورڈ،1992، ص9۔

107۔ کتاب جہات، جنور باتاں، ماں بولی مہینہ وار لاہور، جلد نمبر4، شمارہ نمبر7، جولائی1992، ص94۔

108۔ حنیف چودھری، بجھ لو میری بات،لاہور، پاکستان پنجابی ادبی بورڈ، 1996، ص7۔

109۔ بجھ لو میری بات، ص9۔

باب پنجم

پاکستان پنجابی ادبی بورڈ کی متفرق علمی، ادبی اور لسانی خدمات

سیاست

1۔ قائدا عظم، سوچ تے سیاست (رفیق ڈوگر)

رفیق ڈوگر نے دنیا کے پانچ مختلف لوگوں کی بابائے قوم محمد علی جناح کے بارے میں دی گئی آراء کو اس کتاب میں اکٹھا کیا ہے۔ ان لوگوں کا تعلق بھی مختلف جگہوں اور مذہبوں سے ہے۔ ان میں سے کچھ مضامین اردو اور انگریزی میں چھپ چکے ہیں جن کو رفیق ڈوگر نے پنجابی زبان میں ترجمہ کیا ہے جس سے پنجابی قارئین کو قائدا عظم کے کردار کو زیادہ بہتر انداز میں سمجھنے میں مدد ملتی ہے۔ رفیق ڈوگر نے دیباچے کا اختتام 'مظہر بدق' ترکی کی سپریم کورٹ کے جج کے ان الفاظ پر کیا ہے؛

> ''ایشیا تے افریقہ دے ملکاں وچ چلن والیاں آزادی دیاں تحریکاں کارن ایہناں براعظماں دے جیہڑے لیڈر دنیاں وچ مشہور ہوئے ہن، قائدا عظم محمد علی جناح اوہناں ساریاں توں اُچا اے تے ایہدے وچ کسے اختلاف دی گنجائش ای نہیں۔ ایہہ اک جج تے عدالت دا فیصلہ اے۔ اک اجیہے وکیل بارے جس اک قوم دا مقدمہ لڑیا تے جتیا سی اتے جیہدے مقدمے دی ساری فائل ویکھ کے اوہ ایہہ فیصلہ دیندے نیں پئی اوہناں دی کامیابی دی وجہ اوہناں دا حقیقت پسند ہونا تے صحیح فکر رکھنا سی''۔(1)

پانچ مضامین میں پہلا مضمون 'مسز سروجنی نائیڈو' کے مضمون 'قائدِ اعظم ایکتا دا سفیر' کے عنوان سے ہے۔ انھوں نے محمد علی جناح کے بارے میں بھرپور مضمون تحریر کیا ہے جس میں محمد علی جناح پر 'گھوکھلے' کے اثرات، انگلینڈ میں تعلیم، ہندوستان واپسی، وکالت، ابتدائی سیاست، شادی سے لے کر اسمبلی کے رکن منتخب ہونے کے بعد کیے گئے کاموں وغیرہ کا ذکر کیا ہے۔ 'کے ایچ خورشید' کے مضمون 'کشمیر وچ' میں قائدِ اعظم کی کشمیر سے محبت اور اس کی سیاست اور مستقبل کے بارے میں ان کی دلچسپی کو بھرپور انداز میں نمایاں کرتا ہے۔ 'بیٹی ملرانٹی برگر' جن کا تعلق امریکہ سے تھا انھوں نے 'امریکیاں دی نظر وچ' کے عنوان سے دیگر مصنفین کے حوالے دے کر قائدِ اعظم کی شخصیت کے بارے میں نہایت جامع مضمون تحریر کیا ہے۔ آخری مضمون ترکی کے ماہر قانون 'ایم مظہر بدُق' کا تحریر کردہ ہے۔ جس میں وہ قائدِ اعظم سے ملاقات نہ ہونے کے باوجود اس بات پر مجبور ہوئے کہ محمد علی جناح کے کردار کے بارے میں کچھ الفاظ تحریر کریں۔ یہ مضامین قائدِ اعظم محمد علی جناح کی سوویں سالگرہ کے موقع پر ہونے والی کانفرنس میں پڑھے گئے تھے۔

اس کتاب پانچ مختلف علاقوں کے عالم فاضل لوگوں کے قائدِ اعظم کے بارے میں خیالات قائدِ اعظم کی بڑائی اور عظمت کو ثابت کرتے ہیں۔ قائدِ اعظم کی سیاست اور کردار کے بارے میں اس کتاب سے بھرپور جانکاری ملتی ہے۔

2۔ تحریک آزادی تے پاکستان وچ پنجاب دا حصہ (شفقت تنویر مرزا)

پاکستان پنجابی ادبی بورڈ کی طرف سے 1993 میں چھاپی گئی اس کتاب کو شفقت تنویر مرزا نے 'احمد خان کھرل' کے نام کر کے پنجاب کے ایک ایسے گھبرو کو خراج عقیدت پیش کیا ہے جس پر یہ دھرتی ہمیشہ مان کرتی رہے گی۔ اس کتاب کے آغاز میں پنجاب پر حملہ آوروں کے بارے میں بات کرتے ہوئے چوبیس کے قریب حملہ آوروں کا تذکرہ کیا ہے۔ پنجاب کا جغرافیہ کافی تفصیل سے دیا گیا ہے اور مختلف ادوار میں اس میں کون سے علاقے شامل تھے، ان کا ذکر ہے۔ اس کے بعد 'مغلاں مگروں پنجاب' کے عنوان میں پنجاب کی سیاسی صورت حال بیان کی گئی ہے۔ اگلے باب میں افغان، سکھ اور انگریزوں کے بارے میں کافی تفصیل ہے اور پھر 1857 کی جنگ آزادی اور اس دوران احمد خان کھرل کے کردار کو بیان کیا گیا ہے۔

1857 کی جنگ آزادی کے بعد مسلمانوں کی سیاسی حیثیت اور اس کے بعد مسلمانوں کی مقامی اور دوسرے غیر مقامی لوگوں سے چو مکھی لڑائی کا احوال بیان کرنے کے بعد 1919 میں لگنے والے مارشل لاء کا تذکرہ کیا گیا ہے۔ پنجاب کا سیاسی کردار اور قیام پاکستان کی منزل کیونکر طے ہوئی اس کا ذکر اگلے باب میں دیا گیا ہے۔ دیگر ابواب بھی تحریک آزادی میں پنجاب کے کردار اور اس تاریخ کو بیان کرتے ہیں جس کا نتیجہ الگ مملکت کی شکل میں سامنے آیا۔

اس کتاب میں قیام پاکستان کے پس منظر اور اس جدوجہد کے دوران پیش آنے والے واقعات کے بارے میں تفصیلات جاننے کے لیے مفید معلومات موجود ہیں۔ شفقت تنویر مرزا نے چھوٹی سی کتاب میں بہت کچھ درج کر دیا ہے جس سے آنے والے نسلیں اپنے علاقے کے ماضی اور اُن کرداروں اور ان کے کارناموں سے واقف ہوں گے جنھوں نے ان کے لیے اپنی زندگیاں قربان کیں۔ محمد آصف خاں نے اس کتاب میں لکھا ہے؛

"ایہہ کتاب ہن تہاڈے ہتھاں وچ ہے۔ تسیں ویکھو گے کہ جس موضوع نوں اوہناں 112 صفحیاں دے کلاوے وچ سمیٹیا ہے۔ ایس بارے کئیاں جلداں وچ کتاباں لکھیاں جاسکدیاں ہن۔ پر سوجھوان لکھیار دا کمال ایہہ ہے کہ اوس نے مڈھ لاتوں 23 مارچ 1940 دی قرارداد پاکستان دا پچھوکڑ گھٹو گھٹ لفظاں وچ دسن دے نال نال اجیہا کوئی پکھ نہیں رہن دتا جس ول ساڈا دھیان نہ دوایا ہووے"۔ (2)

بچوں کی کتابیں

1۔ چپنی کی شادی (افضل پرویز)

چالیس صفحات کی یہ کتاب چار کہانیوں پر مشتمل ہے۔اس کتاب میں عقل ودانش اور زندگی کی حقیقتیں بیان کی گئی ہیں۔ان میں غرور کے برے انجام کونہایت عمدہ انداز میں بتایا گیا ہے کہ انسان کو کسی صورت مغرور نہیں ہونا چاہیے بلکہ عاجزی سے کام لینا چاہیے کیونکہ غرور کا انجام اچھا نہیں ہوتا۔ بڑے بزرگوں کی عقل ودانش کی باتوں پر دھیان دے کر ان سے سبق لینے اور بددیانتی سے بچنے کے بارے میں بتایا گیا ہے۔ایک کہانی میں بتایا گیا ہے کہ بددیانتی سے وقتی طور پر فائدہ ہوتا ہے لیکن یہ نقصان دہ ہے اور کس طرح سے لوگوں کے رویے سے ان کی بددیانتی کے بارے میں جانا جاسکتا ہے۔اس کتاب میں موجود کہانیوں کے ذریعے یہ سبق دینے کی کوشش کی گئی ہے کہ بددیانتی ایک بڑا جرم ہے اور غرور سے بچنا چاہیے۔ یہ 1980 میں چھپی تھی۔

2۔ باتاں (پروفیسر ریاض احمد شاد)

اس کتاب میں بچوں کے لیے پانچ کہانیاں موجود ہیں۔ ہماری معاشرتی ترتیب اس طرح کی ہے کہ بچے اپنی نانیوں اور دادیوں سے کہانیاں سنتے رہتے ہیں یا ان سے کہانیوں کی فرمائش کرتے ہیں۔ عمومی طور پر بچوں کی کہانیاں ایسی ہوتی ہیں جن میں ان کو بہتر انسان بننے کے بارے میں راہ دکھائی جاتی ہے۔ پروفیسر ریاض احمد شاد نے اس کتاب میں بچوں کے لیے ایسی ہی پانچ کہانیاں تحریر کی ہیں۔ ان کہانیوں کا مقصد بچوں کو محنت اور جدوجہد کرنے کی تلقین کرنا اور وعدہ پورا کرنے کا سبق دینا تھا۔اس کے علاوہ ان کہانیوں میں صبر کا پھل، ظلم کے برے انجام، مظلوم کی آہ کے اثر، والدین کی اپنے بچوں سے محبت، سوتیلی ماں کے ناروا سلوک جیسے معاملات کو بیان کیا گیا ہے۔انھوں نے بچوں کو آئندہ زندگی میں پیش آنے والی مشکلات سے آگاہ کرنے کی کوشش کی ہے۔یہ کتاب 1980 میں چھپی تھی۔

3۔ وڈیاں دا آدر (مسرت کلانچوی)

اس چھوٹی سی کتاب میں مسرت کلانچوی نے 'نواز' نامی لڑکے کی کہانی بیان کی ہے۔ اس لڑکے کی عادتوں اور حرکتوں میں دوسروں کو تنگ کرنا اور ہر کسی کا مذاق اڑانا شامل تھا۔ وہ اپنے بڑوں کی بے ادبی کرتا اور ماں باپ کا حکم نہیں مانتا تھا جس وجہ سے اس کا انجام یہ ہوتا ہے کہ دوسروں کا مذاق اڑانے والا خود مذاق بن جاتا ہے۔ لکھاری نے اس کتاب کے ذریعے بچوں کو اس بات کی ترغیب دی ہے کہ بڑوں کا ادب کرو، ان کا حکم مانو اور کسی کا برا مت سوچو۔ اسی طریقے سے تم زندگی میں کامیابی حاصل کر سکتے ہو۔ سبق آموز کہانی کی یہ کتاب 1986 میں چھپی تھی۔

4۔ خوشیاں بھریا گھرانہ (ڈاکٹر اجمل نیازی)

ڈاکٹر اجمل نیازی نے اس کتاب میں جو کہانی بیان کی ہے عنوان ہی سے اس کا پتا چل جاتا ہے۔ انھوں نے اس کہانی کے ذریعے بتایا ہے کہ اگر عورت عقلمند ہو اور وہ اپنی اولاد کی اچھی پرورش کرے اور گھر کے دیگر افراد محنت کریں تو پھر حالات کو بہتر کیا جا سکتا ہے اور محنت کرنے سے کامیابی ملتی ہے۔ اس کہانی میں عورت کے کردار کو نہایت عمدہ انداز میں پیش کیا گیا ہے کہ کس طرح سے ایک سگھڑ عورت اپنے طرز عمل اور محنت سے اپنے حالات کو بہتر کر کے اچھی زندگی گزار سکتی ہے۔ اس کہانی کا حاصل یہ ہے کہ کسی کی بھی اچھے مقصد کے لیے کی جانے والی محنت ضائع نہیں جاتی اور اس کا پھل ضرور ملتا ہے۔ یہ کتاب 1986 میں چھپی تھی۔

متفرق کتابیں

1۔ شہد دی مکھی، کیڑی تے مکڑی (مس گل یاسمین قمر)

1980 میں چھپنے والی یہ چھوٹی سے کتاب کیڑے مکوڑوں کے بارے میں معلومات مہیا کرتی ہے۔اس کتاب میں چیونٹی اس کے جسم،اقسام اور کاموں کے بارے میں بتایا ہے۔اس کے علاوہ شہد کی مکھی اور مکڑی کی قسمیں اور ان کے کام بتائے گئے ہیں۔ یہ چھوٹی سی کتاب کیڑوں کے بارے میں خاصی معلومات فراہم کرتی ہے۔

2۔ آواجائی (راجا رسالو)

یہ کتاب انسانی ترقی کا آئینہ ہے جس میں انسان کی سفری ضروریات کو پورا کرنے کے والی سہولیات کے سلسلے اور وسائل میں ہونے والے ترقی کو موضوع بناتے ہوئے بیان کیا گیا ہے۔اس کہانی میں ابتدائی دور میں جانوروں پر سفر کرنے سے لے کر آج کے جدید ترقی یافتہ دور میں سائنسی ایجادات کے نتیجے میں اختیار کیے جانے والے ذرائع بھی شامل ہیں۔ یہ چھوٹی سی کتاب 1980 میں چھپی تھی۔

3۔ کپاہ (چودھری نثار حسین)

کپاس کا شمار ہمارے ملک کی اہم فصلوں میں ہوتا ہے اور یہ ہمارے بہت سے لوگوں کا ذریعہ معاش بھی ہے۔اس کی اہمیت کا اندازہ اس کتاب کو پڑھنے سے بخوبی ہو جاتا ہے۔اس کتاب میں کپاس کی مختلف اقسام بتائی گئی ہیں۔ کپاس کو کاشت کرنے سے لے کر صنعتوں میں استعمال اور پھر کپڑا بننے تک کے سارے عمل کے بارے میں معلومات اور مشورے موجود ہیں۔ اس کتاب کے آخر میں مختلف سال میں کپاس کی زیادہ فصل پیدا ہونے کی تفصیل دی گئی ہے۔ یہ کتاب 1980 میں چھپی تھی جس میں مصنف نے پنجاب کی ایک اہم فصل اور دیہات کے لوگوں کا ذریعہ معاش بننے والی اہم فصل کے بارے میں معلومات فراہم کی ہیں۔

4۔ پنجابی اکھان (عین الحق فرید کوٹی)

اقوال کسی بھی زبان کا مغز قرار دیے جا سکتے ہیں جو اہل عقل و دانش کے تجربوں کا نچوڑ ہوتے ہیں۔ پنجابی زبان میں ان کو 'اکھان' کہا جاتا ہے۔ ان اکھانوں کے ذریعے سے دانائی کی بات کو با آسانی بیان کر دیا جاتا ہے۔ اس کتاب میں پنجابی کہاوتوں کی اردو میں وضاحت کی گئی ہے۔ ان اقوال کو تاریخی، کھیتی باڑی اور رشتوں کے عنوانات کے تحت تقسیم کیا گیا ہے۔ پنجابی ادب کے قارئین کے لیے یہ کتاب نہایت مفید ثابت ہوئی ہے کیونکہ اس کے ذریعے سے پنجابی زبان میں موجود علمی خزانہ ان تک پہنچا ہے۔ یہ کتاب 1980 میں چھپی تھی۔

5۔ کھیڈاں (پروفیسر غلام رسول آزاد)

انسان کی زندگی میں کھیل اس کی صحت اور کارکردگی کے سلسلے میں بہت اہم کردار ادا کرتے ہیں اس لیے ان کی اہمیت سے انکار نہیں کیا جا سکتا۔ کہا جاتا ہے کہ صحت مند جسم ہی صحت مند ذہن کی ضمانت ہے۔ اس کتاب میں 37 قسم کے ایسے کھیل اور ان کے چھ فوائد بتائے گئے ہیں جو کہ ذہنی اور جسمانی نشو و نما کے لیے بے حد ضروری ہیں۔ اس کتاب کے ذریعے سے پنجاب کے معاشرے میں موجود کھیلوں کی اقسام اور ان کے ناموں کا پتا چلتا ہے۔ ان کھیلوں میں 'کھدو کھونڈی'، 'شیر بکری'، 'چھال'، 'گلی ڈنڈا'، 'کبڈی'، 'پٹھو گرم'، 'شٹاپو'، 'چاٹی دوڑ'، 'ہرا سمندر' اور دیگر شامل ہیں۔ ان میں سے کچھ کھیل لڑکوں اور کچھ لڑکیوں کے لیے مخصوص ہیں۔ یہ کھیل اس بات کی ضمانت دیتے ہیں کہ پنجاب اور پنجابی ہر میدان میں دوسروں کا مقابلہ کرنے کی سکت رکھتے ہیں۔

6۔ ساڈی خوراک (فاروق احمد صدیقی)

جسمانی نشو و نما کے لیے اچھی اور متوازن خوراک کتنی ضروری ہوتی ہے، یہ کتاب اس سلسلے میں معلومات فراہم کرتی ہے۔ اس کتاب میں متوازن خوراک کی اقسام، پروٹین، نشاستہ، نمکیات، دودھ، دہی، انڈے کے فوائد اور کچھ ضروری

باتیں بیان کی گئی ہیں۔ مصنف نے کھانے کی ایسی چیزوں کے بارے میں بتایا ہے جن کے کھانے سے انسانی جسم کی ضرویات بھی پوری ہو جائیں اور اس کی جیب پر بھی خاص اثر نہ پڑے۔ یہ کتاب بھی 1980 میں شائع ہوئی تھی۔

7۔ ساڈا جُثا (ڈاکٹر مقبول احمد)

ڈاکٹر مقبول احمد کی چھوٹی سی کتاب 1980 میں چھپی تھی۔ اس کتاب میں انسانی جسم میں کارفرما مختلف سات نظام جن میں پٹھوں کا نظام، نظام انہضام، نظام تنفس، دل اور خون کی نالیوں کا نظام، ہڈیوں، جوڑوں جیسے نظاموں کے بارے میں بھرپور تفصیل بیان کی گئی ہے۔ اس کے ساتھ حواس خمسہ کو بیان کرنے کے بعد یہ بتایا گیا ہے کہ دماغ کس طرح سے سارے اعضا کو چلاتا ہے، اس بارے میں بھی بتایا گیا ہے۔ یہ کتاب ضخامت میں کم ہونے کے باوجود نہایت قابل قدر معلومات کی حامل ہے۔

8۔ زنانی دے روپ (فرخندہ لودھی)

فرخندہ لودھی نے اپنی کتاب میں عورت کی زندگی کے چار مختلف رُوپ یا کرداروں کو موضوع بناتے ہوئے بات کی ہے۔ ان رُوپوں میں پہلا ماں، دوسرا بہن، تیسرا بیوی اور چوتھا بیٹی کی شکل میں ہے۔ انھوں یہ واضح کیا ہے کہ ماں ہی انسان کو دنیا میں لانے کا سبب ہوتی ہے اور وہ ہی اس کی بنیادی کردار سازی کرتی ہے۔ بہنیں ہمیشہ اپنے بھائیوں پر فخر کرتی ہیں اور ان کی زندگی، صحت، ترقی اور خوشیوں کے گیت گاتی ہیں۔ بیوی کے روپ میں وہ ایک خاندان کی تکمیل کا سبب بنتی ہے اور یہ روپ ایک اچھے معاشرے کی تشکیل کا سبب ہوتا ہے۔ آخری روپ میں عورت بیٹی کی شکل میں ایک مذہبی ذمہ داری ہے کیونکہ جس گھر میں بیٹی ہوتی ہے، اس گھر میں اللہ تعالی کی رحمتیں نازل ہوتی ہیں۔ فرخندہ لودھی ایک پختہ کار اور مصنفہ ہیں، انھوں نے عورت کے سارے روپ اس کتاب میں خوبصورتی سے بیان کرتے ہوئے اس کے مثبت کردار کو واضح کیا ہے۔ یہ کتاب 1980 میں چھپی تھی۔

9۔ دستکاریاں (پروفیسر شارب)

ہڑپہ، ٹیکسلا، سرائے کھولا، چولستان وغیرہ کے آثار قدیمہ سے ہونے والی کھدائیوں سے یہ بات ظاہر ہوتی ہے کہ جس علاقے میں رہتے ہیں، یہاں پر دستکاریوں کو بڑی اہمیت حاصل رہی ہے جس کا واضح ثبوت یہ آثار قدیمہ ہیں۔ اس کتاب میں قالین سازی، برتن بنانے، لکڑی کے کام، چمڑے سے چیزیں بنانے، اُون سے بننے والی چیزوں اور دیگر دستکاریوں کا ذکر ہے۔ اس کتاب میں خانہ بدوشوں کے قبیلوں کا ذکر بھی کیا گیا ہے اور یہ بتایا گیا ہے کہ کس طرح سے ان کی خواتین ٹوکرے، ٹوکریاں، ہاتھ والے پنکھے اور اس قسم کی دوسری چیزیں بناتی ہیں۔ یہ کتاب 1980 میں چھپی تھی۔

10۔ پنڈ وتے شہری وسیبا (ارشاد فیروز پوری)

ارشاد فیروز پوری کی اس چھوٹی سی کتاب کا آغاز انسانی تہذیب کی ابتدا سے کیا ہے۔ مصنف نے پتھر کے دور میں جنگلوں میں رہنے والے انسانوں کی خانہ بدوشی کی زندگی کو گاؤں کی زندگی اور پھر شہر کی زندگی کی شکل میں ڈھل جانے کے بارے میں بات کی ہے۔ انھوں نے گاؤں اور شہری زندگی کا تقابل کرتے ہوئے بتایا ہے کہ گاؤں کی سادہ زندگی اور رہن سہن کا انداز آرام دہ ہوتا ہے جبکہ اس کے برعکس شہری زندگی میں بہت سی مشکلات اور تکلیفیں موجود ہیں۔ مصنف نے دیہاتی اور شہری لوگوں کے کام کاج، کھیلوں، کھانے پینے اور شادی بیاہ کے مواقع پر مختلف معاملات میں فرق واضح کیا ہے۔ دیہات کی وجہ سے ہمارے ملک کی زراعت نے ترقی کی ہے اور شہروں میں موجود صنعتوں کی وجہ سے ہمیں زندگی کے دیگر شعبوں میں ترقی حاصل ہوئی۔ دیہاتی اور شہری دونوں مل کر ملک کی ترقی کے سلسلے میں اپنا اپنا کام کر رہے ہیں اور دونوں ایک دوسرے کی ضروریات پوری کرنے کے لیے لازم وملزوم ہیں۔ یہ کتاب 1980 میں شائع کی گئی تھی۔

11۔ بوٹے (ڈاکٹر زین العابدین)

انسانی معاشرے میں پودوں کی اہمیت سے انکار نہیں کیا جا سکتا۔ ڈاکٹر زین العابدین بیالوجی کے استاد ہونے کی وجہ سے ان کی اہمیت سے بخوبی آگاہ ہیں۔ اس لیے انھوں نے اس کتاب کے ذریعے پودوں کی مختلف اقسام، عمروں، خوراک،

پودوں کی نگہداشت، پودوں کے فوائد اور نقصانات کے بارے میں معلومات فراہم کی ہیں۔انھوں نے انسانوں کے کام آنے والے اور آرام مہیا کرنے والے پودوں کے بارے میں آگاہی دی ہے۔ یہ چھوٹی سی کتاب ہے لیکن پودوں کے بارے میں اچھی خاصی اور مفید معلومات کی حامل ہے۔ یہ کتاب 1980 میں شائع ہوئی تھی۔

12۔ساڈی کائنات (اسلم رسول پوری)

اسلم رسول پوری نے 39 صفحات پر مشتمل اس چھوٹی سی کتاب میں بہت مفید معلومات مہیا کی ہیں۔ اس کتاب میں کائنات کے نظام کے بارے میں بتا گیا ہے اور یہ بتایا گیا ہے کہ زمین ساکن ہے یا نہیں۔ اس میں زمین، نو ستاروں، کہکشاں، دمدار ستاروں، آسمان اور زندگی کی حقیقت اور اس کے آغاز کے بارے میں معلومات مہیا کی گئی ہیں۔ مشہور سائنسدانوں بطلیموس، کوپر نیکس، گلیلیو وغیرہ کے بارے میں کافی معلومات موجود ہیں۔اس چھوٹی سی کتاب میں دی گئی معلومات نہایت اہم اور کارآمد ہیں۔ یہ کتاب 1980 میں چھپی تھی۔

13۔سائنسی ایجاداں (محمد ذکی رضوی)

اس کتاب کے مصنف محمد ذکی رضوی نے سائنسی ایجادوں کے بارے میں ذکر کیا ہے۔انھوں نے بھاپ سے چلنے والا انجن بنانے والے جیمز واٹ، پٹرول انجن، ڈیزل انجن، جیٹ انجن اور راکٹ کے ذریعے لیے جانے وال کام اور ان کو بنانے والوں کے بارے میں بتایا ہے۔ مصنف نے بتایا ہے کہ بجلی کس طرح پیدا ہوتی ہے، پن بجلی کیا ہے۔ بجلی کے ٹرانسفارمر کے بارے میں معلومات دی ہیں کہ وہ کس طرح کام کرتا ہے۔اس کے علاوہ ایٹم،اس کی طاقت اور یہ کس طرح کام کرتا ہے،ایٹمی ری ایکٹر کیا کام کرتا ہے،ان سب کے بارے میں بھی کافی تفصیل فراہم کی ہے۔ یہ کتاب 1980 میں چھپی تھی۔

14۔ وڈ کیاں دی سُوجھ (پروفیسر علی عباس جلالپوری)

پروفیسر علی عباس جلالپوری کی علمی و ادبی حیثیت مسلمہ ہے۔ انھوں نے بہت سے موضوعات اور زبانوں میں کتابیوں تحریر کی ہیں۔ انھوں نے اپنی اس کتاب میں مشہور دانشوروں جن میں ابن الہیثم، مامون رشید، ارسطو، ابن خلدون، سقراط، گوتم بدھ، وارث شاہ جیسے صاحبان عقل و دانش کی دانائی کی باتیں بیان کی ہیں۔ اس کتاب میں عربی اور عبرانی کہاوتیں بھی دی گئی ہیں۔ یہ باتیں ان صاحبان دانش و عقل کی زندگی کے تجربات کا نچوڑ ہیں جن سے استفادہ کر کے بہت کچھ سیکھا جا سکتا ہے۔ یہ کتاب 1980 میں چھپی تھی۔

15۔ رات ویلے اسمان (پروفیسر محمد انور بھٹی)

اس کتاب میں مصنف نے کائنات کے روزانہ ظہور پذیر ہونے والے معجزے یعنی دن سے رات اور رات سے دن میں تبدیل ہونے، چاند کی سطح، چاند گرہن، ستاروں، قطبی ستارے، دمدار ستارے، ٹوٹنے والے تاروں اور کہکشاؤں کے بارے میں اچھی خاصی معلومات مہیا کی ہیں۔ اس کتاب کے میں دن کے رات میں تبدیل ہونے اور کائنات کے بہت سے راز بیان کیے گئے ہیں۔ یہ کتاب 1981 میں چھپی تھی۔

16۔ ساڈی دھرتی (محمد ذکی رضوی)

یہ بھی ایک چھوٹی سی کتاب ہے جس میں مصنف نے زمین کے بارے میں ابتدائی معلومات دی ہیں کہ یہ زمین کب اور کس طرح وجود میں آئی۔ انھوں نے بتایا ہے کہ سب سے پہلے یونان کے مشہور فلسفی 'فیثا غورث' نے زمین کے گول ہونے کی بات کی تھی اور 'ارسطو' نے زمین کے محیط کا حساب لگایا۔ اس کے علاوہ سمندر، زمین، دن رات، موسم، رہن سہن، زمین میں پوشیدہ خزانوں اور نظام شمسی کے خاتمے کے بارے میں معلومات دی گئی ہیں۔ اس طرح یہ چھوٹی سی کتاب بہت بڑی معلومات کا خزانہ ہے۔ یہ کتاب 1981 میں چھپی تھی۔

17۔ چونویں انشائیے (کنول مشتاق)

اس کتاب میں کنول مشتاق نے 1947 سے لے کر 1986 تک لکھے جانے والے مختلف نئے اور پرانے مصنفوں کے انشائیوں میں سے منتخب کردہ انیتس انشائیے شامل کیے ہیں جن کو پاکستان پنجابی ادبی بورڈ نے 1986 میں چھاپا تھا۔ انشائیہ پنجابی میں شامل ہونے والی نسبتاً نئی صنف ہے اس لیے اس طرف رجحان کم ہے اور گنے چنے لکھاری ہی اس صنف پر طبع آزمائی کر رہے ہیں۔ان میں سے ابھی تک کچھ مصنفین کے انشائیوں کا کوئی مجموعہ شائع نہیں ہوا۔ آصف خان نے اس سلسلے میں تحریر کیا ہے؛

> ''ہتھلی کتاب چھاپن دا مقصد ایہہ ہے کہ پنجابی انشائیاں دی اک اجیہی چون پیش کیتی ونجے جیہدے نال پڑھن والیاں نوں انشائیہ لکھیاراں، انشائیے دی ٹور تے ایس کھیتر وچ ہن تائیں ہوئے کم بارے جانکاری ہو سکے۔ چون کار نے کوشش کیتی اے پئی سینیئر تے جونیئر دوہناں لکھاریاں دے انشائیاں دی چون پیش کر سکن تے ایس وچ اوہ ڈاڈھے کامیاب رہے ہن''۔(3)

18۔ سُراں تے سدھاں (تنویر بخاری)

تنویر بخاری پنجابی ادب کے اہم لکھاریوں میں سے ہیں۔ یہ کتاب ادب سے ہٹ کر موسیقی کے سُروں کے بارے میں ہے جس میں تنویر بخاری نے مختلف سُروں کو موضوع بنا کر واضح کیا ہے۔اس کتاب میں ایک ہیجڑے بشیر کی باتیں بھی شامل کی گئی ہیں۔اس کتاب سے معلوم ہوتا ہے کہ سُروں کا موضوع ہوتا ہے اور اس میں کئی قصے کہانیاں بھی ہیں۔اس کتاب میں آٹھ سُروں کو بیان کیا گیا ہے۔ پاکستان پنجابی ادبی بورڈ نے یہ کتاب 1987 میں چھاپی تھی۔ محمد آصف خاں نے اس کتاب پر یوں تبصرہ کیا ہے؛

''تنویر بخاری ہوراں داناں پنجابی زبان دے اُگھے لکھیاراں وچ گنیا متھیا ویندا اہے۔ اوہناں دیاں ڈھیر ساریاں کتاباں چھپ چکیاں ہن جنہاں وچ شاعری تے فوک لور بارے فیلڈ ریسرچ دا کم چوکھا سارا ہے''۔ (4)

19۔ خیر منکھ (حکیم عیسیٰ لاہوری، محمد حنیف گل)

اس کتاب کو دو حصوں میں تقسیم کیا گیا ہے۔ پہلے حصے میں انیس اور دوسرے حصے میں نو ابواب ہیں۔ یہ پنجابی شاعری میں طب پر لکھی جانے والی کتاب ہے جس میں انسانی جسم میں پائی جانے والی بیماریاں اور ان کے علاج کے لیے ادویاء بیان کی گئی ہیں۔ پاکستان پنجابی ادبی بورڈ نے حکیم عیسیٰ لاہوری کی کتاب جس کے مرتب حنیف گل ہیں کو 1993 میں چھاپا تھا۔ اس کتاب کے بارے میں حکیم محمد موسیٰ نے یوں بیان کیا ہے؛

''خطہ پنجاب میں مقیم اطباء کو اس مفید خلائق کتاب سے بہت زیادہ فیض یاب ہونا چاہیے۔ اس لیے کہ حکیم عیسیٰ لہوری نے یہاں کے لوگوں کے حالات اور مزاجوں کو مد نظر رکھ کے یہ تحریر فرمائی ہے''۔ (5)

20۔ محمد صفدر میر دیاں لکھتاں (شیما مجید)

محمد صفدر میر بر صغیر کے علمی اور ادبی حلقوں میں اردو اور انگریزی کے جانے پہچانے لکھاری ہیں۔ ان کے مختلف روپ ہیں جن میں شاعر، نقاد، صحافی، اداکار، ناول نگار اور ڈرامہ نگار شامل ہیں۔ اس کتاب میں ان کے پنجابی زبان میں لکھے

ہوئے آٹھ مضامین، تین نظمیں، چار ڈرامے اور ناول کے دو باب شامل ہیں۔ شیما مجید نے ان کو اکٹھا کر کے پاکستان پنجابی ادبی بورڈ کے ذریعے 2002 میں چھاپا تھا۔ راجار سالو نے 'مڈھلی گل' میں لکھا ہے؛

''پاکستان پنجابی ادبی بورڈ ولوں ایہہ سارا کجھ صفدر میر دیاں لکھتاں دے ناں نال چھاپ کے ایس انملے سرمائے نوں سانبھن دی کوشش کیتی گئی اے''۔(6)

الطاف حسن قریشی نے محمد صفدر میر بارے کجھ باتاں کے عنوان کے تحت لکھا ہے؛

''محترمہ شیما مجید نے جس طرح صفدر صاحب دے انگریزی تے اردو مضموناں نوں اکٹھا کر کے ترتیب دتا سی۔ ہن شیما مجید ہوراں صفدر صاحب دے پنجابی وچ لکھے مضمون، کجھ نظماں تے کجھ ڈرامے وی لبھے نیں تے اوہناں نوں ترتیب دے دتا اے تے ایس لئی میں ذاتی طور تے شیما مجید ہوراں دا احسان مندہاں''۔(7)

21۔ بچیاں دی دیکھ بھال (ڈاکٹر جمال الدین)

یہ چھوٹی سی کتاب بچوں کی نگہداشت اور تربیت کے بارے میں ہے۔ جس میں چھوٹے بچوں کی دیکھ بھال کے طریقے اور ان کی تربیت کے سلسلے میں کیے جانے والے اقدامات بیان کیے گئے ہیں۔ بچوں کی اچھی طرح سے نگہداشت اور تربیت کرنے سے ہی اچھا معاشرہ تشکیل پا سکتا ہے اور یہ کتاب اس سلسلے میں مدد و معاون ثابت ہو سکتی ہے۔

ضلعی تاریخ

1۔ ٹیکسلا (ڈاکٹر سیف الرحمٰن ڈار)

ڈاکٹر سیف الرحمٰن ڈار نے اس کتاب کو آٹھ ابواب میں تقسیم کیا ہے اور ان کے عنوانات 'جغرافیہ تے محل وقوع'، 'تاریخ'، 'فن تعمیر'، 'ہنر تے دستکاریاں'، 'گھر گھر ہستی تے عام ورتوں دا سامان'، 'کتبے تے دوجیاں لکھتاں'، 'ویکھن والیاں تھانواں' اور 'عجائب گھر ٹیکسلا' دیے ہیں۔ ٹیکسلا کا نقشہ اور اس کے نام کے بارے میں تاریخی حوالے بیان کیے ہیں۔ اس کے بعد ٹیکسلا کا جغرافیہ، تاریخ، فن تعمیر، مندر، مذہبی عمارتیں، سٹوپوں، خانقاہوں، دستکاریوں، سنگ تراشی، زیورات، مہروں، تانبے اور کانسی کے برتنوں، سکوں، قدیم رسم الخط اور عام استعمال کے برتنوں کے بارے میں معلومات اکٹھی کی ہیں۔ چوتھے باب 'ہنر تے دستکاریاں' میں آثار قدیمہ کی تصاویر دی گئی ہیں جن میں سٹوپے، برتن، کچی پکی مٹی کے بت، مہریں، زیورات، دھات کے بت، چونے کے بت، سونے کے زیورات، چاندی پر خروشتی لکھائی اور دیگر قدیم عمارتوں کے آثار شامل ہیں۔

اس کتاب کے باب سات کو دو حصوں میں تقسیم کیا گیا ہے۔ پہلے حصے میں ٹیکسلا شہر اور اس کی قابل دید چیزیں بیان کی گئی ہیں جبکہ دوسرے حصے میں ٹیکسلا کے قرب وجوار کے علاقوں کے بارے میں معلومات دی گئی ہیں۔ اس میں ٹیکسلا کے عجائب گھر کے بارے میں بھی معلومات موجود ہیں۔ 1977 میں چھپنے والی یہ کتاب گو زیادہ ضخیم نہیں ہے لیکن اس میں ٹیکسلا جیسی قدیم تہذیب کے امین شہر کے بارے میں اتنی زیادہ معلومات اکٹھی کرنا ڈاکٹر سیف الرحمٰن ڈار کا کمال ہے۔ سبط الحسن ضیغم نے لکھا ہے:

''ڈاکٹر ڈار وی ایسے دھرتی دے ای سپتر نیں تے اوسے پیڑتے چل رہے نیں جیہڑے ایہناں دے بزرگاں نویاں راہواں تے چل کے بنائے سن''۔ (8)

ڈاکٹر سیف الرحمٰن ڈار نے ایک پرانی تہذیب کے نشان ٹیکسلا کے بارے میں بہت اہم اور مکمل معلومات اس کتاب میں اکٹھی کر دی ہیں جس کے ذریعے سے ٹیکسلا کی تاریخ، محل وقوع، جغرافیہ، فن تعمیر، مندر، مذہبی عبادت گاہوں، خانقاہوں، سٹوپوں کے بارے میں جانکاری ہوتی ہے۔ اس کے علاوہ انھوں نے یہاں کی دستکاریاں جن میں سنگ تراشی، مٹی سے بت بنانے اور عام استعمال کے برتن بنانے کے بارے میں بتایا ہے۔ ان کی تحقیق میں پرانی مہریں، تانبے اور کانسی کے برتن، سکے اور قدیم رسم الخط شامل ہیں۔ ڈاکٹر صاحب نے ''ٹیکسلا پر یونانی فن تعمیر کا اثر'' کے عنوان سے اپنا پی ایچ ڈی کا مقالہ لکھا ہے اور یونان کی سیلونیکا یونیورسٹی سے ڈگری حاصل کی ہے۔ اس لیے ٹیکسلا کے بارے میں ان کی کتاب میں موجود معلومات ان کی تحقیق کی بنیاد پر مستند مانی جاسکتی ہیں۔

2۔ ملتان (ڈاکٹر مہر عبدالحق)

اس کتاب میں ملتان شہر کے بارے میں بہت سی معلومات مہیا کی گئی ہیں۔ جیسے کہ ملتان کے نام، مسلمانوں کے زمانے کی تاریخ، انگریزوں کا دورِ حکمرانی، کھیتی باڑی، دستکاریوں، کاروبار، علم و ادب، صحافت، کتابت کے فن، چھاپہ خانے، تفریحی مقامات، مسجدوں اور دیگر عمارات کے بارے میں معلومات موجود ہیں۔ اس کے علاوہ یہاں پر عاشورہ محرم کے بارے میں بھی ذکر موجود ہے۔ 1980 میں چھپنے والی اس چھوٹی سی کتاب میں ڈاکٹر مہر عبدالحق نے ملتان جس کو پیروں کی نگری بھی کہا جاتا ہے کے متعلق خاصی معلومات فراہم کی گئی ہیں۔

3۔ راولپنڈی (پروفیسر انور بیگ اعوان)

راولپنڈی پنجاب کا ایک نہایت اہم شہر ہے اور پروفیسر انور بیگ اعوان نے اپنی اس کتاب میں راولپنڈی کے بارے میں بہت سی معلومات فراہم کی ہیں۔ انھوں نے راولپنڈی کی اہمیت، جغرافیہ، آب و ہوا، اس کے نام اور تاریخ بیان کی ہے۔ اس کے بعد یہاں پر آباد گھکڑ، اعوان، چوہان، بھکڑال قوموں کے بارے میں بتایا ہے۔ راولپنڈی کے بازاروں، ہوٹلوں، ہسپتالوں، تعلیمی اداروں، کھیلوں کے میدانوں، تفریح گاہوں، ادبی محفلوں اور اخبارات وغیرہ کے بارے میں معلومات موجود ہیں۔ اس کتاب میں دربار شاہ چن چراغ، حضرت بری شاہ لطیف (بری امام) اور دوسرے تاریخی مقامات کا بھی تذکرہ

کیا گیا ہے۔ یہ کتاب انتالیس صفحات پر مشتمل ہے جس میں راولپنڈی کے بارے میں خاصی معلومات فراہم کی گئی ہیں۔ یہ کتاب 1980 میں چھپی تھی۔

4۔ ہڑپہ (ڈاکٹر سیف الرحمن ڈار)

ہڑپہ کا شمار ان تاریخی شہروں میں ہوتا ہے جن کے ذریعے سے گمشدہ تاریخ اور تہذیبوں کا سراغ ملتا ہے۔ ساہیوال کے قریب موجود آثار قدیمہ کے بارے میں اس کتاب میں اچھی خاصی معلومات موجود ہیں۔ یہ کتاب 1980 میں چھپی تھی اور اس میں ہڑپہ کے باسیوں، رہن سہن، تعمیرات، فنون لطیفہ، مہروں، لکھائی، مورتیوں اور سامان آرائش سے لے کر قبرستان تک کے بارے میں معلومات فراہم کی ہیں۔ اس کے علاوہ تاریخ کے مختلف ادوار کو بھی بیان کیا گیا ہے۔ جس سے اس خطے میں بسنے والی قدیم تہذیب کے بارے میں آگاہی ملتی ہے۔ انھوں نے گپتا دور سے لے کر مغل دور تک کے عہد کے بارے میں اہم معلومات اس کتاب میں اکٹھی کر دی ہیں۔

5۔ ضلع مظفر گڑھ (پروفیسر سجاد حیدر پرویز)

سجاد حیدر پرویز نے ضلع مظفر گڑھ کے بارے میں تحریر کردہ کتاب کے آغاز میں پنجاب اور ضلع مظفر گڑھ کے نقشے دیے ہیں اور اس کے بعد ضلع مظفر گڑھ کا جغرافیہ اور یہاں کی تاریخ کے تین ادوار بیان کیے ہیں۔

پہلی گل میں سجاد حیدر پرویز نے تحریر کیا ہے؛

> ''یقینی گالھ اے جو ایں جیہے منصوبے فرد واحد دے وس دا روگ نہیں ہوندے بلکہ ایں دے کرن کیتے ہک ادارے دی لوڑ ہوندی اے۔ میڈے وس وچ جو کجھ ہا میں کٹھا کر، ترتیب ڈے، پیش کر ڈتا اے۔ تھی سگدے آوّن آلے دور وچ کوئی مؤرخ یا محقق ایں دے وچ گھاٹے وادھے کرے''۔(9)

جغرافیہ بیان کرتے ہوئے انھوں نے حدود اربعہ، سطح زمین، آب و ہوا، موسم، آبادی، تعلیم، صحت، دریا، نہریں، ڈھنڈیں، ہیڈ اور پل، سڑکیں، ریلوے لائن، صنعتیں، منڈیاں اور ریڈیو کے عنوانات چنے ہیں۔ تاریخ میں ما قبل تاریخ سے 1455 تک کا دور، اس کے بعد 1849 تک کا دور اور تیسرا دور 1987 تک شامل ہیں۔ انھوں نے مظفر گڑھ کے تین قصبوں کی مختصر تاریخ بیان کرتے ہوئے ان کے حالات درج کیے ہیں۔ انھوں نے اس کتاب میں یہاں کی مشہور مذہبی، روحانی، علمی، ادبی، فنی، سیاسی اور سماجی شخصیات کو متعارف کرایا ہے۔ ان شخصیات میں حضرت دین پناہ، حضرت پیر داؤد جہانیاں، حضرت عالم پیر بخاری، شیخ بدہ، حضرت خواجہ عبدالوحد چشتی، حضرت سید حاجی حسین شاہ، حضرت قاضی سلطان محمود، حضرت علامہ عبدالعزیز پرہاڑی، پروفیسر شاکر، پروفیسر شری ہنس، نقش صحرائی، تبسم علی پوری، پرواز رومانی، کیپٹن غلام رسول، پٹھانے خان، سردار عبدالحمید خاں دستی، ملک غلام مصطفےٰ کھر، سردار امجد حمید خاں دستی اور میاں مظفر مہدی ہاشمی شامل ہیں۔

انھوں نے یہاں کے آثار قدیمہ کا ذکر کرتے ہوئے دس قلعوں، دو مقبروں، بیالیس مساجد اور تین مندروں کا تذکرہ کیا ہے۔ اس کے بعد یہاں کے پودوں اور جانوروں کے بارے میں معلومات فراہم کی ہیں۔ یہاں کی ثقافت، جغرافیہ، فصلوں، جانوروں، رسوم و رواج، ذاتوں، پیشوں، عرسوں اور میلوں کے بارے میں معلومات مہیا کی ہیں۔ ادب کے سلسلے میں سرائیکی ادبی جائزہ اور پنجابی ادبی جائزہ کے عنوانات تحت بیان کیا گیا ہے۔ یہاں کی کل 141 ادبی شخصیات کے حالات زندگی اور ان کے کلام کو بھی شامل کیا ہے۔ پاکستان پنجابی ادبی بورڈ نے اس ضخیم کتاب کو 1989 میں چھاپا تھا۔ یہ کتاب ضلع مظفر گڑھ کی تاریخ کے بارے میں مکمل معلومات فراہم کرتی ہے۔

مظفر گڑھ کی بنیاد نواب مظفر خان نے 1794 میں رکھی۔ ضلع مظفر گڑھ کا صدر شہر مظفر گڑھ ہے۔ یہاں کی مقامی زبان سرائیکی ہے۔ ضلع کی تین تحصیلیوں میں علی پور، جتوئی اور کوٹ ادو شامل ہیں۔ ضلع کی زرعی پیداوار میں آم، کپاس، گندم، چنا، چاول، جیوٹ اور کماد شامل ہیں۔ دو دریاؤں کے درمیان اس ضلع کی زمین بہت زرخیز ہے۔ اس ضلع سے تعلق رکھنے والے بہت سے سیاست دانوں نے شہرت پائی، جن میں نوابزادہ نصراللہ خان، غلام مصطفٰی کھر، سردار عبدالقیوم خان، مخدوم سید عبداللہ شاہ بخاری، مخدوم سید ہارون سلطان بخاری، مخدوم سید جمیل احمد حسین بخاری اور جمشید دستی شامل ہیں۔

6۔ ضلع وہاڑی (کلیم شہزاد)

کلیم شہزاد نے اس کتاب میں ضلع وہاڑی یہاں کی تاریخ، جغرافیہ، حدود اربعہ، دریا، آبادی، لباس، فصلوں، کھیلوں اور صنعتوں کے ساتھ ساتھ اہم شہروں کی تاریخ اور آثار قدیمہ کے بارے میں مکمل معلومات اکٹھی کر دی ہیں۔ انھوں نے جغرافیہ بیان کرتے ہوئے اس کا حدود اربعہ بتایا ہے۔ اس کے بعد یہاں زمینوں کی اقسام، فصلوں، صنعتوں، لوگوں، تعلیم، کھیلوں اور دیگر اداروں کا تعارف کرایا ہے۔ ضلع وہاڑی کی تاریخ بیان کرتے ہوئے قبل از تاریخ دور سے لے کر اس کتاب کو تحریر کیے جانے والے دور تک کے حالات بیان کیے ہیں۔ یوں وہاڑی شہر کے بارے میں بھرپور معلومات مہیا کی ہیں۔ اس طرح سے بورے والا کا تاریخی پس منظر بھی بیان کیا ہے۔ یہاں کی اہم جگہوں میں فتح پور، بلند پور، کرم پور، سلطان پور، ملک واہن، لڈن، ٹھینگی، میاں پکھی وغیرہ کا ذکر کیا ہے۔ یہاں کی تاریخی جگہوں میں دیوان صاحب، چاہ فرید، مسجد چہار یار، فتح پور، مقبرہ فتح خان جوئیہ، قلعہ راجا کوٹ، قلعہ عمر پور وغیرہ شامل ہیں۔ انھوں نے یہاں کی مشہور ہستیوں کے سلسلے میں خاصی تحقیق کے بعد چالیس بزرگ ہستیوں کا ذکر کیا ہے جن میں مذہبی، ثقافتی اور سیاسی شخصیات شامل ہیں۔

یہاں کی ثقافت کا ذکر کرتے ہوئے لوک ناچ، کھیل، خوشی غمی کی تقریبات، یہاں پر آباد لوگوں کی ذاتیں، پیشوں کے حوالے سے معلومات مہیا کی ہیں۔ یہاں کے ادب کا جائزہ ''پھلاں بھری چنگیر'' کے عنوان تحت لیا گیا ہے جس میں معروف ادبی شخصیات کے بارے میں چند باتیں کی گئی ہیں اور ساتھ ہی ان کا کلام بھی دیا گیا ہے۔ پاکستان پنجابی ادبی بورڈ نے یہ کتاب 1994 میں چھاپی تھی۔ اس کتاب کے ذریعے سے ضلع وہاڑی کے بارے میں بھرپور معلومات فراہم کرنے کی کوشش کی گئی ہے۔

اضافی معلومات؛

ضلع وہاڑی پاکستان کے صوبہ پنجاب کا ایک ضلع ہے جس کا مرکزی شہر وہاڑی ہے۔ مشہور شہروں میں وہاڑی، بورے والا اور میلسی شامل ہیں۔ 1998ء کے میں کی آبادی کا تخمینہ 20,90,416 تھا۔ ضلع وہاڑی میں عمومی طور پر اردو، پنجابی بولی جاتی ہیں۔ اس کا رقبہ 4364 مربع کلو میٹر ہے۔

ضلع وہاڑی کو انتظامی طور پر تین تحصیلوں بورے والا، میلسی اور وہاڑی میں تقسیم کیا گیا ہے۔اس کے علاوہ تین سب تحصیلیں گگو، کرم پور اور جلہ جیم بھی موجود ہیں۔ 1 جولائی 1976ء کو ضلع ملتان کی تین تحصیلوں (وہاڑی، میلسی، بورے والہ) کو یکجا کر کے ضلع وہاڑی بنایا گیا جس کا صدر مقام وہاڑی شہر ہے۔ ضلع وہاڑی دریائے ستلج کے دائیں کنارے پر واقع ہے اور اس کی جنوبی سرحد کے ساتھ ساتھ دریائے ستلج بہتا ہے۔ 1998ء کی مردم شماری کے مطابق ضلع وہاڑی کی 94 فیصد آبادی پنجابی بولنے والی ہے۔ان 94 فیصد میں سے 83 فیصد ماجھی لہجہ بولنے والوں کی ہے۔ ضلع وہاڑی کے تقریباً تمام حصوں میں پنجابی بولی جاتی ہے۔ سرائیکی یا ملتانی لہجے کی پنجابی تحصیل میلسی کے کچھ حصوں میں بولی جاتی ہے۔ ضلع کی کل آبادی کا 11 فیصد پنجابی کا لہجہ سرائیکی بولتے ہیں جبکہ باقی 6 فیصد دیگر زبانیں (پشتو وغیرہ) بولتے ہیں۔

7۔ ضلع گجرات (احمد حسین قریشی قلعداری)

احمد حسین قلعداری نے اس کتاب میں ضلع گجرات کے بارے میں بھرپور معلومات فراہم کی ہیں۔انھوں نے اس کتاب کے پہلے حصے کو بارہ ابواب میں تقسیم کیا ہے پہلا باب جغرافیہ، حدود اربعہ، آب و ہوا، موسم، یہاں کی زمینوں کی اقسام،اس کی چاروں اطراف کی حدود، نہروں، ندی نالوں کے متعلق ہے۔دوسرا اور تیسرا باب دنیا کی ابتدا سے لے کر قبل از تاریخ سے متعلقہ ہے۔اس سے اگلے تین ابواب میں یہاں پر آریاؤں کی آمد، سکندر اعظم کے دور اور چوہان خاندان کے بارے میں بیان کیا گیا ہے۔ ساتویں، آٹھویں اور نانویں ابواب مسلمانوں کی آمد کے دور سے لے کر مغل بادشاہوں کے آخری دور سے متعلق ہیں۔ان میں عہد سلاطین دہلی سے لے کر آخری مغل بادشاہوں تک کے ادوار کا تذکرہ کیا گیا ہے۔ دسویں باب میں یہاں پر سکھ حکمرانی کے بارے میں جانکاری دی گئی ہے۔ گیارہواں باب انگریزی دور سے متعلقہ ہے۔ بارھویں باب میں ''گجرات بعہد اسلامیان پاکستان'' کے عنوان کے تحت بات کی گئی ہے۔

معاشرت کے باب کو مزید چھ ابواب میں تقسیم کیا گیا ہے۔ پہلے حصے میں یہاں کا جغرافیہ، آب و ہوا، زمینوں کی اقسام، نہروں اور ندی نالوں کے بارے میں معلومات دی گئی ہیں۔ دوسرے باب میں یہاں پر موجود آثار قدیمہ، پرانی قبروں، تاریخی مقامات، کنوؤں، تالابوں، نباتات، معدنیات، جانوروں کی اقسام اور مذہبی عبادت گاہوں کی آگاہی دی گئی ہے۔ تیسرا باب یہاں کی معاشرت سے متعلقہ ہے جس میں رسوم و رواج، میلوں، عرسوں، لوک ناچ، کھیلوں، ذاتوں، لباس اور زیورات کو متعارف کرایا گیا ہے۔اس سے اگلا باب 'بولی' کے حوالے سے ہے جس میں یہاں کے مختلف لوک

گیتوں کی اقسام بتائی گئی ہیں۔ یہاں کے قدیم علمی ماحول اور تاریخ کا جائزہ پانچویں باب میں دیا گیا ہے جس سے یہاں کی علمی اور تاریخی حیثیت کا اندازہ ہوتا ہے۔ یہاں کی شخصیات کے تذکرے کے لیے اگلا باب تذکرہ شخصیات' ہے جس میں گجرات میں پنجابی ادب، ادیبوں، شعرا اور مشاہیر کا تذکرہ شامل ہے۔ یہ 1104 صفحات پر مشتمل ایک ضخیم کتاب ہے جو کہ 1995 میں شائع کی گئی تھی۔

گجرات کی اضافی معلومات درج ذیل ہیں۔

گجرات کا شمار پنجاب کے قدیم شہروں میں ہوتا ہے۔ برطانوی تاریخ دان Gen. Cunningham کے مطابق گجرات شہر 460 قبل مسیح میں راجہ بچن پال نے بسایا تھا اور اس کا نام اودھے نگری رکھا تھا جس کو سیالکوٹ کی رانی گوجراں نے فتح کیا اور اس کا نام گجر نگری رکھا تھا جو بعد میں گجرات ہو گیا۔ 1580 میں اکبر اعظم نے یہاں پر ایک قلعہ تعمیر کرایا تھا۔ اسکندر اعظم کی فوج کو ریاست کے راجہ پورس سے دریائے جہلم کے کنارے ٹبہ مونگ کے مقام پر زبردست مقابلے کا سامنا کرنا پڑا۔ مغلیہ دور میں، مغل بادشاہوں کا کشمیر جانے کا راستہ گجرات ہی تھا۔ کشمیر سے واپس آتے ہوئے شہنشاہ جہانگیر کا انتقال راستے میں ہو گیا تھا لیکن بدامنی سے بچنے کیلیے انتقال کی خبر کو چھپایا گیا اور اس کی انتڑیاں نکال کر گجرات میں ہی دفنا دی گئیں۔ جہاں اب ہر سال شاہ جہانگیر کے نام سے ایک بڑا میلہ لگتا ہے۔ انگریزوں اور سکھوں کے درمیان دو بڑی لڑائیاں اسی ضلع میں لڑیں گئیں، جن میں چیلیانوالہ اور گجرات کی لڑائیاں شامل ہیں اور گجرات کی لڑائی جیتنے کے فوراً بعد انگریزوں نے 22 فروری 1849 کو پنجاب کی جیت کا اعلان کر دیا۔ شہر کے محکمانہ نظام کی بنیاد 1900 میں برطانوی سامراج نے ڈالی۔ (10)

8۔ ضلع بہاولپور (پروفیسر دلشاد کلانچوی)

پروفیسر دلشاد کلانچوی نے ''کجھ میڈے ولوں'' میں اس کتاب کو تحریر کرنے کے آغاز اور تکمیل کے دوران پیش آنے والے حالات بیان کرنے کے بعد جغرافیہ کے عنوان میں ''جغرافیائی گالہیں'' میں ضلع بہاولپور کا نقشہ، عباسی نوابین، قدیم زیورات، ملبوسات، جنگی سامان، آثار قدیمہ، مقبروں، قبروں، مسجدوں، محلات، قائداعظم میڈیکل کالج، ہائی سکول، وکٹوریہ ہسپتال، سنٹرل لائبریری اور کچھ شخصیات کی تصاویر دیں ہیں۔ اس کے بعد مشہور شہر، تفریح گاہوں، قابل

دید عمارتوں، ذرائع آمد و رفت، تعلیمی کیفیت، فصلوں، پودوں اور جانوروں کے بارے میں معلومات مہیا کی ہیں۔ تاریخ بیان کرتے ہوئے انھوں نے قدیم تاریخ سے آغاز کیا ہے اس کے بعد عرب مسلمانوں کی فتوحات اور عباسیوں کی آمد بیان کرنے کے بعد یہاں کے آثار قدیمہ کا تذکرہ کیا ہے۔ اس سے اگلے ابواب ''وسوں''، ''ثقافت''، ''زبان'' اور ''ادب'' کے عنوان سے ہیں۔ انھوں نے تقریباً ساٹھ کے قریب شعرا کے بارے میں معلومات اور ان کا کلام دیا ہے۔

ضلع بہاولپور کی تاریخ، ثقافت، ادب، جغرافیے، ذاتوں، علمی و ادبی شخصیتوں، فصلوں، جانوروں، پیشوں، مشہور شہروں وغیرہ کے بارے میں بھرپور معلومات کی حامل یہ ایک بہت اچھی کتاب ہے جس کو پاکستان پنجابی ادبی بورڈ نے 1997 میں چھاپا تھا۔ یہاں پر جدید ادب کی تخلیق کے بارے انھوں نے نثری ادب، شعری ادب، رسالے، اخبارات اور علمی و ادبی محفلوں کا تذکرہ کیا ہے۔ انھوں نے شاعروں کے حالات بتائے ہیں اور ان کے کلام کے بارے میں مفید معلومات دی ہیں۔ کتاب کے آخر میں اس کتاب کو مرتب کرنے کے سلسلے میں استعمال کی گئی کتابوں کی تفصیل دی ہے۔ محمد آصف خاں نے اس کتاب کے بارے میں یوں لکھا ہے؛

''تہاڈے ہتھلی کتاب پروفیسر دلشاد کلانچوی مرحوم نے لکھی۔ ایہناں کتاباں راہیں پنجاب دی تاریخ، ثقافت تے ادب دے کئی اجیہے پکھ ساڈے سامنے آئے ہن۔ جیہڑے ساڈیاں اکھاں توں اوہلے سن۔ سانوں ہرکھ ایس گل دا ہے کہ پروفیسر ہوری اپنی حیاتی وچ ایہہ کتاب چھاپے چڑھدی نہ ویکھ سکے''۔(11)

بہاولپور کے بارے میں اضافی معلومات یوں ہیں؛

ضلع بہاولپور برطانوی ہند میں ایک ریاست تھی۔ 1947ء میں تقسیم ہند کے بعد اس نے پاکستان سے الحاق کیا لیکن 1955ء تک اس کی ریاستی حیثیت برقرار رہی۔ ریاست بہاولپور دریائے ستلج اور دریائے سندھ کے کنارے پر واقع ہے جو تین اضلاع بہاولپور، بہاولنگر اور رحیم یار خان پر مشتمل تھی۔ ریاست بہاولپور کی بنیاد 1690 ء میں

بہادر خان دوئم نے رکھی۔ نواب محمد بہاول خان سوئم نے برطانوی حکومت سے پہلا معاہدہ کیا جس کی وجہ سے ریاست بہاولپور کو خود مختار حیثیت حاصل ہوئی۔

بہاولپور پر حکمرانی کرنے والے خاندان کے بارے میں کہا جاتا ہے کہ ان کا نسب عباسی خلفاء سے جاملتا ہے جبکہ کچھ کی رائے ہے کہ ان کا تعلق سندھ کے داؤد پوتا خاندان سے ہے، تاہم اتنا ضرور ہے کہ بہاولپور کا نواب خاندان سندھ سے آکر اس علاقے میں آباد ہوا تھا اور انھوں نے یہاں آکر کھیتی باڑی کو اپنایا اور اپنے تعلقات اور قابلیت کی بناء پر ایک وسیع جاگیر بنائی تاہم ریاست بہاولپور کی بنیاد 1690ء میں نواب بہادر خان سوئم نے رکھی مگر اس وقت اسے خود مختار ریاست کی حیثیت حاصل نہ تھی۔ برصغیر میں انگریزوں کی حکومت قائم ہوئی تو نواب بہاول خان سوئم نے انگریزوں سے معاہدہ کیا جس کے بعد بہاولپور کو بطور خود مختار ریاست کے تسلیم کر لیا گیا اور نواب بہاول خان سوئم کے نام پر ریاست کا نام بہاولپور رکھا گیا۔ ریاست کا رقبہ 45911 مربع کلومیٹر تھا اور اس کا دارالخلافہ بہاولپور سٹی قرار پایا۔

بہاولپور کے پہلے حکمران نواب بہادر خان سوئم نے 1702ء تک صرف بارہ سال حکومت کی۔ اس کے بعد ان کے بیٹے نواب مبارک خان اوّل نے اقتدار سنبھالا اور 1723ء تک حکومت کی۔ پھر نواب صادق محمد خان اوّل حکمران بنے، انھوں نے 1746ء تک حکمرانی کی۔ نواب محمد بہاول خان نواب بنے تو انھوں نے 1750ء تک راج کیا۔ اس کے بعد نواب مبارک خان دوئم نے 1772ء تک اقتدار کیا۔ محمد بہاول خان دوئم نواب بنے 1809ء تک، صادق محمد خان دوئم 1826ء تک اور اس کے بعد محمد بہاول خان سوئم نے نواب بنتے ہی انگریزوں سے مل کر ریاست کو حقیقی معنوں میں مضبوط کیا۔ یوں نوابوں کا یہ سلسلہ چلتا رہا اور بتدریج صادق خان سوئم، فتح محمد خان، محمد بہاول خان چہارم، صادق محمد خان چہارم اور محمد بہاول خان پنجم نے ریاست پر حکمرانی کی۔ ریاست کے آخری نواب صادق محمد خان پنجم 1907ء سے 1955ء تک برسر اقتدار رہے۔

ریاست کے صرف دو وزرائے اعظم ہوئے۔ سر رچرڈ مارش کرافٹون 1942ء سے 1947ء تک اور پاکستان بننے کے بعد اے آر خان 1955 تک وزیر اعظم رہے۔ ریاست بہاولپور دو مرتبہ بڑی سلطنتوں کے زیر سایہ رہی۔ پہلا دور مغلوں کا ہے۔ 1802ء سے 1858ء تک ریاست کے حکمرانوں کو مغل بادشاہوں کی آشیر باد حاصل تھی اور ریاست کے حکمران بھی مغل بادشاہوں سے مکمل تعاون کرتے تھے۔ اس کے بعد انگریزوں کا دور شروع ہوا تو ان کے ساتھ کیے گئے

معاہدوں پر مکمل عمل درآمد کیا گیا۔ 1947ء تک ریاست کو انگریز حکمرانوں کی طرف سے ہر طرح کی حمایت حاصل تھی۔ جب برصغیر کا بٹوارہ ہوا تو ریاست بہاولپور کے نواب صادق محمد خان پنجم نے پاکستان میں شمولیت کا اعلان کیا، اس کے ساتھ ساتھ پاکستانی حکومت سے ہر ممکن تعاون کیا حتیٰ کہ پاکستان کے سرکاری ملازمین کی پہلی تنخواہ نواب صادق محمد خان نے ریاست کے خزانے سے ادا کی۔

نواب صادق محمد خان نے حکومت پاکستان کے ساتھ 1951ء میں معاہدہ کے تحت ریاست بہاولپور کو پاکستان میں ضم کر دیا اور اس کو صوبے کی حیثیت دے دی گئی۔ نواب صاحب کو صوبے کا سرپرست بنایا گیا اور ان کے لیے نواب کا لقب برقرار رکھا گیا۔ صوبہ بننے کے بعد اسمبلی قائم کی گئی جس کے چار سال بعد ون یونٹ نظام کے تحت صوبہ بہاولپور کو مغربی پاکستان میں ضم کر دیا گیا، یوں ریاست اور صوبہ بہاولپور اپنی اصل حیثیت کھو بیٹھا۔ ملک میں جب ون یونٹ ختم کیا گیا تو اصولی طور پر تمام صوبوں کی طرح صوبہ بہاولپور کو بھی بحال کر دیا جانا چاہیے تھا مگر ایسا نہیں کیا گیا اور اسے پنجاب کا حصہ قرار دے دیا گیا۔

ریاست بہاولپور نے یکم جنوری 1945ء کو برطانوی حکومت کے ڈاک ٹکٹ کی بجائے سرکاری استعمال کے لیے اپنے ٹکٹ جاری کیے۔ یکم دسمبر 1947 کو حکمران خاندان کی حکمرانی کے 200 سال پورے ہونے پر یادگاری ڈاک ٹکٹ جاری کیا گیا جس پر نواب بہاول خان کی تصویر اور لفظ بہاولپور لکھا ہوا تھا۔ یکم اپریل 1948 کو مختلف نوابوں اور عمارات کی تصاویر پر مشتمل ڈاک ٹکٹ جاری کیے گئے۔ یونیورسل پوسٹل یونین کی پچھترویں سالگرہ کے موقع پر 1949ء میں ڈاک ٹکٹ جاری کرنے کے بعد سے ریاست نے مزید ٹکٹ جاری نہیں کیے اور صرف پاکستان کے جاری کردہ ٹکٹ ہی استعمال ہو رہے ہیں۔

بہاولپور کی جدید عمارات میں لائبریری، سٹیڈیم، صادق ایجرٹن کالج، اسلامیہ یونیورسٹی بہاولپور، قائد اعظم میڈیکل کالج، وکٹوریہ ہسپتال، انجینئرنگ کالج اور طلبہ و طالبات کے لیے متعدد کالج اور فنی ادارے شامل ہیں۔ بہاولپور کا چڑیا گھر اور سٹیڈیم بہت شہرت کے حامل ہیں۔ موجودہ بہاولپور ڈویژن میں تین اضلاع بہاولپور، بہاول نگر اور رحیم یار خان شامل ہیں۔ بہاولپور تجارت اور معاشی سرگرمیوں میں بھی اہمیت کا حامل ہے۔ یہاں گندم، کپاس، چاول، کھجور اور آم

بکثرت پائے جاتے ہیں۔ زرعی لحاظ سے بہاولپور کو ایک زرخیز ترین علاقہ شمار کیا جاتا ہے، یہاں سیاحت کے لیے چولستان صحرا، قلعہ دراوڑ، اوچ شریف کا مزار اور صادق محل قابل ذکر ہیں۔

تہذیب و ثقافت کے حوالے سے بہاولپور کی تاریخ بہت پرانی ہے۔ صادق گڑھ محل انتہائی خوبصورت اور چمک دمک کا حامل محل ہے۔ یہ محل بہاولپور کے بادشاہ نواب صادق محمد خان چہارم نے تعمیر کروایا۔ اس وقت اس محل کی تعمیر پر 15 لاکھ روپے کی لاگت آئی اور مکمل ہونے میں 10 سال کا عرصہ لگا۔ اس محل میں ایک بہت بڑا سرسبز لان موجود ہے اور عمارت کے وسط میں ایک بہت خوبصورت گنبد بھی موجود ہے۔ نواب صبح صادق نے یہ محل اپنی بیوی کے لیے تعمیر کروایا تاہم انھوں نے یہاں صرف ایک رات بسر کی۔ جب نواب کی بیوی نے محل کے بالکونی سے محل سے ملحقہ قبرستان کو دیکھا تو اس نے یہاں دوسری رات بسر کرنے سے انکار کر دیا۔ نواب بہاولپور دوئم نے ایک خوبصورت محل تعمیر کرایا جسے نور محل کہتے ہیں، اب یہ تاریخی محل سرکاری دفاتر کے لیے استعمال کیا جاتا ہے۔(12)

9۔ ضلع خوشاب (امتیاز حسین امتیاز)

امتیاز حسین امتیاز کی تحریر کردہ کتاب میں خوشاب کے نقشے کے بعد یہاں کا حدود اربعہ، آب و ہوا، آبادی، فصلیں، صنعتیں، معدنیات، قصبے، ثقافت اور پرانی عمارتوں کے بارے میں بیان کیا گیا ہے۔ اس کتاب میں کچھ پرانی مسجدوں، درباروں، قدیم عمارتوں، گوردواروں، مندروں، مقبروں، شیر شاہ سوری کی بنائی ہوئی باؤلی، ریلوے سٹیشن، بدھ مت کے مندر اور کچھ شخصیات کی تصاویر موجود ہیں۔ چند معروف سیاسی، سماجی اور تاریخی شخصیات کا تعارف بھی دیا گیا ہے۔

انھوں نے ایک باب میں یہاں کی مذہبی، روحانی، علمی، ادبی اور سیاسی شخصیات کو موضوع بنایا ہے اور تقریباً ستر کے قریب ادبی شخصیات کے بارے میں معلومات اور ان کا کلام دیا ہے۔ ان میں پیلو، احمد ندیم قاسمی، واصف علی واصف اور شاکر شجاع آبادی نمایاں ہیں۔ اس کے علاوہ خوشاب کی تاریخ کے ساتھ مختلف ٹونے ٹوٹکے، انسانوں اور جانوروں کی بیماریوں کے علاج بھی بتائے گئے ہیں۔ انھوں نے خوشاب کے ادب کے تین ادوار بھی بیان کیے ہیں۔ اس کتاب میں ادبی جائزے کے ساتھ یہاں کی مقامی بولیوں کے نمونے بھی شامل ہیں۔ یہ کتاب 1999 میں چھپی تھی۔ اس کے علاوہ خوشاب

کے سات قصبوں، تحصیل نور پور کے دو قصبوں اور تحصیل نوشہرہ کے گیارہ قصبوں کے بارے میں معلومات بیان کی گئی ہیں۔ خوشاب میں پائی جانے والی پرانی عمارات قلعہ امب شریف، قلعہ اکراند، مسیت میاں بگڑ، مکتب حضرت مہر علی شاہ، کوروپانڈو کا میدان جنگ اور دیگر تاریخی عمارات کے بارے میں بتایا ہے۔

خوشاب کی شخصیات میں بلوچ سرداروں، مٹھاٹوانہ کے سرداروں، سون سیکسر کے اعوان سرداروں کے بارے میں بتایا ہے۔ اس کے علاوہ مختلف مذہبی، روحانی، علمی، ادبی، سماجی اور سیاسی شخصیات کا تعارف دیا گیا ہے۔ انھوں نے یہاں کی ثقافت کو بیان کرتے ہوئے میلوں، عرسوں، لوک گیتوں، لوک ناچوں، ذاتوں، پیشوں، رسموں، روایتوں کے بارے میں بیان کیا ہے۔ اس کتاب میں بچوں اور بڑوں کی بیماریوں، جانوروں کی بیماریوں کا علاج کرنے کے طریقے بھی بیان کیے ہیں۔ انھوں نے یہاں کا ادبی جائزہ بھی پیش کرتے ہوئے مختلف بولیوں کے نمونوں کو پیش کیا ہے اور ادبی مشاہیر کے تین ادوار بتائے ہیں۔ اس طرح سے خوشاب کا مکمل ظاہری نقشہ دینے کے ساتھ ساتھ ثقافتی اور علمی پس منظر اور تاریخ بھی بیان کی ہے۔

10۔ ضلع ملتان (ڈاکٹر نوید شہزاد)

ڈاکٹر نوید شہزاد نے ضلع ملتان کے بارے میں نہایت تحقیق سے حقائق اکٹھے کر کے اس کتاب میں بیان کیے ہیں جن کو پڑھ کر ملتان کی تاریخ و ثقافت کے بارے میں مکمل آگاہی حاصل ہو جاتی ہے۔ پاکستان پنجابی ادبی بورڈ نے اس کو 2001 میں شائع کیا تھا۔ محمد آصف خاں نے اس کتاب کے بارے میں یوں تحریر کیا ہے؛

> ''ملتان دے 235 لکھیاراں بارے سنجان اکٹھی کر کے اوہناں وڈا معرکہ ماریا ہے۔ اسیں ضلعیاں بارے پہلاں جنیاں وی کتاباں چھاپیاں ہن، اینی گنتی وچ لکھیار کسے وی کٹھے نہیں کیتے۔ ایہہ اوہناں دی محنت، لگن تے اپنے موضوع نال نیاں کرن دا سبھ توں وڈا ثبوت اے''۔(13)

ڈاکٹر نوید شہزاد کی شاعری کی پانچ کتابیں چھپ چکی ہیں۔یوں وہ پنجابی ادب کی جانی پہچانی شخصیت ہیں۔انھوں نے ملتان کے جغرافیے، حدود، آبادی، موسم، دریا، نہروں، پودوں، فصلوں، جانوروں، آثار قدیمہ، رسوم ورواجوں، میلوں، عرسوں اور تاریخ کے بارے میں معلومات کو اس کتاب میں اکٹھا کر دیا ہے۔اس کے علاوہ انھوں نے اہم روحانی شخصیات، ملتانی ثقافت، لوک ناچوں، پیشوں، اوزاروں، ذاتوں اور کھانے کی چیزوں کو بھی بیان کیا ہے۔اس کتاب کی خاص بات یہ ہے کہ ڈاکٹر نوید شہزاد نے 1188ء سے لے کر اس کتاب کے چھپنے کے وقت تک کے مصنفوں اور شعرا کے حالات زندگی اور نمونہ کلام بھی دیا ہے۔

اس کتاب میں مختلف مزارات، مساجد، عید گاہ، قبروں، مینارہ، مندر، قلعہ، استاد اور شاگرد کے تعزیے، باب القاسم، لائبریریوں، ریلوے سٹیشن، گھنٹہ گھر، نشتر میڈیکل کالج، محل نواب مظفر خان اور معروف شخصیات کی تصاویر کے ساتھ دستکاریوں کی تصاویر شامل ہیں۔ شادی کی مختلف رسومات کو 33 عنوانات سے بیان کیا گیا ہے۔پیدائش اور وفات سے متعلقہ مختلف رسوم بھی بیان کی گئی ہیں۔

ملتان کی روحانی ہستیوں میں حضرت شیخ بہاؤالدین ذکریا ملتانی، حضرت شیخ صدر الدین عارف، حضرت شاہ رکن عالم ملتانی، حضرت شاہ یوسف گردیز، حضرت سید موسی پاک شہید، حضرت سید موسی پاک دین، حافظ عبید اللہ ملتانی، خواجہ پیر علی مردان اویسی، مخدوم سید محمد غوث ثانی سخی شاہ حبیب اللہ، شاہ دانا شہید، شاہ حسین آگاہی، سید عطااللہ شاہ بخاری، حضرت حافظ دیوان اور دیگر کا تذکرہ کیا گیا ہے

ان کی کتاب میں دی گئی معلومات سے ہٹ کر کچھ مزید حقائق درج ذیل ہیں۔

ملتان جنوبی پنجاب میں دریائے چناب کے کنارے واقع آبادی کے لحاظ سے پاکستان کا پانچواں بڑا شہر ہے۔یہ ضلع اور تحصیل ملتان کا صدر مقام بھی ہے۔ ملتان کا شمار دنیا کے قدیم ترین شہروں میں ہوتا ہے۔ بہت سے شہر آباد ہوئے مگر گردش زمانہ کا شکار ہو کر صفحہ ہستی سے مٹ گئے لیکن شہر ملتان ہزاروں سال پہلے بھی تھا اور آج بھی موجود ہے۔ حضرت بہاوالدین ذکریا ملتانی نے کہا تھا؛

ملتان ما بجنت اعلیٰ برابراست   آہستہ پابنہ کہ ملک سجدہ می کنند

ملتان کے بارے جس ہستی تے یہ لافانی شعر کہاوہ ہستی خود کیا تھی،اس کا مقام ومرتبہ کیا تھااوراس نے انسانیت کے لیے کیاکیاخدمات سرانجام دیں؟اس تفصیل کیلیے ایک مضمون نہیں بلکہ کئی کتب کی ضرورت ہے۔

ملتان صوبہ پنجاب کا ایک اہم ضلع ہے۔اس کا کل رقبہ 10ہزار8سو مربع میل ہے۔1998ء کی مردم شماری کے مطابق اس ضلع کی آبادی40لاکھ68ہزار تھی۔اس ضلع میں آبادی کے اضافے کی شرح3.13 ہے۔یہاں کے 73 فیصد لوگ دیہات میں رہتے ہیں۔اس کے شہری علاقوں میں شرح خواندگی 60.90 فیصد جبکہ دیہاتی علاقوں میں 29.47فیصد ہے۔یہاں کے پچیس فیصد لوگوں کاذریعہ معاش زراعت ہے۔کبیر والہ،شجاع آباداور ملتان اس کی تین تحصیلیں ہیں۔اس ضلع میں 1629 گاؤں ہیں۔بارش کی سالانہ اوسط 152 ملی میٹر ہے۔اس ضلع میں جنگلات کا رقبہ 9327 ہے۔علاقے کو سیر اب کرنے کیلیے تین دریاؤں راوی،ستلج اور چناب سے نہریں نکالی گئی ہیں جن میں میلسی نہر،لوئر باری آب اور نیلی بار قابل ذکر ہیں۔زرعی پیداوار میں گندم،کپاس،چاول اور گنا قابل ذکر ہیں۔آم،سنگترہ، لیموں،انار اور کھجوراہم پھل ہیں۔اس ضلع میں بہت سے بڑے صنعتی یونٹ ہیں۔

تاریخی اعتبار سے ملتان نہ صرف پاکستان بلکہ جنوبی ایشیاء کا سب سے قدیم شہر ہے۔اسے "اولیاء کا شہر" کہا جاتا ہے۔ماضی میں یہ شہر سنبھا پورہ،باغاپور،لنبھاپورہ اور مولاس کے نام سے پکارا جاتا تھا۔ملتان کا ذکر شاہنامہ فردوسی میں بھی ہے جس میں یوں لکھا ہے کہ یہ شہر چھ سو قبل مسیح میں ایک صوبہ تھا۔ہندوؤں کی روایات کے مطابق ملتان ان کی دیوی اور دیوتاوں کا مسکن رہا ہے۔ملتان کو اصل شہرت اسلامی عہد کے حکومت میں حاصل ہوئی۔نوجون عرب سپہ سالار محمد بن قاسم نے اسے 712 میں فتح کیا۔یہاں قریباً دس ہزار عرب آباد کیے اور ایک جامع مسجد تعمیر کروائی۔

ملتان کو یہ فخر حاصل ہے کہ اہل تصوف کے تین روحانی سلسلے سہروردیہ،چشتیہ اور قادریہ یہیں سے پورے براعظم میں پہنچے۔سہروردی سلسلہ حضرت بہاوالدین ذکریاملتانی سے،چشتیہ سلسلہ باب فرید گنج شکرؒ سے اور قادری سلسلہ حضرت مخدوم رشید حقانی سے چلا۔ملتان شہر کو "مدینتہ الاولیا" اس لیے کہا جاتا ہے کہ یہاں اکابر اولیائے کرام کے مزارات ہیں جن میں حضرت بہاوالدین ذکریا، شیخ صدر الدین عارف، شیخ رکن دین، حضرت شمس تبریزی،شاہ گردیز،شاہ حسین آگاہی،سید موسیٰ پاک شہید اور سلطان احمد قتال قابل ذکر ہیں۔

ملتان میں بہت سے قدیم دروازے ہیں جن کے نام حرم گیٹ، بوہڑ گیٹ، دہلی گیٹ، دولت گیٹ اور پاک گیٹ ہیں۔ پاک گیٹ اس وجہ سے ہے کہ اس سے 300 فٹ اندر کی طرف ایک بزرک موسیٰ پاک کا مزار ہے۔

11۔اعوان کاری (پروفیسر شاہین ملک)

یہ کتاب اعوان قوم کی تاریخ، تہذیب، ثقافت، لوک ورثے، زبان، کہاوتوں، کھیلوں، کہانیوں اور پہیلیوں کے بارے میں معلومات فراہم کرتی ہے۔اس کے پہلے حصے میں نثر شامل ہے جس میں وادی سون کے علاقے میں آباد اعوان قوم کی ادبی کوششوں کو بیان کیا گیا ہے۔اس میں ضلع چکوال اور اس کے قرب وجوار میں آباد اعوان قوم کی تاریخ و تہذیب کے بارے میں معلومات مہیا کی گئی ہیں۔ اعوانوں کی تاریخ بیان کرنے کے بعد ان کی تہذیب و ثقافت کے کچھ رنگ بیان کیے ہیں اور یہاں کی بولیوں کے نمونے بھی دیے ہیں۔ یہاں کی دیگر اقوام کی طرح اعوان قوم کا لوک ورثہ، کہانیاں، کھیل، کہاوتیں، بجھارتیں، دعائیں بھی اپنا الگ رنگ اور انداز رکھتی ہیں جن کو بہت عمدہ طریقے سے درج کیا گیا ہے۔اس کے بعد اعوان قوم کے نامور افراد کا ذکر کیا گیا ہے۔ یہ کتاب نہ صرف اعوان قوم بلکہ چکوال اور تلہ گنگ کے علاقوں کے بارے میں بھی معلومات مہیا کرتی ہے۔ یہ ایک ضخیم کتاب ہے جس کو پاکستان پنجابی ادبی بورڈ نے 1987 میں چھاپا تھا۔

اضافی معلومات؛

اعوان قوم پنجاب کے مغربی حصوں میں آباد ہے جو یہ دعوی کرتی ہے کہ وہ چوتھے خلیفہ حضرت علی کرم اللہ کی اولاد ہیں۔اعوان قوم کوہ نمک کے علاقے وادی سون سکیسر وغیرہ میں ساتویں صدی عیسوی میں عرب حملہ آوروں کے دور میں آئی تھی۔ اعوان قوم کے جد امجد حضرت عون قطب شاہ ایک نہایت درویش، صوفی، دلیر مجاہد تھے۔ آپ ۵۲۵ھ میں تبلیغ اسلام کے لیے بحکم جناب شیخ عبد القادر جیلانی ہندوستان آئے۔ عون قطب شاہ کی ہندوستان آمد کے ساتھ ہی پہلا معرکہ دھن کوٹ کمیلا بھنگ خیل نزد کالا باغ ہوا۔ عون قطب شاہ کامیاب ہوئے اور مخالف نے اسلام قبول کیا بعد میں سکیسر راجگان کو زیر کیا اور گجرات تک چلے گئے۔ واپسی پر تلہ گنگ کے مقام پر اعوان محل تیار کیا، اس کا تذکرہ آئینہ اکبری میں موجود ہے۔ وادی سون سکیسر میں داخل ہونے والے اعوان خاندان کے پہلے بزرگ کا نام گوہر شاہ عرف گورڑا تھا۔

خوشاب سے آنے والی سڑک پر نورے والے سے تین میل اوپر وادی سون سکیسر کے منہ پر ایک مقام کو دادا گورڑا کہتے ہیں کیونکہ وہاں پر دادا گورڑا (گوہر شاہ) نے قیام کیا تھا۔ آج تک وادی سون سکیسر کو اعوانوں کے گڑھ کی حیثیت حاصل ہے۔

تماہی پنجابی ادب

پاکستان پنجابی ادبی بورڈ کے مقاصد اور اہداف میں ایک ادبی اور علمی حیثیت کے حامل رسالے کا اجرا بھی شامل تھا جس میں متفرق قسم کے مضامین و شاعری شائع کی جائے گی۔ اس طرح پنجابی ادب کے قارئین میں اضافے کے ساتھ ساتھ نئے لکھنے والوں کی بھی حوصلہ افزائی ہو گی اور نئے لوگ پنجابی لکھنے اور پڑھنے کی طرف مائل ہوں گے۔ نئے لکھاریوں کی صورت میں پنجابی زبان کے ادب میں نئے خیالات اور انداز کا بھی اضافہ ہو گا اور اس طرح سے ہر طبقہ فکر کے لوگ پنجابی زبان کی ترویج و ترقی میں اپنا حصہ ڈال سکیں گے۔ ناگزیر وجوہات کی بنا پر بارہ سال کے بعد جنوری 1987 میں ''پنجابی ادب'' کے نام سے ایک رسالہ نکالا گیا اور محمد آصف خاں کو اس کا ایڈیٹر مقرر کیا گیا کیونکہ وہ 1960 سے 1970 تک مہینہ وار ''پنجابی ادب'' شائع کرنے کا تجربہ رکھتے تھے۔ محمد آصف خاں نے ''پنجابی ادب'' کے بارے میں لکھا ہے؛

> عالمی ادب دے نال نال اپنیاں پاکستانی بولیاں جیویں سندھی، پشتو، بلوچی توں ترجے لوڑیندے ہن۔
> اک دوجے دی سوچ توں جانو تھیون نال سانجھ پڑ موکلا ہوندا ہے۔ سانجھ ودھدی اے۔ سانجھ ودھے
> تاں دوجے دے دُکھ سُکھ وچ بھیالی پائی جاسکدی ہے تے انج جیون پینڈے نوں ودھیرے سکھاواں بنایا
> جاسکدا ہے۔'' (14)

محمد آصف خاں نے خود کچھ عرصہ تک مہینہ وار ''پنجابی ادب'' بڑی کامیابی سے نکالا لیکن 1987 سے یہ رسالہ پاکستان پنجابی ادبی بورڈ سہ ماہی شائع کر رہا ہے۔ محمد آصف خاں نے اس رسالے میں واقعی جدید علوم کے بارے میں کئی مضمون چھاپے ہیں اور یہ رسالہ دنیا بھر میں پنجابی زبان میں جدید علوم سے آگاہی فراہم کرنے کے سلسلے میں نمایاں مقام کا حامل ہے۔ محمد آصف خاں ایڈیٹر ''پنجابی ادب'' نے جنوری 1987 میں شائع ہونے والے پہلے پرچے میں 'سانجھ وچار' کے عنوان کے تحت لکھا تھا؛

''ایس رسالے دا ناں تاں ''پنجابی ادب'' ہے پر ایس وچ نِرا پُرا ادب نہ ہوسی۔ لسانیات، معاشیات، ثقافت، آثار قدیما، تاریخ نفسیات دے نال نال سائنسی علماں جویں فزکس، کیمسٹری، جیالوجی تے بیالوجی وغیرا بارے وی کھوج بھر مضمون لوڑیندے ہن۔ ایس پاسے ول اچیچے دھیان دی لوڑ ہے''۔ (15)

- علمی وادبی رسالہ کسی قوم کی تہذیبی رفعت کا آئینہ دار ہوتا ہے۔
- علمی و ادبی مجلہ تخلیقی ادب کی پیش کش اور فروغ کے ساتھ ساتھ علوم، افکار اور نظریات ادب کی اشاعت وترویج کا اہتمام کرتا ہے۔
- وقت کے ساتھ ساتھ نئے موضوعات پیش کرتا ہے۔
- ادبی رسائل میں مختلف ادوار کی ذہنی و فکری تاریخ ہی محفوظ نہیں ہوتی بلکہ اس دور میں پروان چڑھنے والے رجحانات اور تحریکوں کے اتار چڑھاؤ بھی درج ہوتے ہیں۔
- ادبی رسائل جدید فکری رویوں کے حامل ادب کو پروان چڑھاتے ہیں۔
- ادبی رسائل تحقیق وتنقید کی راہیں کھولتے ہیں۔
- ادبی جرائد معاشرتی مسائل کو لطافت احساس کے ساتھ پیش کرتے ہیں۔
- ادبی جرائد قارئین کی ذہنی ضرورتوں کو پورا کرتے ہیں اور مستقبل میں دیکھنے کی تڑپ پیدا کرتے ہیں۔

ان ہی مقاصد کے مد نظر 1987 میں جنوری تا مارچ تک کا ''پنجابی ادب'' کا پہلا شمارا شائع ہوا جس کی قیمت 15 روپے تھی اور سال کے 90 روپے مقرر کیے گئے تھے (بعد میں قیمت کم کر دی گئی تھی)۔ یہ بڑے سائز کا 158 صفحات کا رسالہ تھا جس کے ایڈیٹر محمد آصف خاں تھے۔ اس رسالے میں پروفیسر افضل ملک، قاضی جاوید، افضل پرویز، ڈاکٹر سیف الرحمٰن ڈار، پروفیسر شاہین ملک، تنویر بخاری، ستار طاہر، نذیر خالد، امرتا پریتم، نواز، منشا یاد، حنیف باوا، عاشق رحیل، فوزیہ طاہر، ارشد میر، میرزا ادیب، ڈاکٹر عبدالسلام خورشید، مقصود ثاقب، یوسف حسن اور محمد آصف خاں کے مختلف موضوعات پر تحقیقی اور تنقیدی مضامین شامل تھے۔ اس شمارے میں مسعود پرویز کی حمد چھاپی گئی تھی جب کہ نعت کی سعادت ماجد

صدیقی اور حسین شاد کے حصے میں آئی تھی۔ شعری ادب کے حصے میں احمد راہی، نادر جاجوی، سلمان سعید، کنول مشتاق، اقبال قیصر، زبیر رانا، نسرین انجم بھٹی، ریاض احمد شاد، یوسف حسن، اکرم شیخ، عبدالکریم قدسی اور آسی خانپور کی کاوشیں شامل تھیں۔ اس شمارے میں دیگر زبانوں سے نثری اور شعری ادب میں تراجم میں شامل کیے گئے تھے۔ ان زبانوں میں پشتو، ایرانی، فرانسیسی اور افریقی زبانیں شامل ہیں۔ اسی شمارے میں ''پنجابی ادبی کانفرنس'' اور سندھ سے آئے ہوئے مہمانوں کے ساتھ منائی جانے والی ایک شام کی تفصیل بھی دی گئی ہے۔

''پنجابی ادب'' کے پہلے شمارے سے اس بات کا اندازہ لگانا مشکل نہیں ہے کہ اس رسالے میں کس قسم کے مضامین اور شاعری شائع کی جائے گی۔ یہ رسالہ کلاسیکی ادب کے ساتھ دور جدید کے ادب کے فروغ میں بھی اپنا کردار ادا کرے گا۔ اس کے ساتھ ساتھ اس میں نہ صرف پنجابی ادب ہو گا بلکہ دیگر زبانوں کے ادب کی مختلف نثری اور شعری اصناف کو بھی پنجابی میں ترجمہ کر کے شائع کیا جائے گا۔

''پنجابی ادب'' میں لسانیات کے موضوع پر لکھے جانے والے مضامین میں ڈاکٹر غلام علی الانہ، سردار محمد خان، محمد منصور آفاق، شریف کنجاہی، ڈاکٹر الیاس عشقی، سجاد حیدر اور ایسے ہی ماہرین لسانیات شامل ہیں۔ تصوف کے موضوع پر پروفیسر افضل ملک، قاضی جاوید، ڈاکٹر عبدالسلام خورشید، ڈاکٹر سید اختر جعفری، ڈاکٹر عصمت اللہ زاہد، محمد آصف خاں، سید نصیر شاہ جیسے مصنفین کے مضامین شائع ہو چکے ہیں۔ اس کے علاوہ ''پنجابی ادب'' کے خاص نمبر بھی شائع ہوتے رہتے ہیں جن میں سے کچھ شخصیات کے بارے میں اور کچھ علاقوں کے بارے میں ہیں۔ معروف ادبی شخصیات کی یاد میں مضامین اکثر شامل اشاعت ہوتے رہتے ہیں۔ ان لکھاریوں میں اشفاق احمد، احمد راہی، سجاد حیدر، امرتا پریتم، فرخندہ لودھی، منیر نیازی، شریف کنجاہی، چودھری فضل حسین، محمد آصف خاں، راجار سالو، انور علی اور ایسے ہی بہت سے روشن ستارے شامل ہیں۔

''پنجابی ادب'' میں مادری زبان کو ذریعہ تعلیم بنانے کے لیے بھی مضامین شائع ہوتے رہے ہیں جن کے ذریعے سے بچوں کو پرائمری سطح تک ان کی مادری زبانوں میں تعلیم دینے کے فوائد بتاتے ہوئے پنجابی زبان کو بھی ذریعہ تعلیم بنانے کی مانگ کی گئی ہے۔ یہ مضامین ''پنجابی ادب'' کے مختلف شماروں میں چھپتے رہے ہیں۔ ان میں سے جنوری۔ مارچ 2001

اور جنوری۔مارچ 2009 کے شمارے شامل ہیں۔ محمد آصف خاں کا یہ مضمون اس سے پہلے 1998 میں مسعود کھدر پوش ٹرسٹ کے ایک اجلاس میں بھی پڑھا جا چکا ہے۔ (16)

''پنجابی ادب'' کو یہ اعزاز حاصل ہے کہ اس میں کسی قسم کے تعصب چاہے وہ لسانی ہو یا علاقائی جگہ نہیں دی جاتی اور اس کے ساتھ سیاسی معاملات میں الجھنے کی بجائے خالصتاً پنجابی ادب کی ترقی اور ترویج کے لیے کام کیا جاتا ہے۔ نثری ادب کے ساتھ ساتھ شعری ادب پر بھی خصوصی توجہ دی جاتی ہے۔ دیگر اصناف مثلاً ناول، افسانہ، ڈرامہ، انشائیہ، سفر نامہ، آپ بیتی اور دوسری معروف اصناف پر بھی مضامین اور تعارف شامل اشاعت رہتے ہیں۔ اس لیے بجا طور پر اس کو پنجابی زبان کے بارے میں شائع ہونے والے رسالوں میں نمایاں حیثیت حاصل ہے۔

تماہی پنجابی ادب کے خصوصی نمبروں کے تحت مختلف شخصیات اور ضلعوں کی تاریخ بھی چھپ چکی ہے۔ اس سلسلے میں محمد آصف خاں نے مقامی لوگوں مہمان مدیر بنا کر ان سے ان کے علاقوں کے بارے میں معلومات اکٹھی کروائیں اور اس طرح سے پرانے لکھاریوں کے ساتھ ساتھ بہت سے ایسے نئے لکھاری بھی منظر عام پر آئے جن کی تحریریں اس لیے نہیں چھپ سکتی تھیں کہ ان لکھاریوں کو ایسا کوئی موقع حاصل نہیں تھا۔ یوں ان لکھاریوں کو پنجابی ادب میں حصہ دار بنانے کا سہرا آصف خان کے سر ہے۔

لغت/ڈکشنری

پنجابی اردو (لغت) ڈکشنری

بھارتی پنجاب میں پنجابی زبان گرمکھی رسم الخط میں لکھی جاتی ہے اور وہاں پر پنجابی زبان کی کافی ڈکشنریاں موجود ہیں مگر پاکستانی پنجاب میں پنجابی زبان کو اُردو رسم الخط میں، جسے محاورے میں شاہ مکھی کہا جاتا ہے لکھتے ہیں اور اس میں لغات کی تعداد بہت کم ہے۔ پنجابی ادبی بورڈ نے حال ہی میں جو پنجابی اُردو ڈکشنری شائع کی ہے وہ اب تک شائع ہونے والی ایسی تمام ڈکشنریوں سے اس لحاظ سے بہتر ہے کہ اس میں کل الفاظ اور محاورے وغیرہ بھی زیادہ ہیں اور پنجاب کی دیگر علاقائی بولیوں کے الفاظ اور محاوروں کی تعداد بھی دوسری ڈکشنریوں کی نسبت زیادہ ہے۔

تقسیمِ ہند سے پہلے سردار محمد خان نامی ایک سرکاری ملازم نے اپنے ذاتی شوق سے پنجابی اُردو ڈکشنری مرتب کرنا شروع کی تھی جو ستر کی دہائی کے آخر میں آکر مکمل ہوئی۔ سردار خان مرحوم کا تعلق جالندھر سے تھا لیکن تقسیمِ ہند کے بعد وہ پاکستان آ گئے تھے۔ پنجابی ادبی بورڈ سے تعلق رکھنے والے معروف سکالر محمد آصف خان نے سردار خان کی اس کاوش کو پزیرائی بخشی اور اس ڈکشنری کی اشاعت کے لیے کوششیں کیں مگر اُن کی کوششیں بار آور ثابت نہ ہوسکیں۔ آخر کار یہ ڈکشنری مرتب ہونے کے تیس برس کے بعد سچل سٹوڈیوز کے مشتاق صوفی اور عزت مجید کی کوششوں سے شائع ہوئی۔ شفقت تنویر مرزا کے مطابق دُنیا کی بہترین ڈکشنریوں سے اس ڈکشنری کے موازنے کا کوئی سوال ہی پیدا نہیں ہوتا۔ انھوں نے کہا کہ 'ویبسٹر' یا 'آکسفورڈ' کی ڈکشنریاں اُٹھائیں اور دیکھیں کہ کس طرح ہر ہر مضمون کے ماہرین کے نام ان ڈکشنریوں کے مرتّبین میں شامل ہیں۔ یہ پنجابی اُردو ڈکشنری محض ایک شخص کی کاوش ہی کہلا سکتی ہے کیونکہ پنجابی کی بین الاقوامی معیار کی ڈکشنری مرتب کرنے کے لیے ماہرین کی بہت بڑی ٹیم کی خدمات درکار ہوں گی۔

پنجاب میں برطانوی دور سے پہلے کسی پنجابی ڈکشنری کا کوئی سراغ نہیں ملتا اور انگریزوں نے اپنے دورِ حکومت میں چونکہ مقامی زبانیں سیکھنے پر خاص توجہ مرکوز کر رکھی تھی اس لیے انھوں نے لدھیانہ میں پنجابی زبان میں تراجم کا ایک مرکز قائم کیا تھا۔ اس مرکز میں ہونے والے کام کی وجہ سے بھارتی پنجاب میں سکھ سکالرز کو بہت مدد ملی اور گرمکھی کی کافی

ڈکشنریاں مرتب ہو گئیں۔ پاکستانی پنجاب میں پنجابی زبان کی ترویج واشاعت اور ڈکشنریاں مرتب کرنے کا کام نسبتاً بہت کم ہوا ہے مگر یہاں اچھے معیار کا پنجابی ادب تخلیق ہوتا رہا ہے۔ اگر سرکاری ادارے مالی وسائل فراہم کریں تو پنجابی کی بڑی ڈکشنریاں بھی مرتب ہو سکتی ہیں۔ تقسیمِ ہند سے پہلے پنجابی میں تراجم ہمیں زیادہ تر اُن رسائل کی شکل میں ملتے ہیں جو زبان سیکھنے میں معاون ثابت ہوتے تھے کیونکہ یہی انگریزوں کی ضرورت تھی۔ تقسیمِ ہند کے بعد ڈکشنریوں کی طرف توجہ ہوئی، تاہم پاکستانی پنجاب میں یہ توجہ برائے نام ہی رہی۔ پنجاب یونیورسٹی کے پنجابی ڈیپارٹمنٹ نے جو ڈکشنری مرتب کی وہ سردار خان کی اس ڈکشنری کے دسویں حصے کے برابر ہے اور اُردو سائنس بورڈ نے اس کے بعد دو چھوٹی چھوٹی پنجابی ڈکشنریاں مرتب کیں جن کے بعد اقبال صلاح الدین کی مرتب کردہ ایک بڑی ڈکشنری شائع ہوئی جو سردار خان کی مرتب کردہ اس ڈکشنری سے بہر حال چھوٹی ہے۔(17)

حوالے باب پنجم

1۔ قائداعظم سیاست تے سوچ، رفیق ڈوگر، لاہور، پاکستان پنجابی ادبی بورڈ، 1998، ص16۔

2۔ شفقت تنویر مرزا، تحریک آزادی تے پاکستان وچ پنجاب دا حصہ، لاہور، پاکستان پنجابی ادبی بورڈ، 1993، ص7۔

3۔ کنول مشتاق، چونویں انشائیے، لاہور، پاکستان پنجابی ادبی بورڈ، 1986، ص7۔

4۔ تنویر بخاری، سراں تے سداں، لاہور، پاکستان پنجابی ادبی بورڈ، 1988، ص8۔

5۔ محمد حنیف گل، ڈاکٹر، خیر منکھ، لاہور، پاکستان پنجابی ادبی بورڈ، 1993، ص19۔

6۔ شیما مجید، محمد صفدر میر دیاں لکھتاں، لاہور، پاکستان پنجابی ادبی بورڈ، 2002، ص5۔

7۔ محمد صفدر میر دیاں لکھتاں، ص9۔

8۔ سیف الرحمٰن ڈار، ڈاکٹر، ٹیکسلا، لاہور، پاکستان پنجابی ادبی بورڈ، ص4۔

9۔ ضلع مظفر گڑھ، لاہور، پاکستان پنجابی ادبی بورڈ، 1989، ص16۔

10۔http://ur.wikipedia.org/wiki۔

11۔ دلشاد کلانچوی، پروفیسر، ضلع بہاولپور، لاہور، پاکستان پنجابی ادبی بورڈ، 1997، ص12۔

12۔http://www.pakistananalysis.com۔

13۔ نوید شہزاد، ضلع ملتان، لاہور، پاکستان پنجابی ادبی بورڈ، 2001، ص10۔

14۔ سانجھ وچار، پنجابی ادب، تماہی لہور، جلد نمبر1، شمارہ نمبر1، جنوری-مارچ 1987، ص5۔

15۔ ساہت، مرتبہ، سید اختر حسین اختر، ڈاکٹر، پنجابی پرچاکاری، لاہور، الیاس گھمن، 1997ص414

16۔ پنجابی ادب، مضمون، پرئمری پدھر تے ماں بولی، محمد آصف خاں، شمارہ جنوری۔مارچ، 2001، ص7۔

17۔wichaar.com/news/124/ARTICLE/29386/2013-04-19

ماحصل

جس وقت پاکستان پنجابی ادبی بورڈ کا قیام عمل میں لایا گیا، اس وقت ادبی تنظیموں اور ادب کی ترویج کے لیے کام کرنے والے اداروں کی تعداد بہت کم تھی اور خصوصی طور پر پنجابی ادب کے لیے کام کرنے والے اداروں کی کمی محسوس کی جارہی تھی۔ اس لیے اس بورڈ کا قیام عمل میں لایا گیا۔ پنجابی زبان کی خوش قسمتی ہے کہ اس وقت ایسے تجربہ کار مصنفین، محققین اور نقاد موجود تھے جنہوں نے ماں بولی کی بے لوث خدمت کا بیڑہ اٹھایا اور پاکستان پنجابی ادبی بورڈ کے ذریعے پنجابی ادب کو محفوظ کرنے اور اس کی ترویج واشاعت کا کام شروع کیا۔

تقریباً چالیس سال پہلے وجود میں آنے والا ادارے کی کارکردگی کا جائزہ لیتے ہوئے یہ بات سامنے آتی ہے کہ نامساعد حالات اور پنجابی زبان سے روا رکھے جانے والے رویے کے باوجود اس ادارے نے پنجابی زبان کے ادب کے فروغ اور ترویج کے سلسلے میں بہت سے سنگ میل عبور کیے ہیں۔ ادب کا تعلق تحقیق سے ہو یا تخلیق سے دونوں کی موجودگی سے زبان کے ادبی سرمائے میں اضافہ ہوتا ہے اور اس کے ساتھ ساتھ وہ زبان بھی باثروت بنتی ہے۔ گو پنجابی زبان میں ایک ترقی یافتہ زبان کی تمام خوبیاں موجود ہیں لیکن اس کے باوجود ایک مخصوص زمانے کے علاوہ تخلیق کا معیار دوسری زبانوں کے ادب کے مقابل کھڑا ہونے کے قابل نہیں ہوا۔ اس کی وجوہات میں پنجابی کی سرکاری سرپرستی نہ ہونا اور خود پنجابی بولنے والوں کی بے اعتنائی ہے۔ ایسا نہیں ہے کہ پنجابی زبان میں لکھنے والے موجود نہیں تھے بلکہ انہوں نے بھی پنجابی زبان کو چھوڑ کر اردو زبان کو اظہار کو ذریعے بنایا۔ اسی وجہ سے اردو زبان کا ادب ترقی کرتا گیا اور پنجابی زبان میں تخلیق پانے والا ادب اپنا مقام حاصل کرنے کی تگ ودو میں مصروف رہا۔ تحقیق اور تخلیق کا چولی دامن کا ساتھ ہے، جس قدر تحقیق کا معیار بلند ہوگا، اسی قدر اعلیٰ پائے کا تخلیقی ادب وجود میں آئے گا۔ کسی بھی زبان کے تحقیقی، تخلیقی اور تنقیدی سرمائے کو محفوظ کرنا اور اگلی نسلوں تک پہنچانا اجتماعی ذمہ داری ہے لیکن پاکستان پنجابی ادبی بورڈ جیسے کچھ ادارے اس کام کا بیڑہ اٹھائے ہوئے ہیں۔

زبان کی بقا کے لیے کارکردگی کا معیار کسی بھی ادارے کی مطبوعات سے لگایا جا سکتا ہے۔ وہ مطبوعات اپنی پسندیدگی اور مقبولیت کی بنا پر اس بات کی دلیل ہیں کہ وہ ادارہ زبان کی ترقی و ترویج کا کام کرنے میں بہت حد تک کامیاب رہا ہے۔ پاکستان پنجابی ادبی بورڈ جب سے وجود میں آیا ہے اس کو پنجابی زبان سے لگاؤ رکھنے والے افراد کا تعاون حاصل رہا ہے اور

وہ افراد کسی لالچ و نفع کے بغیر صرف اپنی مادری زبان کے تحفظ اور ترویج کے لیے کوشاں رہے۔ اس ادارے نے قیام سے لے کر اب تک اپنے قیام کے مقاصد کے پیش نظر بہت سے موضوعات پر تحقیقی، تخلیقی اور تنقیدی کتب کے ساتھ ساتھ لوک ادب کی اشاعت پر خصوصی توجہ دیتے ہوئے ان کی اشاعت کا اہتمام کیا۔ پنجابی زبان کے تہذیبی، تمدنی، ثقافتی، لسانی، سماجی، معاشرتی، معاشی، اقتصادی، سیاسی، تاریخی غرض کہ ہر شعبہ زندگی سے تعلق رکھنے والے ماہرین سے رابطہ کیا اور ایسی کتابوں کی اشاعت کا اہتمام کیا جن کی بدولت پنجابی زبان کے ادب میں خاطر خواہ اضافہ ہوا۔ اس کا فائدہ یہ ہوا کہ دوسری زبانوں کو اظہار کا ذریعہ بنانے والوں نے پنجابی میں اپنی بات کہنی شروع کر دی اور قارئین کی توجہ حاصل کرتے ہوئے پنجابی کے فروغ میں قابل ذکر کامیابی حاصل کی۔

بورڈ نے دیگر زبانوں کے ادب کو پنجابی کے قالب میں ڈھال کر اپنے قارئین تک پہنچانے کے ساتھ ساتھ پنجابی ادب کی کچھ کتابیں انگریزی میں ترجمہ کر کے شائع کی ہیں جس کی بدولت دوسری زبانوں سے دوری کم ہوئی اور پنجابی زبان کو دوسری زبانوں سے متعارف کرانے کا موقع میسر آیا۔ بورڈ کی طرف سے بچوں کے ادب اور دیگر سائنسی علوم کے بارے میں کتابیں شائع کر کے معلومات مہیا کی گئیں اور پنجابی زبان سے آگہی کے ساتھ ساتھ اس کی ترویج کی گئی۔ پاکستان پنجابی ادبی بورڈ کی اب تک کی کارکردگی کو تسلی بخش کہا جا سکتا ہے کیونکہ نامساعد حالات کے باوجود اس نے پنجابی زبان کے ادب اور اس کی ترویج کے سلسلے میں نہایت اہم کردار ادا کیا ہے۔

سفارشات

1۔ پاکستان کی دیگر مقامی زبانوں کی اکیڈمیوں کی طرح پاکستان پنجابی ادبی بورڈ کی اپنی عمارت ہو جو پاکستان کی غالب آبادی اور دنیا بھر میں موجود پنجابیوں کی شان کی غمازی کرے۔ ایسی مناسب عمارت کی تعمیر اور دیکھ بھال کے لیے حکومت پاکستان اور خصوصاً حکومت پنجاب کو عملی اقدامات اٹھانے چاہییں۔

2۔ پاکستان پنجابی ادبی بورڈ کو تقریباً دس کروڑ سے زائد پنجابیوں کے ادب کی تحقیق و اشاعت کے سلسلے میں لازمی مالی امداد دی جائے تا کہ بورڈ اپنے تحقیقی اور تخلیقی منصوبوں پر عملدرآمد کرتے ہوئے مستند محققین، مصنفین اور مترجمین کو اس کام کی ترغیب دے جس سے پنجابی ادب کی ترویج ہو گی۔

3۔ وفاقی حکومت، حکومت پنجاب اور تمام صوبائی حکومتوں کی تمام یونیورسٹیوں، کالجوں اور سرکاری اداروں کو پاکستان پنجابی ادبی بورڈ کی کتابیں خرید کر اپنی لائبریریوں میں رکھنے کے احکامات دے۔

4۔ پاکستان پنجابی ادبی بورڈ میں عملے کی کمی اور دیگر معاملات کی طرف خصوصی توجہ دی جائے۔

5۔ ایسے آلات اور عملہ مہیا کیا جائے جو انٹرنیٹ پر پاکستان پنجابی ادبی بورڈ کی کارکردگی اور پنجابی ادب کی ترویج و اشاعت کے سلسلے میں کیے جانے والے کاموں کے بارے میں معلومات مہیا کر سکے۔

6۔ پاکستان پنجابی ادبی بورڈ کی اشاعت کردہ کتابوں کی فروخت کے سلسلے میں مناسب سہولیات فراہم کی جائیں۔

7۔ بورڈ کو صرف مغربی پنجاب کے مصنفین اور شعرا تک محدود رہنے کی بجائے اپنا رابطہ مشرقی پنجاب اور دنیا بھر کے پنجابی تخلیق کاروں تک بڑھانا چاہیے اور یہاں سے بھی ان کی کتابیں شائع کرنے کی طرف توجہ دینی چاہیے۔

8۔ پاکستان اور بھارتی پنجاب کے ادیبوں اور شاعروں کے آپس میں روابط بڑھانے کے سلسلے میں مناسب اقدامات اٹھائے جائیں اور مناسب وقفے کے بعد دونوں پنجابوں کے مختلف شہروں میں ادبی اور ثقافتی محافل کا انعقاد کیا جائے۔

9۔ پاکستان پنجابی ادبی بورڈ ثقافتی اور روایتی مواقع کی مناسبت سے جن تقریبات کا اہتمام کرتا ہے، ان کے لیے الگ سے گرانٹ دی جائے۔ اس طرح پنجاب کی ثقافت کے فروغ میں مدد ملے گی۔

10۔ بورڈ کو ایسے سوفٹ وئیر تیار کروانے چاہییں جن سے شاہ مکھی کو گورمکھی میں اور گورمکھی کو شاہ مکھی رسم الخط میں تبدیل کیا جا سکے تاکہ مشرقی پنجاب میں تخلیق پانے والے ادب سے مغربی پنجاب کے لوگ استفادہ کریں اور مشرقی پنجاب والے ہمارے ادب سے شناسائی حاصل کریں۔ اس طرح آپس کے تعلقات کو بہتر بنانے میں مدد ملے گی اور پنجابی ادب کو فروغ حاصل ہو گا۔

11۔ بورڈ نے ابھی تک سلطان العارفین سلطان باہو کے کلام اور زندگی بارے میں کوئی کتاب شائع نہیں کی جس وجہ سے پنجابی ادب کے قارئین کلاسیکی شاعری میں کچھ کمی محسوس کرتے ہیں۔ بورڈ کو چاہیے کہ وہ پنجابی کے صاحب طرز شاعر کے مستند کلام پر مبنی کتاب جلد شائع کرے تاکہ یہ کمی دور ہو اور قارئین اس کلام سے مستفید ہو سکیں گے جس سے ابھی تک محروم ہیں۔

12۔ اس کے علاوہ پنجاب کے دیگر معروف اور غیر معروف شاعروں اور ادیبوں کی کتب کی اشاعت کی بھی ضرورت ہے۔

13۔ ترجمے کے سلسلے میں بہت زیادہ کام کرنے کی ضرورت ہے کیونکہ اس ذریعے سے پنجابی ادب کے قارئین کو دوسری زبانوں کا ادب پڑھنے کا موقع ملتا ہے اور ہمارے لکھاری ان کتابوں کے مقابلے میں اپنی تحریریں پیش کر سکتے ہیں۔اس طرح سے پنجابی ادب میں اضافے کے ساتھ ساتھ اس کی ترویج اور ترقی بھی ہو گی۔

14۔ بورڈ کو پاکستان بھر اور خصوصی طور پر پنجاب کی یونیورسٹیوں سے رابطہ کر کے پنجابی زبان کے شعبے کا اجرا کرانے کے سلسلے میں معاونت فراہم کرنی چاہیے۔

15۔ بورڈ کو ایسی تمام یونیورسٹیاں جہاں پر پنجابی زبان کو مضمون کے طور پر پڑھایا جاتا ہے سے رابطے میں رہنا چاہیے اور پنجابی میں ایم اے تا پی ایچ ڈی کرنے والے طلبہ کے مقالوں کو بورڈ کے زیر اہتمام شائع کرنا چاہیے یا ان طلبہ کے مضامین پنجابی ادب میں شائع کرنے چاہییں۔

کتابیات

احمد حسین قریشی، قلعداری، ڈاکٹر: جنگنامہ امام حسین؛لہور؛ پاکستان پنجابی ادبی بورڈ؛۱۹۷۹۔

احمد حسین قریشی، قلعداری، ڈاکٹر: ضلع گجرات؛لہور؛ پاکستان پنجابی ادبی بورڈ؛۱۹۹۵۔

احمد شہباز خاور: چپ دی چیک؛لاہور؛ پاکستان پنجابی ادبی بورڈ؛۱۹۹۴۔

سید اختر جعفری، ڈاکٹر: قصہ شاہ منصور؛لہور؛ پاکستان پنجابی ادبی بورڈ؛۱۹۹۱۔

افضل پرویز: کہنداسائیں؛لاہور؛ پاکستان پنجابی ادبی بورڈ؛۱۹۹۸۔

افضل احسن رندھاوا: مناکوہ لہور؛لاہور؛ پاکستان پنجابی ادبی بورڈ؛۱۹۸۹

افضل احسن رندھاوا: پہلوں توں دس دتی گئی موت دا روزنامچہ؛لہور؛ پاکستان پنجابی ادبی بورڈ؛۱۹۹۲۔

افضل احسن رندھاوا: سورج گرہن؛لہور؛ پاکستان پنجابی ادبی بورڈ؛۱۹۹۶۔

افضل احسن رندھاوا: سپ، شینہ تے فقیر؛لاہور؛ پاکستان پنجابی ادبی بورڈ؛۱۹۹۷۔

افضل احسن رندھاوا: کالا پینڈا؛لہور؛ پاکستان پنجابی ادبی بورڈ؛۱۹۹۸۔

اقبال اسد: گنجی بار دے ڈھولے؛لاہور؛ پاکستان پنجابی ادبی بورڈ؛۱۹۸۹

اقبال اسد: پنجاب دے لجپال پتر؛لاہور؛ پاکستان پنجابی ادبی بورڈ؛۱۹۸۹

اے ڈی اعجاز: کال بلیندی؛لاہور؛ پاکستان پنجابی ادبی بورڈ؛۱۹۸۳

انور علی: کالیاں اٹاں کالے روڑ؛لاہور؛ پاکستان پنجابی ادبی بورڈ؛۱۹۸۸

انور علی: نوری؛لاہور؛ پاکستان پنجابی ادبی بورڈ

باقی صدیقی: کچے گھڑے؛لاہور؛ پاکستان پنجابی ادبی بورڈ؛۱۹۹۶

بلوچ ناصر: سیتیاں اکھاں والے؛لاہور؛ پاکستان پنجابی ادبی بورڈ؛س ن

پروین ملک: نکی جئی کہانی؛لاہور؛ پاکستان پنجابی ادبی بورڈ

پروین ملک: نکے نکے دکھ؛لاہور؛ پاکستان پنجابی ادبی بورڈ؛۲۰۰۴

تنویر بخاری: ماہیا فن تے بنتر؛لاہور؛ پاکستان پنجابی ادبی بورڈ؛۱۹۸۸

تنویر بخاری: سراں تے سداں؛لاہور؛ پاکستان پنجابی ادبی بورڈ؛۱۹۸۸

جانی نذر حسین: سنجان؛لاہور؛ پاکستان پنجابی ادبی بورڈ؛ ۱۹۹۲

حامد بیگ؛مرزا: قصہ کہانی؛لاہور؛ پاکستان پنجابی ادبی بورڈ؛ ۱۹۸۴

حنیف باوا: چرخے دی موت؛لاہور؛ پاکستان پنجابی ادبی بورڈ؛ ۱۹۸۱

حنیف باوا: کہانی؛لاہور؛ پاکستان پنجابی ادبی بورڈ؛ ۱۹۹۴

خان سردار، پروفیسر: پکی سڑک؛لاہور؛ پاکستان پنجابی ادبی بورڈ

راشد جاوید: مٹی اتے لیک؛لاہور؛ پاکستان پنجابی ادبی بورڈ؛ س ن

رحیم طلب: آکھیا مبارک شاہ نے؛لاہور؛ پاکستان پنجابی ادبی بورڈ

رضا ہمدانی: پشتو ادب؛لاہور؛ پاکستانی پنجابی ادبی بورڈ؛ ۱۹۸۶

سجاد حیدر: سورج مکھی؛لاہور؛ پاکستان پنجابی ادبی بورڈ؛ ۱۹۸۰

سجاد حیدر: بول مٹی دیا باویا؛لاہور؛ پاکستان پنجابی ادبی بورڈ؛ ۱۹۷۷

سجاد حیدر: چونویں کہانی؛لاہور؛ پاکستان پنجابی ادبی بورڈ

سجاد حیدر: چیتر باغ؛لاہور؛ پاکستان پنجابی ادبی بورڈ؛ ۱۹۹۲

سلیم خان گمی: ٹردے پیر؛لاہور؛ پاکستان پنجابی ادبی بورڈ؛ ۱۹۹۴

سیف الرحمن ڈار، ڈاکٹر: جتھے پپلاں دی ٹھنڈی چھاں؛لاہور؛ پنجابی ادبی بورڈ؛ ۱۹۸۵

سیف الرحمن ڈار، ڈاکٹر: جتھے پپلاں دی ٹھنڈی چھاں؛لاہور؛ پاکستان پنجابی ادبی بورڈ؛ ۱۹۸۵

سیف الرحمن ڈار، ڈاکٹر: رکھ تاں ہرے بھرے؛لاہور؛ پاکستان پنجابی ادبی بورڈ؛ ۱۹۸۵

شارب، پروفیسر: ٹانگے جھنگ جاندے؛لاہور؛ پاکستان پنجابی ادبی بورڈ؛ ۱۹۸۷

شارب، پروفیسر: بار دے ڈھولے؛لاہور؛ پاکستان پنجابی ادبی بورڈ؛ ۱۹۸۷

شارب، پروفیسر: کنیں بندے؛لاہور؛ پاکستان پنجابی ادبی بورڈ؛ ۱۹۸۴

شاہین ملک، پروفیسر: اعوان کاری؛لاہور؛ پاکستان پنجابی ادبی بورڈ؛ ۱۹۸۷

شاہین ملک، پروفیسر: لہندی شعری ریت؛لاہور؛ پاکستان پنجابی ادبی بورڈ؛ ۱۹۸۹

شفقت تنویر، مرزا: آکھیا سچل سرمست نے؛لاہور؛ پاکستان پنجابی ادبی بورڈ

شفقت تنویر، مرزا: تحریک آزادی تے پاکستان وچ پنجاب دا حصہ؛لاہور؛ پاکستان پنجابی ادبی بورڈ؛ ۱۹۹۳

شفقت تنویر، مرزا: بوہا کوئی نا؛(ترجمہ سارتر)؛لاہور؛پاکستان پنجابی ادبی بورڈ؛۱۹۸۰
شفقت تنویر، مرزا: لہو سہاگ؛(ترجمہ لورکا)؛لاہور؛پاکستان پنجابی ادبی بورڈ؛۱۹۸۴
شمس نغمان: شیشے دی کندھ؛لاہور؛پاکستان پنجابی ادبی بورڈ؛۱۹۹۳
میاں محمد بخش: سیف الملوک؛لاہور؛پاکستان پنجابی ادبی بورڈ
ظفر لاشاری: پہاج؛لاہور؛پاکستان پنجابی ادبی بورڈ؛۱۹۸۳
ظفر لاشاری: خواجہ غلام فرید دے تعلیمی نظریات؛لاہور؛پاکستان پنجابی ادبی بورڈ؛۱۹۹۵
عائشہ اسلم: کوک؛لاہور؛پاکستان پنجابی ادبی بورڈ؛۱۹۸۶
عبدالغفور قریشی: پنجابی ادب دی کہانی؛(تالیف)؛لاہور؛پاکستان پنجابی ادبی بورڈ؛س ن
عصمت اللہ زاہد، ڈاکٹر: جدید پنجابی لغت؛لاہور؛پاکستان پنجابی ادبی بورڈ؛۱۹۸۵
علی عباس جلالپوری: وحدت الوجود تے پنجابی شاعری؛لاہور؛پاکستان پنجابی ادبی بورڈ؛۱۹۷۷
علی حیدر: کلیات علی حیدر؛لاہور؛پاکستان پنجابی ادبی بورڈ؛۱۹۸۸
غلام یعقوب، انور: بول تے تول؛لاہور؛پاکستان پنجابی ادبی بورڈ؛۱۹۸۱
فرخندہ لودھی: چنے دے اوہلے؛لاہور؛پاکستان پنجابی ادبی بورڈ؛۱۹۸۴
فرخندہ لودھی: ہر دے وچ تریڑاں؛لاہور؛پاکستان پنجابی ادبی بورڈ؛۱۹۹۵
فرزند علی: تائی؛لاہور؛پاکستان پنجابی ادبی بورڈ؛س ن
فضل حق، قاضی: نکھیڑے؛لاہور؛پاکستان پنجابی ادبی بورڈ؛۱۹۸۵
کلیم شہزاد: تاریخ ضلع وہاڑی؛لاہور؛پاکستان پنجابی ادبی بورڈ؛۱۹۹۴
کنول مشتاق: میں تے میں؛لاہور؛پاکستان پنجابی ادبی بورڈ؛۱۹۸۸
کنول مشتاق: مرتبہ؛چونویں انشایئے؛لاہور؛پاکستان پنجابی ادبی بورڈ
لاہوری اکبر: اکبر کہانیاں؛لاہور؛پاکستان پنجابی ادبی بورڈ؛۲۰۰۶
محمد آصف خاں: آکھیا بابا فرید نے؛لاہور؛پاکستان پنجابی ادبی بورڈ؛۱۹۷۸
محمد آصف خاں: آکھیا بلھے شاہ نے؛لاہور؛پاکستان پنجابی ادبی بورڈ؛۱۹۹۲
محمد آصف خاں: نک سک؛لاہور؛پاکستان پنجابی ادبی بورڈ؛۱۹۹۲

محمد آصف خاں: کافیاں شاہ حسین؛لاہور؛ پاکستان پنجابی ادبی بورڈ؛۱۹۹۳

محمد آصف خاں: ہور نک سک؛لاہور؛ پاکستان پنجابی ادبی بورڈ؛۱۹۹۳

محمد آصف خاں: آکھیا خواجہ فرید نے؛لاہور؛ پاکستان پنجابی ادبی بورڈ؛۱۹۹۹

محمد آصف خاں: آکھیا میاں جوگی نے؛لاہور؛ پاکستان پنجابی ادبی بورڈ

مسز ستنام محمود: اللہ والی کل دا؛لاہور؛ پاکستان پنجابی ادبی بورڈ؛۱۹۸۰

مشتاق صوفی: بار دے گیت؛لاہور؛ پاکستان پنجابی ادبی بورڈ؛۱۹۸۴

منو بھائی: جزیرہ؛لاہور؛ پاکستان پنجابی ادبی بورڈ؛۱۹۷۷

منیر نیازی: قصہ دو بھراواں دا؛لاہور؛ پاکستان پنجابی ادبی بورڈ

مولوی غلام رسول عالمپوری: احسن القصص؛لاہور؛ پاکستان پنجابی ادبی بورڈ؛۱۹۸۷

نزہت گردیزی: کلجگ؛لاہور؛ پاکستان پنجابی ادبی بورڈ

نواب سیال: (مرتبہ) نادر شاہ دی وار؛لاہور؛ پاکستان پنجابی ادبی بورڈ؛۱۹۸۹

نواز: ڈونگھیاں شاماں؛لاہور؛ پاکستان پنجابی ادبی بورڈ؛ چھٹی بار ۱۹۹۵

نواز: شام رنگی کڑی؛لاہور؛ پاکستان پنجابی ادبی بورڈ؛۱۹۸۳

وارث شاہ: ہیر وارث شاہ؛لاہور؛ پاکستان پنجابی ادبی بورڈ؛

ہاشم شاہ، سید؛ ککارے؛لاہور؛ پاکستان پنجابی ادبی بورڈ س ن

یٰسین ظفر، ڈاکٹر: پوٹھوہاری زبان وادب؛لاہور؛ پاکستان پنجابی ادبی بورڈ ۱۹۹۷

محمد آصف خاں: کن لیکھا؛لاہور؛ پاکستان پنجابی ادبی بورڈ؛۱۹۸۴

ماہنامہ ''پنجابی ادب'' لاہور؛ پاکستان پنجابی ادبی بورڈ

سوہنے دیس پنجاب اُتے ہے پنجتن پاک دا سایہ
(مولوی لطف علی بہاولپوری)
مہینہ وار
پنجابی ادب
اکتوبر توں دسمبر 2014ء

سوہنے دیس پنجاب اُتے ہے پنجتن پاک دا سایہ
(مولوی لطف علی بہاولپوری)
تماہی
پنجابی ادب
اپریل توں ستمبر 2015ء

سوہنے دیس پنجاب اُتے ہے پنجتن پاک دا سایہ
(مولوی لطف علی بہاولپوری)
تماہی
پنجابی ادب
جنوری توں مارچ 2016ء

سوہنے دیس پنجاب اُتے ہے پنجتن پاک دا سایہ

(مولوی لطف علی بہاولپوری)

تماہی پنجابی ادب

جولائی توں ستمبر 2016ء

محمد آصف خان

اشفاق احمد

شفقت تنویر مرزا

پروین ملک

پنجابی قاعدہ

(پہلی جماعت لئی)

محمد آصف خاں

☆

پاکستان پنجابی ادبی بورڈ۔ لاہور

مُل: 10 روپے

فہرست کتب پاکستان پنجابی ادبی بورڈ

نمبر	کتاب	شاعر، مرتب، مترجم	سال اشاعت
	کلاسیک		
1.	آکھیا بابا فرید نے	محمد آصف خاں	1978
2.	احسن الاقصص	غلام رسول عالمپوری	1978
3.	ہیر چراغ اعوان	عین الحق فرید کوٹی	1978
4.	گلزار سسی	غلام حیدر مستانہ	1978
5.	کہنداسائیں	افضل پرویز	1978
6.	جنگ نامہ امام حسین	ڈاکٹر احمد حسین قلعداری	1979
7.	کلیات لالی	ریاض احمد شاد	1982
8.	پنج تارے	محمد حنیف مہر کاچیلوی	1984
9.	ہیر دمودر	محمد آصف خاں	1986
10.	ملتانی مرثیہ	خلش پیرا صحابی	1986
11.	کافیاں شاہ حسین	محمد آصف خاں	1987
12.	ککارے (ہاشم شاہ)	ڈاکٹر فقیر محمد فقیر	1987
13.	ہیر وارث شاہ	ڈاکٹر محمد باقر	1988
14.	کلیات علی حیدر	علی حیدر	1988
15.	نادر شاہ دی وار	نواب سیال	1989
16.	کلیات شاہ عظیم	سعید بھٹا	1991
17.	آکھیا بلھے شاہ نے	محمد آصف خاں	1992
18.	سر سانویں رتی پریت	سعید بھٹا	1993
19.	آکھیا خواجہ فرید نے	محمد آصف خاں	1994

20. کلیات خوش طبع	ابولاطاہر فدا حسین فدا	1994
21. خواجہ غلام فرید دے تعلیمی نظریات	ظفر لاشاری	1995
22. آکھیا میاں جوگی نے	محمد آصف خاں	1996
23. آکھیا سچل سرمست نے	شفقت تنویر مرزا	1996
24. سسی لکھ شاہ	زاہد حسن	1996
25. آکھیا مبارک شاہ نے	رحیم طلب	1997
26. شاہ جور سالو	شکیل احمد طاہری	1997
27. چندل پریتی	جاوید گھنجیرا	1997
28. آکھیا بابا نانک نے	بابا نانک	1998
29. قصہ شاہ منصور	ڈاکٹر سید اختر جعفری	1999
30. کلیات ہدایت	ڈاکٹر فقیر محمد فقیر	
31. فرید وچار	زاہد حسن	1999

تاریخ ادب

32. پنجابی ادب دی کہانی	عبدالغفور قریشی	1981
33. گوجری ادب	ڈاکٹر صابر آفاقی	1985
34. پشتو ادب	رضا ہمدانی	1986
35. ادب راہیں پنجاب دی تاریخ	شفقت تنویر مرزا	1989
36. سندھی ادب	محمد آصف خاں	1991
37. پنجابی ادب	شفقت تنویر مرزا	1995
38. آزادی مگروں پنجابی ادب	شفقت تنویر مرزا	1995
39. بلوچی ادب	پروفیسر عبدالرزاق صابر	1996
40. پوٹھوہار دی پنجابی شاعری	ڈاکٹر محمد یاسین ظفر	1997
41. آزادی مگروں پنجابی نظم	زاہد حسن	2001

علمی / تحقیقی کتابیں

42. مڈھلی لفظالی	محمد آصف خاں، سبط الحسن ضیغم، شریف صابر	1976
43. بول تے تول	علامہ غلام یعقوب انور	1981
44. کن لیکھا	محمد آصف خاں، تنویر بخاری	1984
45. نکھیڑے	پروفیسر قاضی فضل حق محمود	1985
46. ماہیا فن تے بنتر	تنویر بخاری	1988
47. بوطیقا	رحمان مذنب	1988
48. نک سک	محمد آصف خاں	1992
49. پنجابی بولی دا پچھوکڑ	محمد آصف خاں	1996
50. ہور نک سک	محمد آصف خاں	2000
51. لیکھے جوکھے	سمیع اللہ قریشی	2002
52. پنجابی نعت	ڈاکٹر آفتاب احمد نقوی	
53. پاکستانی زباناں	پروین ملک	2013
54. پنجابی رانی	ڈاکٹر دلشاد ٹوانہ	2011

تصوف

55. وحدت الوجود تے پنجابی شاعری	علی عباس جلالپوری	1986
56. پنجاب دی صوفیانہ روایت	قاضی جاوید	1993

افسانہ / کہانی

57. ڈونگھیاں شاماں	نواز	1964
58. کالیاں اٹاں کالے روڑ	انور علی	1972
59. اکبر کہانیاں	اکبر لہوری	1976
60. چنے دے اوہلے	فرخندہ لودھی	

61. لوہے دا سپاہی	حنیف چودھری	1980
62. چرخے دی موت	حنیف باوا	1981
63. قصہ کہانی	مرزا حامد بیگ	1984
64. چونویں کہانی	سجاد حیدر	1986
65. سیتیاں اکھاں والے	ناصر بلوچ	1986
66. کوک	عائشہ اسلم	
67. مٹی اتے لیک	راشد جاوید احمد	1986
68. ککر دے پھل	سید نصیر شاہ	1987
69. وگدا پانی	محمد منشا یاد	1987
70. میں تے میں	کنول مشتاق	1988
71. منا کوہ لہور	افضل احسن رندھاوا	1989
72. کلجگ	نزہت گردیزی	1989
73. نوری	انور علی	1993
74. شیشے دی کندھ	شمس نغمان	1993
75. تر دے پیر	سلیم خان گمی	1994
76. چپ دی چیک	احمد شہباز خاور	1994
77. اک دے امب	انیل چوہان	1994
78. کہانی	حنیف باوا	1994
79. ہر دے وچ تریڑاں	فرخندہ لودھی	1995
80. پشتو کہانیاں	پروفیسر عاشق رحیل	1996
81. تصویراں والی کہانی	کہکشاں کنول	1998
82. دوجا بٹوارا	حنیف چودھری	1998
83. گواچیاں گلاں	انور علی	1998

84. پشو پاشا	پروفیسر محسن عباسی	1999
85. انیندرے	ڈاکٹر محسن مگھیانہ	1999
86. اک اوپری کڑی	رفعت	2003
87. سوئمبر	پروفیسر نصیر احمد چیمہ	
88. بڑی دیر ہو گئی	اظہر جاوید	2004
89. چھوپے	راجا رسالو	
90. نکے نکے دکھ	پروین ملک	2004
91. شہر دے سفنے	حسین شاد	

ناول

92. جٹ دی کرتوت	میراں بخش منہاس	1976
93. پہاج	ظفر لاشاری	1983
94. چکڑ رنگی مورتی	کہکشاں ملک	1984
95. ٹٹ جھج	افضل احسن رندھاوا	1986
96. تائی	فرزند علی	1986
97. پہلوں توں دسی گئی موت دا روزنامچہ	افضل احسن رندھاوا	1992
98. چیتر باغ	سجاد حیدر	1992
99. سنجان	نذر حسین جانی	1992
100. اک چونڈی لون دی	فرزند علی	1994
101. لہور نگی سویر	احسان باجوہ	1994
102. پکی سڑک	پروفیسر سردار خان	1995
103. بھبھل	فرزند علی	1995
104. سورج گرہن	افضل احسن رندھاوا	1996

ڈرامہ

.105 سورج مکھی	سجاد حیدر	1970
.106 جزیرہ	منو بھائی	1977
.107 سوہنا خواب	نواز	1980
.108 بوہا کوئی نہ	شفقت تنویر مرزا	1980
.109 قصہ دو بھراواں دا	منیر نیازی	1981
.110 شام رنگی کڑی	نواز	1983
.111 لہو سہاگ	شفقت تنویر مرزا	1984
.112 سپ شینہ تے فقیر	افضل احسن رندھاوا	1997
.113 بول مٹی دیا باویا	سجاد حیدر	1997

شاعری

.114 کالا پینڈا	افضل احسن رندھاوا	1988
.115 نظراں کردیاں گلاں	صوفی تبسم	1988
.116 کچے گھڑے	باقی صدیقی	1994

سفر نامہ/آپ بیتی

.117 دیس پردیس	سلیم خان گمی	1978
.118 لاپریت اجیہی محمد	راجا رسالو	2008
.119 یاداں گنجی باردیاں	ڈاکٹر ہرکیرت سنگھ (پروفیسر عاشق رحیل)	2007

شخصیت

.120 حضور دی حیاتی	سمیع اللہ قریشی	
.121 قائداعظم دی وار	مسعود منور	1977
.122 فیروز دین شرف	ڈاکٹر دلشاد ٹوانہ	

123. احمد خان کھرل	محمد آصف خاں	1980
124. مسعود کھدرپوش	محمد ظہیر اختر	1986
125. وڈے بندے	پروفیسر رضیہ مدد علی	1986
126. ڈاکٹر نذیر احمد	راجا رسالو	1987
127. ڈاکٹر فقیر محمد فقیر	محمد جنید اکرم	1992
128. مہاندرے	غلام حسین ساجد	1997
129. جانباز جتوئی	ظفر لاشاری	1999

ضلعی تاریخ

130. ٹیکسلا	ڈاکٹر سیف الرحمٰن ڈار	1977
131. ملتان	ڈاکٹر مہر عبدالحق	1980
132. راولپنڈی	انور بیگ اعوان	1980
133. ہڑپہ	ڈاکٹر سیف الرحمٰن ڈار	1980
134. ضلع مظفر گڑھ	سجاد حیدر پرویز	1989
135. ضلع وہاڑی	کلیم شہزاد	1994
136. ضلع گجرات	ڈاکٹر احمد حسین قریشی	1995
137. ضلع بہاولپور	پروفیسر دلشاد کلانچوی	1997
138. ضلع خوشاب	امتیاز حسین امتیاز	1999
139. ضلع ملتان	نوید شہزاد	2001
140. اعوان کاری	پروفیسر شاہین ملک	1987

سیاست

141. قائداعظم سوچ تے سیاست	رفیق ڈوگر	1983
142. تحریک آزادی تے پاکستان وچ پنجاب دا حصہ	شفقت تنویر مرزا	1993

لوک ادب

143. لوک گیت	تنویر بخاری	1980
144. اللہ والی گل دا	مسز ستنام محمود	1980
145. لوک گاون	باغ حسین کمال	1980
146. شغل	شفقت تنویر مرزا	1980
147. ننکھیاں سولاں	استاد اللہ دتہ صابر	1981
148. کال بلیندی	اے۔ڈی اعجاز	1983
149. کنیں بندے	پروفیسر شارب	1984
150. بار دے گیت	مشتاق صوفی	1984
151. بار دے ڈھولے	پروفیسر شارب	1985
152. رکھ تاں ہرے بھرے	ڈاکٹر سیف الرحمٰن ڈار	1985
153. جتھے پپلاں دی ٹھنڈی چھاں	ڈاکٹر سیف الرحمٰن ڈار	1985
154. پنجاب دے لجپال پتر	اقبال اسد	1986
155. ٹانگے جھنگ جاندے	پروفیسر شارب	1987
156. لہندی شعر ریت	پروفیسر شاہین ملک	1987
157. گنجی بار دے ڈھولے	اقبال اسد	1989
158. آپنا گراں ہووے	ڈاکٹر ارشد محمود ناشاد	
159. جنور باتاں	الیاس گھمن	
160. بجھ لو میری بات	حنیف چودھری	1996

انگریزی کتابیں

161. سورس میٹریل آن دی پنجاب (انگریزی)	ملک احمد نواز	1979

162. قادر یار اے کریٹیکل انٹروڈکشن	محمد اطہر طاہر	1988
163. ورلی فین	ڈاکٹر محسن مگھیانہ (حامد یوسفی)	2002

متفرق کتاباں

164. شہد دی مکھی کیڑی تے مکڑی	مس گل یاسمین قمر	1980
165. آوا جائی	راجا رسالو	1980
166. کپاہ	چودھری نثار حسین	1980
167. پنجابی اکھان	عین الحق فرید کوٹی	1980
168. کھیڈاں	غلام رسول آزاد	1980
169. ساڈی خوراک	فاروق احمد صدیقی	1980
170. ساڈا جثا	ڈاکٹر مقبول اختر	1980
171. زنانی دے روپ	فرخندہ لودھی	1980
172. دستکاریاں	شارب انصاری	1980
173. شہری تے پینڈو وسیبا	ارشاد فیروزپوری	1980
174. بوٹے	ڈاکٹر سید زین العابدین	1980
175. ساڈی کائنات	اسلم رسول پوری	1980
176. سائنسی ایجاداں	محمد ذکی رضوی	1980
177. وڈکیاں دی سوجھ	علی عباس جلالپوری	1980
178. رات ویلے اسمان دا نظارہ	محمد نواز بھٹی	1981
179. ساڈی دھرتی	محمد ذکی رضوی	1981
180. چونویں انشائیے	کنول مشتاق	1986
181. سراں تے سدھاں	تنویر بخاری	1988
182. خیر منکھ	ڈاکٹر محمد حنیف گل	1993
183. خانہ آبادی	میجر اسحاق	

184. محمد صفدر میر دیاں لکھتاں	شیما مجید	2002
185. بچیاں دی دیکھ بھال	ڈاکٹر جمال الدین	

بچوں کی کتابیں

186. چینی دی شادی	افضل پرویز	1980
187. باتاں	ریاض احمد شاد	1980
188. وڈیاں دا آدر	مسرت کلانچوی	1986
189. خوشیاں بھریا گھرانہ	پروفیسر اجمل نیازی	1986

لغت/ڈکشنری

190. پنجابی اردو ڈکشنری	سردار خان	

رسالہ

191. تماہی پنجابی ادب